سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
باز5گر
PDFBOOKSFREE.PK

پیسے کی عجب کرشمہ کاری ہے۔ اسی ریل گاڑی کے دوسرے ڈبوں میں لوگ ٹھس ٹھس کر بیٹھے ہوں گے۔ بعض لوگوں کو تو شاید کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ ملی ہو۔ ڈبا گو مختصر تھا لیکن ہمارے سوا یہاں کوئی اور نہیں تھا۔ اوپر کی دو برتھیں، نیچے کی دو کشادہ برتھیں اور ہم۔ بیچ میں دیوار سے نکلی ہوئی لکڑی دونوں برتھوں کے لیے میز کا کام دیتی تھی۔ راکھ دانی سرہانوں کے قریب جڑی ہوئی تھی۔ گلاس رکھنے کے لیے اسٹینڈ بھی پیوست تھا۔ ڈبا نئے رنگ روغن سے آراستہ تھا۔ ہر چیز نئی معلوم ہوتی تھی۔ فرش بالکل اجلا، چھت پر پنکھے، گدے نرم اور لچکیلے، بیٹھو تو آدمی دھنستا جائے۔ نرمی، گداز، رنگ، روشنی دولت کو بہت مرغوب ہیں۔ مرغوب تو ہر ایک کو ہیں لیکن دولت ہر ایک کے پاس نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں دولت سے زندگی نہیں خریدی جا سکتی مگر دولت زندگی کیسی آسان کر دیتی ہے۔ دولت تو ایک طاقت ہے، جس کے پاس جتنی زیادہ، اتنا وہ طاقت ور۔ دولت سے معذور ناتواں، منحنی اور ضعیف بھی کیسے قوی و جری، مقتدر و بااثر ہو جاتے ہیں۔ دولت سے آدمی خریدے جا سکتے ہیں۔ ہوا، پانی، روشنی، دولت سے موسم خریدے جا سکتے ہیں۔

بٹھل نے خانم کی دی ہوئی گلوریوں کی ڈبیا سے گلوری نکالی اور سلامی کی نذر کی ہوئی بیڑی سلگائی۔ ڈبے میں کسی قدر خنکی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے گرا دینے سے کچھ گرمی ہو گئی۔ میرے سامنے کی برتھ پر دیوار سے ٹیک لگائے، ٹانگیں پھیلائے بٹھل گلوری چباتا اور بیڑی کے کش لیتا رہا، پھر باتھ روم جا کے اس نے منہ صاف کیا اور واپس آ کے برتھ پر دراز ہو گیا۔ ابھی گاڑی نے پوری رفتار نہیں پکڑی تھی کہ کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہر گئی اور ایک دو منٹ بعد ہی چل پڑی۔ کوئی دس منٹ بعد مشہور تیرتھ استھان ایودھیا آ گیا۔ گاڑی یہاں بھی بہت کم وقت ٹھہری۔ ایودھیا گزر جانے کے بعد میں نے روشنی کم کر دی اور بیگ سے کھیس نکال کے ایک بٹھل کو دیا، دوسرا اپنے پاس رکھا۔ روشنیاں کم ہونے سے ڈبے کا ماحول خوابیدہ سا ہو گیا تھا۔ تواتر

سے چلتی گاڑی بھی لوری کا کام کرتی ہے اور تواتر سے ڈبے کی لرزش پنگوڑے کی کیفیت رکھتی ہے۔ میں نے بھی بٹھل کی تقلید میں لیٹ جانا چاہا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ بار بار حویلی کے درو بام سامنے آجاتے تھے اور حویلی ہر لمحے دور ہو رہی تھی۔ بینائی پر نقش مناظر دیواروں اور فاصلوں سے نہیں مٹتے۔ اس مرتبہ وہاں کچھ زیادہ ہی وقت گزارنے کا موقع مل گیا تھا۔ ٹھاکر بستی کی واردات نہ ہوتی تو بٹھل آٹھ دس دن سے زیادہ کبھی نہ ٹھہرتا۔ رہ رہ کے یہ احساس میرا سینہ جلاتا تھا کہ سب کچھ میری نادانیوں اور کوتاہیوں سے شروع ہوتا ہے۔ آسن سول اسٹیشن پر میں اتنی ضد اور ناراضی کا اظہار نہ کرتا تو حالات بہت مختلف ہوتے۔ بٹھل تو فیض آباد کا رخ کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اول تو ہمیں فروزاں اور یاسمن کو ساتھ لے کر فیض آباد جانا چاہیے تھا۔ یہ ممکن نہ ہوا تو پہلی گاڑی سے ہمیں وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ ہمارے بغیر فروزاں اور یاسمن کو حویلی میں بہت اجنبیت محسوس ہوسکتی ہے۔ پے بہ پے اتنے بڑے حادثات کے بعد انہیں تو بہت گداز چاہیے مگر یہ میرا گمان تھا۔ فروزاں اور یاسمن کے فیض آباد پہنچ جانے کے دن بھر بعد ہم بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ بے شک ہمیں دیکھ کے ان کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ ہماری آمد سے یقیناً انہیں بہت حوصلہ ملا ہوگا لیکن بٹھل بھی کیا غلط کہہ رہا تھا، ان کے پیچھے پیچھے ہمارے فیض آباد پہنچنے کی واقعی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں بھول گیا تھا کہ حویلی میں زریں اور خانم موجود ہیں۔ وہاں نیساں ہے۔ انہیں حرماں نصیبوں کی اشک شوئی کا فن آتا ہے۔ کاش جیسا کہ بٹھل کا ارادہ تھا، ہم اس وقت فیض آباد نہ جاتے تو نہ ہریا اور گورا کا واقعہ پیش آتا اور نہ شاید ٹھاکر بستی میں پورے 47 آدمی جان سے جاتے۔ بٹھل صاف انکاری تھا کہ اس خون خرابے سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور میں نے بھی یہی تسلیم کرلیا تھا مگر جب تانے بانے کا خیال آتا تھا تو کچھ دکھائی سجھائی نہ دیتا تھا۔ بٹھل کو اسی شام اور اسی رات مجھے ساتھ لے کے شہر کے مختلف مقامات اور خصوصاً رات کو دلن بیگم کے بالا خانے پر جانے کی ایسی کیا پڑی تھی؟ اسی شام، اسی رات ہی کیوں؟ شہادتیں نقش کرنے کی صورت ہی میں یہ تدبیریں کی جاتی ہیں اور پولیس کے جہاں دیدہ، گرگ باراں دیدہ افسران کسی قسم کا کوئی نشان کھوجنے میں کیوں ناکام رہے؟ کوئی عام مجرم ہوتے تو اپنے آثار ضرور چھوڑ کے جاتے۔ ٹھاکر بستی پر یلغار کرنے والے کیسے ہنر مند اور پختہ کار لوگ تھے۔ یہی چیستاں نکتہ رس پولیس افسر ورما کی نیندیں حرام کیے ہوئے ہے۔ ایک دو نہیں اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ جامو کا اچانک کلکتے سے آنا اور ایک رات کے بعد چھلاوا ہو جانا۔ اپنے آدمی گورا استاد کی ہزیمت کے بعد میری تلاش میں یا حویلی کے مکینوں کو زک پہنچانے کے لیے شورہ پشت ٹھاکر بل دیو کی حویلی کی طرف کوچ کرنے کے امکانات نظر انداز نہیں کیے جاسکتے تھے اور تدارک کی یہی صورت تھی کہ ٹھاکر بستی سرے سے نیست و نابود کردی جائے۔ یوں حویلی ہی محفوظ نہیں رہے گی، ایک خلقت کو بھی امان مل جائے گی۔ جب بھی ان پہلوؤں اور عواقب پر دھیان جاتا تھا، میرا سر پکنے لگتا تھا۔ سارے جسم پر کانٹے سے اگ آتے تھے۔ بارہا میں نے اپنے آپ کو منضبط کرنے، خود کو الگ رکھنے اور سب کچھ فراموش کردینے کی کوشش کی لیکن دوسرے پر قابو پانا آسان، خود کو قابو میں رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

کہیں بٹھل سے فیض آباد سے روانگی میں عجلت تو نہیں ہوگئی ہے۔ آدمی بہت ہوش مند ہو، بھٹکے ہوئے لمحوں کی زد پر رہتا ہے۔ وہ مجھے کسی قابل سمجھتا تو میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرے رہنے کا مشورہ دیتا۔ اس نے صاف لفظوں میں پولیس افسر ورما کو متنبہ کردیا تھا کہ اس کے غیاب میں حویلی کے مکینوں سے کوئی باز پرس نہ کی جائے۔ ورما نے کوئی وعدہ کیا تھا نہ اختلاف کیا تھا۔ لیکن پولیس کا کیا بھروسا ہے۔ ایک ورما ہی نہیں، دوسرے افسر بھی با اختیار ہیں۔ کسی وقت بھی کسی کا دماغ گھوم سکتا ہے۔ ورما کا تبادلہ بھی ہوسکتا ہے۔ ادھر حویلی کے لوگوں کو ہمارے باہر کے معاملات سے کتنی ہی آشنائی ہو، پولیس، تھانے، کچہری کا انہیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ہمارے چلے جانے کے بعد انہیں بے امانی، بے سروسامانی سی محسوس ہو رہی ہوگی۔ بٹھل کی ہدایتوں پر وہ ہر طرح کاربند ہیں مگر کوئی دھڑکا تو انہیں ہر دم لگا رہنا چاہیے۔ یہ سفر تو ہم کچھ دن بعد بھی کرسکتے تھے۔ چند دن پہلے یا چند دن بعد سے کیا حاصل ہونے والا تھا۔ آدمی وقت کا پابند رہے، وقت بھی تو اس کا کچھ خیال کرے۔ وقت ہمارے اختیار سے نکل جاتا تھا۔ راستوں میں دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ راستے بھی تو رخ بدل لیتے ہیں۔ مجھے تو اب یہ سارا کچھ معمول سا لگتا تھا، کسی فرض یا قرض کی ادائی کی طرح۔ کبھی کبھی تو معلوم ہوتا تھا کہ ہم محض اپنی تسلی، اپنی دل جوئی کے لیے صبح و شام سفر کا وظیفہ انجام دے رہے ہیں، کیونکہ ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں رہنا چاہیے، کیوں کہ سفر کے سوا ہماری استطاعت میں کیا ہے۔ پہلے کسی بستی میں داخل ہوتے وقت دل دھڑکنے لگتا تھا کہ اب منزل دور نہیں ہے۔ اب اتنی بستیوں کی خاک چھاننے کے بعد کسی نئی جگہ جاتے ہوئے ناکامی کے احساس سے قدم بوجھل ہو جاتے ہیں۔ بٹھل کا البتہ یہ حال نہیں تھا۔ ہر صبح تر و تازہ ہو کے محلوں اور گلیوں میں مولوی صاحب کی صدائیں لگانے کے لیے تیار ہو جاتا۔ سب ایک مٹی سے بنے ہیں تو ہر شخص کی مٹی الگ ہے۔ بٹھل کا یقین قائم تھا۔ اتنے آرام، خاطر مدارات، عزیزوں کی رفاقت چھوڑ کے وہ سفر کے لیے مضطرب رہتا تھا۔ سفر چاہے شاہی بجرے میں کیا جائے یا آٹھ گھوڑوں کی بگھی میں، سفر تو سفر ہوتا ہے۔ سفر، اپنا محل، عشرت کدہ، اپنا گھر نہیں ہوتا۔ بٹھل کا یقین کچھ ایسا بے جواز بھی نہیں تھا۔ بے شمار بستیوں کی کوچہ گردی کرتے ہوئے ایک شہر جسیلمیر میں ہم مولوی صاحب کے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ حیدرآباد میں بھی ہم نے ان کا گھر ڈھونڈ لیا تھا۔ نگریا سادات میں مولوی صاحب کے خاص دوست حافظ عبدالخالق تک ہماری رسائی ہوگئی تھی۔ وہ بھی مولوی صاحب کا ایک گھر تھا۔ اتنا کچھ حرکت میں رہنے ہی سے ممکن ہوا تھا۔ منزل، مراد سے مشروط نہیں ہے۔ منزل مل جانا اور چیز ہے، مراد پانا اور۔ اور جہاں مراد بر نہ آئے، اسے منزل ہی کیوں کہا جائے۔ کاش دنیا ہی کچھ چھوٹی ہوتی اور اسی نسبت سے لوگ بھی کم ہوتے۔ خدا کو آخر اتنی بڑی دنیا بنانے کی کیا ضرورت تھی یا پھر آدمی کی سمائی بھی بڑھائی ہوتی۔ آدمی کی چار آنکھیں، آٹھ ہاتھ پیر بنائے ہوتے، آدمی کے پر لگائے ہوتے۔ دنیا کی وسعت کے اعتبار سے یہ آدمی تو بہت حقیر ہے۔ آدمی تو دو گز کا ہوتا ہے۔

یہ پینجر گاڑی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر دم لیتی بڑھتی رہی۔ میں تو جاگتا ہی رہا۔ میرے سر میں بھی کوئی ریل چل رہی تھی۔ بٹھل میری طرف سے منہ پھیر کے سو گیا تھا۔ اس کے غافل ہو جانے سے مجھے کچھ اطمینان ہوا تھا۔ تنہائی کا سا احساس، اس وقت جانے کیوں مجھے اس تنہائی کی بڑی طلب تھی۔ بٹھل جاگ رہا تھا تو مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی جیسے وہ مسلسل مجھے دیکھ رہا، میرے بارے میں سوچ رہا مگر یہ تنہائی بھی عجب ایک خود فریبی، کیسا ایک گمان ہے۔ آدمی کتنا ہی اکیلا ہو، اکیلا کہاں ہوتا ہے۔ جانے کتنے لوگ، کتنے منظر نئے پرانے، اچھے برے اسے گھیرے میں لیے ہوتے ہیں۔ آدمی تو سوتے میں بھی کتنا تنہا ہوتا ہے۔ تنہائی تو شاید ایک ہی وقت، ایک ہی صورت

میں ممکن ہوتی ہے اور کسی نے کہا ہے، آدمی اکیلا کہاں ہوتا ہے۔ وہ مستقل اپنے ساتھ جو ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے خود پر ہنسی آتی تھی۔ یہ میں کیسا آدمی ہوں۔ سامنے کا سارا آئینہ ہونے کے باوجود میرا دماغ الجھنے، بھٹکنے لگتا ہے۔ اپنے ہوش وحواس پر کبھی خود مجھے بہت شک ہوتا ہے۔ کسی معذور، بے توازن، کسی مجہول آدمی میں مجھ سے سوا پھر کیا ہوسکتا ہے۔

پھر کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔ انجن زور زور سے سیٹیاں بجانے لگا تھا مگر جیسے بادل گرجے ہوں یا زمین زیر دزبر ہوگئی ہو۔ آہستہ ہوتی ہوئی گاڑی کو یکا یک جھٹکا لگا۔ گاڑی رک گئی تھی۔ دوسرے لمحے دو تین اور جھٹکے لیے اور گھسٹتی، ڈگمگاتی، دھڑ دھڑاتی ہوئی دوبارہ رک گئی۔ رات کے وقت ڈبے ٹکرانے کی گونج اور پہیوں اور پٹریوں کی چیخیں دور تک گئی ہوں گی۔ دھچکے اتنے شدید تھے کہ میں کونے میں دبکا نہ بیٹھا ہوتا تو فرش پر جا پڑتا، پھر بھی سر کھڑکی سے ٹکرایا اور سارا جسم جھن جھنا گیا۔ چند لمحے تو مجھے اپنا ہوش نہیں رہا پھر بٹھل کا خیال آیا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کی برتھ پر وہ بھی سر پکڑے ہوئے ہے۔ چہرہ بگڑا ہوا، آنکھیں بھنچی ہوئی ہیں۔ میں تیزی سے اس کی طرف جھپٹا۔ اسی اثنا میں وہ کسی قدر سنبھل گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری پیشانی پر دائیں آنکھ سے اوپر خون چھلک آیا ہے۔ آمنے سامنے ہم ایک دوسرے کو مضطربانہ دیکھا کیے اور وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تو میری جان میں جان آئی۔ اس نے میری پیشانی چھوئی اور قمیص کا کونا چھلکتے خون پر رکھ دیا۔ ''کوئی ایسی چوٹ نہیں۔'' میں نے اس کی تشفی کے لیے بہ ظاہر بے پروائی سے کہا۔

اس نے سنا نہیں۔ قمیص ہٹا کے دوبارہ میری پیشانی کا جائزہ لیا۔ پیشانی ادھر ادھر سے دبا کے اسے سکون ہوا۔ میری جیب میں زریں کا دیا ہوا رومال تھا۔ اس وقت یہی ایک چارہ تھا کہ اس سے کام لیا جائے۔ اس نے پیشانی پر کس کے رومال باندھ دیا۔

''تمہارے بھی تو چوٹ لگی ہے۔'' میں نے الجھی ہوئی آواز میں کہا۔

''کچھ نہیں۔'' اس کی بے نیازی بھی مصنوعی تھی۔ '' تھوڑا سر دیوار پہ جا ٹکا تھا۔''

''زور سے لگا ہے؟ تکلیف تو ہوگی؟''

''ٹھیک ہو جاوے گا لوٹ پیٹ کے۔''

''مجھے بتاؤ، سب ٹھیک تو ہے نا۔'' میں نے اضطراری انداز میں پوچھا اور اس کا سر دیکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ روک دیا۔

''پر یہ کیا ہوا رے؟ میں تو مرا ہوا تھا۔'' اس نے اپنی جانب سے میری توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔

''کچھ معلوم نہیں۔ میں جاگ رہا تھا، گاڑی آہستہ ہوتی ہوئی رکنے والی تھی کہ کیا ہوا، ایک دم جھٹکے لینے لگی۔ پہلا جھٹکا تو بہت زور کا تھا۔ ذرا تیز ہوتی تو لوٹ جاتی۔ اسٹیشن پر آکے ایسا ہوا ہے۔ گاڑی تو پلیٹ فارم میں داخل ہوچکی تھی۔'' اپنی آواز کا ہیجان خود مجھے کھٹکنے لگا اور میں نے کچھ ٹھیر کے کہا۔ ''میں باہر جاکے دیکھتا ہوں۔''

ہمیں اپنی بدحواسی میں کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ چیخ پکار تو اندر تک آرہی تھی۔ میں نے شیشہ چڑھا کے باہر جھانکا۔ پلیٹ فارم پر تو قیامت سی مچی ہوئی تھی۔ لوگ دائیں بائیں بھاگ رہے تھے۔ دروازہ کھول کے میں نیچے اتر گیا اور مجھے گاڑی کے پاس ایک جگہ کھڑے رہنا مشکل ہوگیا۔ پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے کچھ لوگ مجھ سے ٹکرائے اور مجھے گاڑی سے کچھ دور سائبان کے کھمبے کی طرف ہٹ جانا پڑا۔ یہاں سے وہاں تک لوگ ڈبوں کے دروازوں پر امڈ رہے تھے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ جن ڈبوں میں زیادہ مسافر ہوں گے۔ ان کا برا حال ہوا ہوگا۔ وہ تو جیسے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے ہوں گے۔ سامان لڑھکنے سے چوٹیں الگ

آئی ہوں گی اور کچھ دیر میں یہی دیکھنے میں آیا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے تھے اور لوگ انہیں جلد سے جلد ڈبو سے نکالنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کررہے تھے اور ان کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم لوگوں سے بھر گیا۔ بہت سے زخمیوں کو کھڑکیوں سے باہر نکالا گیا۔ جو کپڑا ہاتھ میں آیا، جیسے تیسے فرش پہ بچھا کے زخمیوں کو لٹا دیا گیا۔ لوگ کراہ رہے، سسک رہے اور چیخ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے۔ سارا پلیٹ فارم طرح طرح کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

یہ اکبر پور جنکشن تھا۔ فیض آباد سے یہاں تک کا فاصلہ 35 سے 40 میل کے قریب ہوگا اور گاڑی نے پورے دو گھنٹے میں طے کیا تھا۔ سست رفتاری کی وجہ انجن کی خرابی ہی ہوسکتی ہے۔ لوگ اس حادثے کی اپنے اپنے طور پر تاویلیں کررہے تھے۔ ریلوے کے محکمے، حکومت اور انجن ڈرائیور کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ میں نے انجن تک جانے کا ارادہ کیا تھا اور چند قدم چل کے رہ گیا۔ آگے جانے سے کیا حاصل تھا۔ ہر طرف ایک ہی منظر تھا۔ آگے جانا آسان بھی نہیں تھا۔ جانے کہاں سے لوگ نکل آئے تھے۔ ڈبوں کے قریب تو بڑی بھیڑ تھی۔ میرے سر میں اب ہلکی ہلکی ٹیس اٹھ رہی تھی۔ مجھے پھر بٹھل کا خیال آیا۔ میں اسے اکیلا چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ اس نے اپنی چوٹ کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جس وقت گاڑی نے پہلا جھٹکا لیا، وہ سویا ہوا تھا۔ یہی ہوسکتا ہے، سوئے ہوئے آدمی کا صرف وزن ہوتا ہے، اختیار نہیں ہوتا۔ جھٹکے نے جسم پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور سرہانے کی دیوار سے سر جا ٹکرایا، لڑھک کے وہ فرش پر بھی گر سکتا تھا۔ لیٹے رہنے کی وجہ سے محفوظ رہا۔ جب میری نظر اس پر گئی، وہ سر پکڑے ہوئے تھا۔ کسی شدید چوٹ میں کوئی اتنے کرب میں ہوسکتا ہے۔ ڈبے سے میں قریب ہی تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ سر کی مالش کررہا تھا۔ ''درد ہورہا ہے کیا؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''ایسا کر کے ٹھیک رہتا ہے۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''میں دباتا ہوں۔''

وہ منع کرتا رہا، میں نے اس کے ہاتھ ہٹا کے ہلکے ہلکے اس کا سر دبانا شروع کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کس جگہ زور سے دبانے پر اس کا کیا تاثر ہوتا ہے اور میں کچھ نہ جان سکا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا اور کچھ دیر بعد اس نے مجھے روک دیا۔ ''اب بیٹھ جا ادھری۔ باہر تو بڑا فیل مچا ہے۔''

میں نے مختصراً اسے باہر کا احوال بتایا اور کہا۔ ''گاڑی اب بہت لیٹ ہوسکتی ہے۔''

''کیا بولیں پھر۔'' وہ اچٹتی آواز میں بولا۔

''تمہارے لیے چائے لادوں؟''

''ایسے میں کدھری ملے گی۔''

''دیکھتا ہوں، شاید مل جائے۔'' میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ پلیٹ فارم پر وہی نفسا نفسی تھی۔ ہجوم اور بڑھ گیا تھا۔ اسٹیشن کے آس پاس بسنے والے بھی تماشا دیکھنے آئے ہوں گے۔ پولیس بھی نظر آرہی تھی۔ ڈبے سے اتر کے راستہ بناتے ہوئے میں چائے کا اسٹال ڈھونڈتا رہا۔ اسٹال مل گیا لیکن چائے حاصل کرنا دشوار تھا۔ پہلے سے بہت مضطرب اور منتظر طلب گار وہاں دھرنا دیے ہوئے تھے۔ چھینا چھپٹی کا سا منظر تھا۔ چائے بنانے والے کے اوسان بھی خطا معلوم ہوتے تھے۔ ایک ہی تدبیر ذہن میں آئی۔ میں اسٹیشن سے باہر چلا آیا۔ اسٹیشن کی عمارت سے کچھ فاصلے پر ایک پختہ ناپختہ قسم کا ہوٹل موجود تھا۔ بھیڑ تو وہاں بھی کم نہ تھی مگر چائے ملنے کا آسرا ہوگیا۔ ہوٹل والا گلاس دینے کو تیار نہ تھا۔ میں نے ضمانت کے طور پر پانچ روپے پیش کیے تو وہ تو دوسرا آدمی بن گیا۔ چائے بھی پھر

اس نے توجہ سے بنائی، ملائی بھی ڈالی۔ مجھ سے چوک ہوگئی۔ میں دس روپے کا نوٹ بڑھاتا تو وہ ڈبے تک چائے پہنچانے کے لیے بھی آمادہ ہوجاتا۔ اندر پلیٹ فارم پر لوگوں سے بچتے بچاتے اپنے ڈبے تک پہنچنے میں مجھے پھونک پھونک کر قدم بڑھانے پڑے۔ لوگ راستہ ہی نہیں دے رہے تھے۔ خود سے زیادہ مجھے گلاس اسٹینڈ کا خیال تھا۔ کھانے پینے کی کسی چیز کے لیے میں نے ایسی ریاضت کبھی نہیں کی تھی۔ یہ تو ایک آزمائش تھی۔ بہرحال، کسی طور میں ڈبے تک آنے میں کامیاب ہوا۔ ہوا میں خنکی تھی اور ایسی نہیں کہ چائے جلدی ٹھنڈی ہوجائے۔ بٹھل کو واقعی چائے کی طلب تھی۔ چند گھونٹوں میں تمام کرلی۔ ''کچھ دانا دنکا بھی کرلیتا۔'' وہ کسمساتے ہوئے بولا۔

''جی نہیں چاہ رہا۔'' میری آواز بھی تھکی ہوئی تھی۔

''گھر سے چلے ٹائم ہوگیا۔ تھوڑا ہلکا پھلکا کرلے۔''

''تمہیں کچھ خواہش ہے؟''

''اپنے کو بھی نہیں ہے پر اس کی رکھی چیزیں ڈھیر نہ ہوجائیں۔'' وہ تردد سے بولا۔ اس کا اشارہ زریں کی طرف تھا۔ زریں نے بیگ میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی تھیں۔ معلوم نہیں، کیا کیا تھا۔ بھوک ہی نہیں تھی تو کیا کھول کے دیکھتا۔ زریں نے ضرور خیال رکھا ہوگا کہ جلد خراب ہوجانے والی چیزیں ساتھ نہ کی جائیں۔

چائے پی کے اور بٹھل کو پلا کے میں پھر ڈبے سے باہر آگیا۔ اتنی دیر میں کسی قدر نظم وضبط ہوگیا تھا۔ شور کی جگہ بھن بھناتی سوگواری نے لے لی تھی۔ سپاہیوں کی بڑی تعداد نے بکھرے اور بپھرے ہوئے لوگوں کو قابو میں کرنا شروع کردیا تھا۔ دو چار ڈاکٹر بھی آگئے تھے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کررہے تھے۔ اسٹریچروں کی کمی معلوم ہوتی تھی۔ لوگ چارپائیوں پر شدید زخمیوں کو باہر لے جارہے تھے۔ میں تماشائی بنا کب تک کھڑا رہتا۔ میں بھی ان میں شامل ہوگیا اور چارپائیاں اٹھانے میں مدد دیتا رہا۔ پھر کئی بچوں کو گود میں بھر کے میں نے پلیٹ فارم سے باہر پہنچایا۔ جہاں ڈاکٹر زخمیوں کی چارہ گری میں مصروف تھے، اس بینچ کے کونے سے ٹکی، گٹھری بنی ایک بوڑھی عورت پر میری نظر گئی۔ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ چیخ پکار کرکے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے قابل بھی نہ تھی۔ لگتا تھا، اسے کوئی اندرونی چوٹ لگی ہے۔ اس کا ڈھلکا ہوا سر دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں...... میں نے جھجکتے جھجکتے اس کا کندھا ہلایا تو اس نے چونک کے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سمائی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا حال پوچھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کولھے پر ہاتھ رکھ کے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔ میں نے پوچھا، اس کے ساتھ کون ہے؟ کیا وہ اکیلی سفر کررہی تھی؟ وہ کہاں سے آرہی اور اسے کہاں جانا ہے؟ اس کا سامان کہاں ہے؟ اور ڈبے سے یہاں تک کون اسے لایا ہے؟ وہ اتنے سوالوں کے جواب میں دیدے گھما کے رہ گئی۔ اس کے ساتھ کوئی ہوتا تو اسے یوں اکیلا نہیں چھوڑ دیتا یا پھر معلوم نہیں، اس شخص پر بھی کیا گزری ہو۔

بینچ پر بیٹھا ڈاکٹر پاگل ہورہا تھا۔ قریب کوئی اسٹریچر یا چارپائی بھی نہیں تھی۔ بوڑھی عورت کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اس سے پہلے میں دیکھ چکا تھا کہ کچھ لوگ زخمیوں کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کے باہر لے گئے تھے۔ وہ ان کے عزیز ہی ہوں گے۔ بڑھیا کو بھی ڈبے سے یہاں تک کسی نے پہنچایا ہوگا۔ اپنے پیروں چل کے تو وہ نہ آسکی ہوگی۔ کوئی اور چارہ نہ دیکھ کے میں نے بھی اس کے ہڈیوں بھرے جسم کی گٹھری بازوؤں میں بھرلی۔ وہ بہت دھان پان تھی۔ باہر جانے کے

لیے گیٹ پلیٹ فارم کے وسط میں تھا اور زیادہ دور نہیں تھا۔ تیز قدموں، رکاوٹوں اور بڑھیا کو احتیاط سے جکڑنے کی وجہ سے میری سانس پھول گئی۔

اسٹیشن کی عمارت کے ساتھ بہت سے تانگے اور دوسری سواریاں زخمیوں کو لے جانے کے لیے منتظر کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کے کئی آدمی میری طرف لپکے۔ بڑھیا کو تانگے میں بٹھایا گیا اور دو آدمیوں نے اس کے دائیں بائیں بیٹھ کر اسے تھام لیا۔ لوگ غلط نہیں کہتے۔ دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے یا پھر یہ کہ کوئی کتنا ہی بڑا ظالم، کتنا ہی برا ہو، کسی وقت بھی بہت اچھا اور رحم دل ہوسکتا ہے۔ شہر کے لوگ یہ افتاد سن کے اتنی رات کو، اپنا آرام چھوڑ کے اسٹیشن پر امڈ آئے تھے اور ہر کوئی اپنی توفیق کے مطابق سرگرم تھا۔ کسی تخصیص کے بغیر کہ کون کیا ہے۔ تانگا روانہ ہوا چاہتا تھا کہ میں نے بڑھیا کے سامنے جاکے اس کے زانوں پر تھپکی دی۔ وہ بڑبڑانے لگی۔ پوربی مجھے بھی خوب آتی تھی لیکن اس کی آواز بہت دھیمی اور منتشر تھی، میں کچھ اخذ نہ کرسکا۔ شاید وہ دعائیں دینا چاہتی تھی۔ جب میں نے اس کے زانوں پر تھپکی دی تھی تو اس کی ویران آنکھوں میں لمحے بھر کے لیے چمک پیدا ہوئی تھی۔ آنکھوں کی زبان سب سے بلیغ ہوتی ہے۔ اس زبان کا کوئی نام نہیں اور ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی ٹمٹماتی لو دیکھ کے میرا دل بھی ڈولنے لگا اور مجھے ایسا لگا جیسے میرا قد بڑھ گیا ہو اور میں بے وزن ہوگیا ہوں اور جیسے مجھ پر منکشف ہوا کہ میرا وجود صرف میری غرض نہیں، دوسروں کو بھی اس سے کچھ سروکار ہے۔ کوئی اپنے لیے ٹھیک سے جی نہیں سکتا تو اصرار بھی کیوں کرے، خود کو دوسروں کی نذر کیوں نہ کردے۔ آدمی اپنے آپ سے کوئی علاقہ ہی نہ رکھے۔ آدمی کو آدمی کی بڑی ضرورت ہے، اشیا سے زیادہ۔

اسٹیشن کی عمارت کے باہر کھڑا میں تانگا جاتے دیکھتا رہا۔ بوڑھی عورت کی نظریں مجھ پر منڈلا ر[illegible] تھیں لیکن وہ اپنی مجتمع کی ہوئی توانائی تادیر بر قر[illegible] نہ رکھ سکی۔ میں نے دیکھا، اس کا جسم دائیں طرف [illegible] بیٹھے ہوئے شخص پر ڈھلک پڑا۔ تانگا دور ہوتا رہا [illegible] میرے جی میں آیا کہ تانگہ کا تعاقب کروں مگر اور [illegible] کرسکتا تھا۔ اسے وہ لوگ اسپتال کی طرف ہی [illegible] جارہے تھے۔

پلیٹ فارم پر واپس آکے بٹھل کی خیر خبر لی[illegible] کے لیے میں نے ڈبے کا رخ کیا۔ وہ برتھ پر درا[illegible] تھا۔ میں نے حال پوچھا تو اس نے وہی جواب د[illegible] مجھے معلوم تھا۔ کچھ دیر اس کے پاس رہ کے میں اپ[illegible] ڈبے سے نزدیک کی بینچ پر بیٹھے ڈاکٹر کے پاس چ[illegible] آیا اور اس کی ہدایت پر میں بھی لوگوں کو پٹیا[illegible] باندھنے میں مصروف ہوگیا۔ شروع شروع می[illegible] جھجک ہورہی تھی لیکن جلد ہی ہاتھ رواں ہوگیا۔

2 بجے کے قریب اسٹیشن خاصا پرسکون ہوگی[illegible] تھا۔ شہر کے بہت سے لوگ گھروں کو واپس جا چکے [illegible] تھے۔ پلیٹ فارم پر یا تو ریلوے کا عملہ تھا۔ شہری [illegible] افسران تھے، پولیس تھی یا مسافر تھے۔

ڈبوں کے بجائے اب مسافر ٹولیوں کی شکل [illegible] میں جا بجا پلیٹ فارم کے فرش پر اوندھے سیدھے [illegible] پڑے ہوئے تھے۔ اتنے عرصے میں ڈاکٹر، کمپاؤنڈر [illegible] اور اردگرد کھڑے سپاہی مجھ سے مانوس ہوچکے [illegible] تھے۔ زخمیوں سے فارغ ہوکے ڈاکٹر کے اوسان [illegible] بحال ہوئے تو اس کی نگاہ میری پیشانی پر بندھے [illegible] رومال پر گئی۔ وہ شرمندہ بھی ہوا، پریشان بھی۔ میں [illegible] منع کررہا تھا لیکن اس نے رومال کی گرہ کھول کے [illegible] میرے زخم کا توجہ سے معائنہ کیا اور مرہم لگا کے پٹی [illegible] باندھ دی۔ کئی گولیاں بھی ہر چھ گھنٹے بعد پانی کے [illegible] ساتھ نگلنے کو دیں۔ وہ ایک مہربان آدمی تھا۔ اس [illegible] نے میرا سینہ دیکھا، نبض دیکھی۔ پٹی سے مجھے سکون [illegible] ہوا۔ پیشانی کی جلن میں خاصی کمی ہوگئی تھی۔ پھر [illegible] ڈاکٹر نے مجھے ساتھ ہی بٹھالیا اور سگار پینے لگا۔

اب انہیں حادثے کی نوعیت کے بارے میں غور کرنے کی مہلت ملی تھی۔ بینچ کے عقب میں کھڑا ایک عمر رسیدہ سپاہی کچھ زیادہ ہی واقف احوال تھا۔ اس نے بتایا کہ انجن میں کوئی بڑی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ ڈرائیور پرانا آدمی تھا، کسی طرح گاڑی یہاں تک لے آیا۔ اس نے کمال مہارت اور ہوش مندی سے کام لیا ورنہ گاڑی کسی بڑے حادثے سے دوچار ہو جاتی۔ جو میں نے قیاس کیا تھا، سپاہی کم و بیش اسی ترتیب سے بیان کررہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق، اوپر کی برتھوں پر بیش تر مسافر سوئے ہوئے تھے، نیچے بیٹھے ہوئے بھی نیم خوابیدگی و نیم بیداری کی حالت میں تھے۔ عموماً تیسرے درجے کے ڈبوں میں گنجائش سے زیادہ مسافر ہوتے ہیں۔ اچانک شدید جھٹکے کی وجہ سے اوپر کی برتھوں پر سوئے ہوئے مسافروں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ پلک جھپکتے میں سب کچھ غت ربود ہوگیا۔ رہی سہی کسر دوسرے جھٹکوں نے پوری کردی۔ اوپر کی برتھوں پر رکھے سامان نے اور زیادہ تباہی مچائی۔ ایسے موقع پر آدمی کو اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے سامنے مخض وہ ہوتا ہے، اس کی اپنی ذات، اپنا وجود۔ ہر مسافر نے اس ناگہانی سے بچنے کے لیے دروازے اور کھڑکیوں سے کودنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانی چاہی، حالاں کہ گاڑی منٹ دو منٹ کے تلاطم کے بعد پرسکون ہوگئی تھی مگر وقت کی کمیت کیا، وقت تو کیفیت سے عبارت ہے۔ کبھی ایک لمحہ ہی بہت کاری ہوتا ہے۔ ایک لمحے میں منظر بدل جاتا ہے۔

سپاہی نے بتایا کہ قریب قریب کے شہروں سے مدد آرہی ہے۔ لکھنؤ سے نئی گاڑی چل پڑی ہے۔ ریلوے والوں نے فیصلہ کیا ہے موجودہ گاڑی اور انجن کو کل پرزوں کی جانچ پڑتال کے بغیر نہیں چلایا جائے گا۔ فیض آباد اور بارہ بنکی سے ڈاکٹروں، نرسوں اور حادثے کی تفتیش کے لیے بڑے افسران کی ایک کھیپ آرہی ہے۔ اکبر پور سے ادھر مشرق میں 30 میل دور شاہ گنج، 45 میل دور جون پور اور مغرب میں 35 میل دور فیض آباد، سو میل کی دوری پر بارہ بنکی ہے۔ کچھ دیر جاتی ہے، ہر طرف سے مدد آجائے گی۔ کئی زخمیوں کی حالت بہت نازک ہے، خصوصاً بچوں اور عورتوں کی۔ شہر والوں نے اسپتال میں جگہ کم پڑنے پر آشرم میں انتظام کرلیا ہے پولیس نے احتیاطاً مسافروں کا سامان ڈبو سے نکلوا کے پلیٹ فارم کے ایک کمرے میں محفوظ کروادیا ہے۔ کئی شدید زخمی مسافروں نے اپنے سامان کے بغیر اسپتال جانے سے انکار کردیا تھا۔ وہ یہیں پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے ہیں۔ صرف درمیانہ اور تیسرے درجے کے مسافروں کے ڈبے خالی کرائے گئے ہیں۔ اول اور دوم درجے کے مسافروں کو بھی گہری چوٹیں آئی ہیں لیکن ان میں زیادہ تر اپنے ڈبو میں ہیں۔

ڈاکٹر کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ اس کا نام آنند کشور سکسینہ تھا۔ وہ ایک پسندیدہ شخص تھا۔ شاید میں بھی اسے پسند آگیا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا رہا، کچھ اپنی سناتا، کچھ مجھ سے پوچھتا رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ اتنے زخمیوں کی خبر گیری کے بعد وہ تھک گیا ہوگا، اسے گھر جانا چاہیے، باقی ڈاکٹر بھی جا چکے ہیں۔ کہنے لگا۔ ”ایسے کاموں سے کوئی تھکن ہوتی ہے۔“ پھر بولا۔ ”تھکن دو طرح کی ہوتی ہے، ایک میٹھی، دوسری کڑوی۔ یہ بڑی میٹھی تھکن ہے۔“ پلیٹ فارم کی گھڑی ساڑھے تین بجارہی تھی تب وہ اٹھا۔ چلتے وقت مجھ سے بہت زور سے مصافحہ کیا اور اسی جوش سے بولا۔ ”تم سے اب شاید کبھی بھینٹ نہ ہو پر تم مجھ کو یاد رہو گے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بھی آپ یاد رہیں گے۔ کبھی اس طرح آنا ہوا تو ایک بار ضرور آؤں گا۔ اتنی دیر میں، میں نے آپ سے بہت جانا ہے۔ آپ جیسے آدمی کم ملتے ہیں۔“ وہ مسکراتا اور سگار پیتا ہوا گیٹ

کی طرف جانے لگا تو میں نے چند قدم لپک کے اسے پھر جالیا۔ ''ڈاکٹر صاحب، مجھے دھیان نہیں رہا تھا۔'' میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''ایک گزارش ہے۔''

''ہاں ہاں بولو!'' وہ پلکیں جھپکانے لگا۔

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا کہ اگر زحمت نہ ہو تو وہ میرے ہم سفر کو بھی دیکھ لے۔ گاڑی کے جھٹکے سے اس کا سر دیوار سے جالگا تھا۔

وہ ناراض ہونے لگا کہ میں نے اسے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ پلٹ کے اس نے کمپاؤنڈر کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ مجھے بٹھل کو پہلے مطلع کر دینا چاہیے تھا لیکن اس کا وقت نہیں رہا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ سو نہیں رہا تھا۔ میرے پیچھے دو اجنبیوں کو داخل ہوتا دیکھ کر فوراً اٹھ بیٹھا۔ کمپاؤنڈر کے ہاتھ میں ڈاکٹروں کا مخصوص بیگ تھا۔

''ان کو کیوں کشٹ دیا رے۔'' وہ الجھی ہوئی آواز میں بولا۔

''کشٹ کیسا شری مان۔'' ڈاکٹر نے خوش گواری سے کہا اور بٹھل کو کچھ اور کہنے کا موقع نہیں دیا۔ مختلف جگہوں پر اس کا سر دبایا۔ بٹھل نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا تو پوچھنے لگا۔ ''دکن ہوتی ہے؟''

بٹھل نے کچھ توقف کے بعد تندی سے جواب دیا۔ ''تھوڑی بہت تو ہوگی۔''

''تھوڑی بہت یا زیادہ؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''اپنے کو چلتی ہے۔'' بٹھل نے سر جھٹکا۔

مجھے یہی خدشہ تھا۔ اس کے جواب سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اسے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوگی جو اس نے ڈاکٹر سے اقرار کرلیا تھا۔ وہ ڈبے سے باہر بھی نہیں نکلا تھا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ سر کا معائنہ کیا اور بیگ سے آلہ نکال کے سینے کا بھی، تھرما میٹر لگا کے حرارت بھی دیکھی۔ ''کوئی، کوئی ایسی بات تو نہیں۔'' میں نے مضطربانہ پوچھا۔ ''فیض آباد بہت قریب ہے۔ کیا ہم گھر واپس چلے جائیں؟''

''کیا بولتا ہے رے۔'' بٹھل تنک کے بولا۔

''تم مت بولو، مجھے ڈاکٹر صاحب سے بات کرنے دو۔'' میں نے سختی سے کہا اور ڈاکٹر سے پوچھا، ہاں ڈاکٹر صاحب! آپ کا کیا مشورہ ہے؟''

''ویسے تو سب ٹھیک لگتا ہے پر تکلیف باقی رہے تو گھر لوٹ جانا چاہیے اور کسی اچھی جگہ دکھانا چاہیے۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں، میں نے کوئی فکر اور تشویش کھوجنے کی کوشش کی مگر اس کا لہجہ سرد اور سپاٹ تھا۔ اس نے نسخہ لکھا اور تاکید کی کہ بازار سے یہ دوائیں لے کے پابندی سے استعمال کی جائیں۔ اس کی ہدایت پر کمپاؤنڈر نے کئی قسم کی گولیوں کو الگ الگ پڑیاں بنا کے دیں اور ان پر خوراک کی مقدار درج کردی۔

میں اب بٹھل کے پاس ہی رہنا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر کو پلیٹ فارم کے باہر تک چھوڑنے کے لیے مجھے جانا چاہیے تھا۔ میں نے راستے میں اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دے۔ وہ بھی چپ رہا۔ اس کی خاموشی بھی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ جیسے تیسے اس کا رسمی شکریہ ادا کرکے میں نے اسے رخصت کیا اور تقریباً بھاگتا ہوا اپنے ڈبے تک آیا۔ بٹھل اب دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ پہلے میں نے اپنی سانسیں بحال کیں پھر آواز دھیمی رکھ کے مفاہمانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی بہتر یہی ہے ہم فیض آباد لوٹ جائیں، وہاں آرام کا وقت مل جائے گا، وہاں اچھے ڈاکٹر حکیم ہیں، اسپتال بھی بڑا ہے۔ چند دن بعد پھر چل پڑیں گے۔ احتیاط کرلینے میں کوئی ہرج نہیں۔

''چوٹ مجھ کو لگی ہے رے۔'' وہ جھنجلا کے بولا۔

''ٹھیک۔'' میں نے تحمل سے کہا۔ ''تمھی کو لگی ہے۔ تمھی بہتر جانتے ہوگے لیکن مجھے لگتی تو تم سفر جاری رکھتے؟''

''پہلے تجھ سے پوچھتے۔''

''اور میں تمہاری طرح ٹالتا رہتا تو......''

میں نے اسے قائل کرنے کے بہت جتن کیے، وہ سنتا رہا پھر کہنے لگا، آگے جا کے دیکھتے ہیں۔ آگے کچھ اچھا محسوس نہیں کیا تو کسی وقت بھی واپسی کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ فیض آباد سے دور ہوئے تو کلکتے چلے جائیں گے۔ اس کی بات کسی حد تک معقول تھی لیکن میری تجویز اس سے زیادہ معقول تھی۔ مجھے معلوم تھا، میری دلیلیں رائیگاں جائیں گی۔ میں نے پھر کچھ نہیں کہا۔ بیگ سے گلاس نکالا اور پلیٹ فارم کے نلکے سے پانی بھر کے ڈاکٹر سکسینہ کی دی ہوئی گولیاں اس کے سامنے بڑھا دیں۔ یہی بہت تھا کہ اس نے گولیاں نگلنے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔

صبح چھ بجے لکھنؤ سے خالی گاڑی آگئی۔ صبح کہیں بھی ہو، بہت نرم اور ہلکی ہلکی ہوتی ہے۔ جیسے دنیا کا وزن کم ہوگیا ہے۔ ریلوے لائنوں پر بکھرے کوئلوں میں سبزہ پھوٹ رہا تھا۔ صبح کے اپنے رنگ ہوتے ہیں۔ سبزے کا رنگ کچھ اور، پھولوں کے رنگ کچھ اور۔ ریلوے کے عملے کی درخواست پر اول اور دوم درجے کے مسافر اپنے اپنے ڈبوں سے نکل آئے۔ ان میں بھی کئی لوگوں کے پٹیاں بندھی ہوئی تھیں یا پھائے چسپاں تھے۔ بعض لوگوں سے ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کے بٹھل بھی تیار ہوگیا۔ قلی نے ہمارا سامان پہلے ہی اٹھا رکھا تھا۔ میں نے بہت غور سے دیکھا۔ چلتے ہوئے بٹھل کے پیروں میں کوئی لغزش نہیں تھی۔ البتہ اس کی رفتار سست تھی۔ پل پار کرکے ہم دونوں پلیٹ فارم پر آگئے تھے کہ میرے قدم اٹکنے لگے۔ کچھ فاصلے پر موجود پولیس کے گروہ میں مجھے ایک شناسا افسر نظر آیا۔ اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا۔ یہ وہی افسر تھا، دوسری بار کوتوالی میں حاضری کے وقت جس سے ہماری مڈبھیڑ ہوئی تھی ''استاد بٹھل!'' اس نے دور سے پکارا اور تیزی سے بڑھ کے عین ہمارے مقابل کھڑا ہوگیا۔ اس طرح کہ ہم آگے جانے کے لیے پہلو بدل ہی کے گزر سکتے تھے۔ اس کے ماتحت سپاہی بھی اس کے عقب میں کھڑے ہوگئے تھے۔ ایک لحظے کے لیے میرے دماغ میں کئی طرح کے وسوسوں نے یلغار کی۔ میں نے بے چینی سے بٹھل کی طرف دیکھا۔ بٹھل نے توقع کے خلاف اسے سلام کیا نہ کلام کرنے میں پہل کی۔ پولیس افسر کچھ مکدر ہوا اور تنی ہوئی آواز میں بولا۔

''تم بھی اسی گاڑی میں تھے؟''

''ٹکٹ دکھائیں مائی باپ!'' بٹھل کے لہجے کی تلخی پر مجھے حیرت ہوئی۔ یہ نامناسب بات تھی۔

پولیس افسر کی پیشانی تنگ ہوگئی، آواز بھی اکڑ گئی۔ ''ہم کو پتا ہے۔ تم چھوٹا کام نہیں کرتے۔''

'بڑا امان بڑھایا تم نے۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''کیوں پوچھتے ہو صاحب؟''

''نہیں بتانا چاہتے؟''

''ادھر ساروں سے پوچھ رہے ہو؟''

''تم سے پوچھتے ہیں۔'' پولیس افسر نے افسرانہ تیور سے پوچھا۔

''اپنے کو یاد نہیں، کوئی ناتے داری نکلتی ہو تم سے۔''

''ناتا جوڑنے میں کیا دیر لگتی ہے۔''

''پہلے تم ہاتھ بڑھاؤ گے یا ہم آگے کریں؟''

''اس کا سے بھی آجائے گا۔'' پولیس افسر کی آواز بل کھا گئی۔

''کام کی بات کرو مہاراج!'' بٹھل نے برگشتگی سے کہا۔

''اپنے لیے کوئی پرچی چالان لائے ہو تو ویسا بولو، نہیں تو اپنا رستہ چھوڑو۔''

پولیس افسر سمٹی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورتا رہا۔ اس کا چہرہ دہکنے لگا تھا۔ اس کے اردگرد کھڑے سپاہیوں کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ پولیس افسر

نے ہمارے سامنے سے ہٹنے میں تامل کیا۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ بٹھل ہاتھ بڑھا کے اسے ایک طرف کرنے کی جسارت کرے تو بات آگے بڑھے اور اسے من مانی کرنے کا جواز مل جائے۔ آنے والے لمحے میں کچھ بھی ممکن تھا۔ میرا جسم اینٹھنے لگا تھا۔ ہمارے آگے پیچھے گاڑی کی طرف بڑھنے والے مسافر بھی ٹھہر کے ہمیں دیکھنے لگے۔ بٹھل نے ضبط کیا۔ آخر پولیس افسر خود ہی ایک جانب ہو گیا۔

آگے ریلوے کا عملہ پہلے اور دوسرے درجے کے مسافروں کی معاونت میں مصروف تھا۔ ہمیں پہلے جیسا ہی ڈبا ملا۔ جب تک میں نے ڈبے میں قدم نہیں رکھا، مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے اور کوئی کسی وقت اچانک سامنے آ کے ہمیں روک لے گا۔ رات بھر کی بیداری کے باوجود کسی تھکن کا احساس نہیں تھا لیکن اب جانے کیا ہو رہا تھا، کیا ہو گیا تھا، دل ڈوب سا رہا تھا۔ لگتا تھا، بہت دور سے چل کے آ رہا ہوں۔ ڈبے میں آ کے مجھے کچھ خیال نہیں رہا۔ میں نے برتھ کے گدے پر خود کو ڈھیر کر دیا۔ جی چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کر لوں اور نہ کچھ دیکھ پاؤں، نہ سن پاؤں لیکن اپنے آپ سے بے گانگی کے چند لمحے بھی مجھے نہ مل سکے۔ قلی کی آواز پر مجھے سنبھلنا پڑا۔ میں بھول گیا، میں نے ابھی کچھ طے کیا تھا۔ بٹھل کی حالت مجھے ٹھیک نہیں لگتی تھی ورنہ پولیس افسر سے یہ تکرار نہ ہوتی۔ میں نے طے کیا تھا کہ اسے بس آرام کرنے دوں گا اور سارے کام خود کروں گا۔ مجھے اپنی دل جمعی اور خوش گواری کا تاثر دیتے رہنا چاہیے۔ سامان رکھنے کے بعد قلی کسی اور خدمت کے لیے پوچھنے لگا۔ جانے وہ ہمیں کیا سمجھا ہو۔ پولیس افسر سے حجت کے دوران وہ سامان اٹھائے وہیں کھڑا رہا تھا۔ بٹھل نے اس سے چائے کی فرمائش کی تو اس نے جیسے کوئی اعزاز سمجھا۔ پلک جھپکتے میں باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں چائے لے آیا۔ چائے بھی خاص قسم کی تھی۔ اول درجے کے مسافروں کے شایان شان، الگ الگ برتنوں میں۔ بٹھل نے اسے پاس بیٹھنے اور چائے پینے کی پیش کش کی تو وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ دو ہی پیالیاں تھیں۔ میں نے اپنے لیے گلاس میں چائے بنائی اور اسے پیالی دینا چاہی۔ اس نے شدت سے انکار کر دیا اور اچک کے میرے سامنے سے گلاس اٹھا لیا۔ وہ ہمارے برابر بیٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک مودب اور خدمت گزار آدمی تھا۔ بٹھل کے اصرار پہ بہ مشکل برتھ پر کونے میں سکڑ کے بیٹھ گیا اور جھجکتے ہوئے اس نے ہماری خیریت پوچھی پھر از خود رات کے واقعات بیان کرنے لگا۔ اس کی اطلاع کے مطابق، ڈاکٹر نے بہت کوشش کی لیکن تین عورتیں، دو بچے اور دو مرد مسافروں کو موت سے نہ بچا سکے۔ کچھ اور زخمیوں کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ بہت سے مسافر احتیاطاً روک لیے گئے ہیں۔ وہ رکنے کو تیار نہیں تھے لیکن افسروں نے انہیں اجازت نہیں دی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بعض زخمیوں کو لکھنؤ اور فیض آباد بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ قلی بھی انجن ڈرائیور کی تعریف کر رہا تھا کہ اس کی مشاقی سے گاڑی کسی بڑے حادثے سے بچ گئی۔ کہنے لگا کہ خدا نے خیر کر لی۔ جس کی لکھی تھی، اسے تو جانا ہی تھا۔ موت کے بھی کیسے کیسے بہانے ہوتے ہیں۔ میں نے اس کی اجرت اور اندازاً چائے کی قیمت سے زیادہ روپے دیے تو وہ حساب بتانے اور باقی روپے واپس کرنے لگا۔ میں نے واپس ہی نہیں لیے۔ وہ سلام کر کے اور دعائیں دے کے چلا گیا اور جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی بھری کوری صراحی تھی۔ پانی کے لیے مجھے بار بار مختلف اسٹیشنوں پر اترنا پڑتا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور شکریہ رسمی نہیں تھا۔

جتنی دیر گاڑی اکبر پور اسٹیشن پر کھڑی رہی۔ قلی کی موجودی کے باوجود مجھ پر ہیجانی سی کیفیت طاری رہی۔ روشنی اب پختہ ہو گئی تھی۔ صبح کی تازگی

اور معصومیت رخصت ہوگئی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے گاڑی نے حرکت کی۔ اکبر پور تیزی سے دور ہوتا رہا اور گاڑی دونوں طرف پھیلے سبزہ زاروں سے گزرنے لگی تو میں نے بیگ کھول کے توشہ دان نکالا۔ چار حصوں پر مشتمل توشے دان میں مرچ قیمہ، میتھی پالک کی بھجیا، پوریاں، میٹھی ٹکیاں اور سوجی کا حلوہ رکھا ہوا تھا۔ پوریوں اور ٹیکیوں کے خانے میں چھوٹی چھوٹی سلور کی کٹوریاں اچار اور چٹنیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ زریں نے ایسی چیزیں ہی منتخب کی تھی جو سفر میں جلد متاثر نہ ہوسکیں۔ بیگ میں تام چینی کی دو پلیٹیں، آسمانی رنگ کے ریشمی کپڑے میں لپٹی اور سنہری ڈوری سے بندھے چمچے اور ایک مختصر پھول دار دستر خوان بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ سلیقہ دیکھ کے زریں کا سراپا آنکھوں میں اتر آیا۔ کسی نے کہا ہے، سلیقے سے مراد احساس تناسب ہے اور سلیقہ حسن ہے۔ سلیقہ آدمی کے اندر کے سلجھاؤ کی غمازی کرتا ہے اور سلیقہ برداشت ہے۔ چیزوں کی تقدیم وتاخیر درجہ اور سلسلے وار ترتیب میں ایک تحمل چاہیے۔ زریں میں یہ خوبیاں بدرجہ تمام تھیں۔ کچھ قدرت کا عطیہ، کچھ خود اپنی نیت اور کوشش کا حاصل۔ کوئی بہت حسین ہو بہت بے سلیقہ بھی ہوسکتا ہے۔ زریں کو قدرت نے ہر طرح سے نوازہ ہے۔ وہ خود بھی مجسم تناسب، مجسم سلیقہ ہے۔ حسن صرف رنگ روپ نہیں، ایک تناسب بھی ضروری ہے۔ زریں کا وجود تو جیسے تراشا گیا تھا۔ میں نے برتھ پر دستر خوان بچھا کے کھانا چن دیا۔ مجھے بالکل بھوک نہیں تھی لیکن کھانے کے رنگ اور خوشبو کا بھی ایک تاثر ہوتا ہے۔ بٹھل بھی کھانے کی برتھ پر چلا آیا۔ ایک تو کھانا لذیذ تھا، کچھ ایک دوسرے کے خیال سے ہم نے سیر ہو کے کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے بٹھل کو دوا کی دوسری خوراک دی اور پانوں کی ڈبیا اور بٹوا اس کے پہلو میں رکھ دیا۔ گلوری کھا کے اور بیڑی سلگا کے وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر کا نظارہ کرتا رہا، پھر برتھ پر دراز ہوگیا۔

اکبر پور سے مغل سرائے کا فاصلہ 100 میل سے کچھ کم ہے۔ دوپہر دو بجے گاڑی مغل سرائے پہنچ گئی اور اتفاق سے آدھ گھنٹے بعد ہی ہمیں کلکتے کی طرف جانے اور بڑی لائن پر چلنے والی تیز رفتار گاڑی مل گئی۔ میرا خیال تھا، بٹھل پہلے دھن باد جا کے ظفر سے بات کرے گا۔ ظفر کو اب اپنی منگیتر فروزاں کے پاس چلے جانا چاہیے۔ گو فروزاں، یاسمن اور ان کے مربی نصیر بابا نے فیض آباد میں اس کی آمد کے لیے کسی بے کلی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اب خاصے دن ہوگئے تھے۔ فروزاں کے والد ایرانی نژاد پروفیسر کے انتقال کے بعد ظفر ہی ان کے گھر کا واحد نگراں تھا۔ وہ یقیناً کوئی ایسا فرض شناس وجیہہ وشکیل، لائق فائق نوجوان ہوگا جو پروفیسر جیسے دیدہ ور نے اپنی نازک اندام، حور شمائل بیٹی کے لیے منتخب کیا تھا۔ میں نے ظفر کی شرافت، نجابت اور لیاقت کے متعلق بہت سنا تھا اور مجھے اسے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ وہ لاکھوں میں ایک فروزاں جیسی لڑکی کا منگیتر تھا۔ علم وفضل کے جویا اس سادہ شعار نوجوان پر کمینہ صفت سید محمود علی نے ہر ستم آزمایا تھا۔ اس نے پروفیسر کی مرحومہ بیوی اور اس کی بیٹیوں تک ظفر کی رسائی کا ہر راستہ بند کردیا تھا۔ پروفیسر کے بے سہارا خاندان کو ظفر سے بدظن کرنے کے لیے اس نے بڑی شعبدہ بازی کی تھی۔ شہر آسن سول کی زمین اس شاطر نے ظفر کے لیے تنگ کردی تھی۔ ظفر کو پڑوسی شہر دھن باد میں پناہ لینی پڑی اور اس کی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی۔ میرے پوچھنے پر بٹھل نے بردوان شہر کا نام لیا۔ آسن سول سے ہم فیض آباد نہ جاتے تو ہمیں بردوان ہی جانا تھا۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”ظفر میاں کے پاس نہیں جانا؟“

”نہیں رے۔“ اس نے اکتائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”نصیر بابا کہتے تھے، اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اب دن بھی بہت ہوگئے۔ فیض آباد جا کے وہ سنبھل جائے گا اور ان دونوں، فروزاں اور یاسمن کی تسلی بھی ہوجائے گی۔“

”ابھی اس کو ادھری رہنے دے۔“

”کیوں؟ اب نہیں تو پھر کب؟“

”ابھی ٹائم نہیں آیا۔“ بٹھل نے آنکھیں میچ کے کہا۔

وقت سے اس کی کیا مراد ہے؟ میں نے وضاحت نہیں چاہی اور خود سمجھنے کی کوشش کی۔ ایک ہی وجہ قریب قیاس نظر آتی تھی کہ فیض آباد کے دگرگوں حالات کے پس منظر میں ظفر کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ باقی لوگوں کی بات دوسری ہے۔ زریں کی حویلی اور فیض آباد، ظفر کے لیے اجنبی ہیں۔ میں نے پھر کوئی بحث نہیں کی۔ وقت کم تھا۔ کلکتے کی طرف جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ مجھے ٹکٹ لینے کے لیے اسٹیشن سے باہر جانے میں وقت ضائع کرنا نہیں پڑا۔ میری درخواست پر گاڑی کے ٹی ٹی نے بردوان تک کا کرایہ لے کر پرچی کاٹ دی۔

اول درجے میں کوئی جگہ نہیں تھی، مجبوراً ہمیں دوسرے درجے میں بیٹھنا پڑا۔ ڈبے میں پہلے سے نوجوان مرد وعورت اور شیر خوار بچہ موجود تھے۔ لباس سے آسودہ حال معلوم ہوتے تھے۔

چہروں کی تازگی اور چمک ہی آسودہ حالی کی چغلی کھاتی ہے۔ نوجوان نے ڈبے میں ہمارے داخل ہوتے وقت ہمیں ٹوکا تھا کہ یہ سیکنڈ کلاس کا ڈبا ہے، یہ سن کے مجھے حرارہ آیا تھا۔ میں نے ترخ کے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہے۔“ وہ کچھ شرمندہ ہوا اور کسمسا کے رہ گیا۔ نظر آرہا تھا کہ اسے یقین نہیں آیا ہے۔ اس کی خوب صورت بیوی ہمیں دیکھ کے منہ پھیر کے بیٹھ گئی۔ یہ تجربہ ہمیں کئی بار ہوچکا تھا۔ اونچے درجے اور اونچے لوگوں میں بیٹھنے کے لیے دام ودرم ہی کافی نہیں ہوتے، کچھ اور بھی لوازم ہوتے ہیں۔ یوں بھی پہلے سے بیٹھا ہوا ہر مسافر ڈبے کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ بہرحال بٹھل کو آرام کے لیے پوری برتھ مل گئی۔ بردوان تک طویل فاصلہ تھا۔ چار سو سوا چار سو میل کے قریب۔ کم از کم بارہ گھنٹے کا سفر۔ صبح اکبر پور سے نکلتے ہی ہم نے کھانا کھایا تھا۔ اب دوپہر ہوگئی تھی۔ بٹھل نے چائے کے ساتھ زریں کی دی ہوئی دو میٹھی ٹکیاں کھائیں اور مزید کچھ کھانے سے انکار کردیا۔ میں نے بھی اسی پر اکتفا کیا۔

چھوٹے چھوٹے اسٹیشن درگزر کرتی ہوئی گاڑی تیز رفتاری سے سفر کررہی تھی۔ مغل سرائے سے گاڑی چلے ہوئے ڈھائی گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ بٹھل یکایک اٹھ بیٹھا۔ میں جاگ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہیں۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے اضطراب سے پوچھا۔

”پٹنا اب کتنی دور ہے؟“ اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔

”قریب ہی ہونا چاہیے۔ مغل سرائے سے سوسوا سو میل کی دوری تو ہے؟“ میں نے تذبذب سے کہا۔

ہمارے ہم سفر نے بھی سن لیا تھا۔ اس نے بھی دخل دیا کہ سات بجے تک گاڑی پٹنا پہنچ جانی چاہیے۔

”پٹنے کو کیوں پوچھ رہے ہو؟ کوئی کام ہے؟“ میں نے منتشر آواز میں پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”جب آئے تو بول دینا۔“

”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”سر میں تھوڑی دکھن ہے۔“

”دکھن ہے، ہاں!“ میری زبان لڑکھڑا گئی اور مجھے دھچکا سا لگا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کے میں اس کی

برتھ کی طرف جھپٹا اور اس کے پاس جا کے ٹھٹک گیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اس کی کلائی پکڑی۔ کلائی گرم تھی۔ اس کی پیشانی چھوئی۔ پیشانی کلائی سے زیادہ گرم تھی۔ ''تمہیں تو بخار؟'' میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا۔ ''کیا، کیا بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟''

''اتنی نہیں جتنا تو......'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''بولا نا، تھوڑا دکھتا ہے۔''

''قریب کے کسی اسٹیشن پر اتر جاتے ہیں۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا، واپس چلو مگر تم......'' میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب آراء شہر آ رہا ہے۔ آتا ہی ہوگا۔ بکسر گزر چکا ہے۔ آراء بھی جنکشن ہے۔ ٹھیک ہے، وہاں اتر جاتے ہیں۔ وہاں سے ہمیں کوئی بھی گاڑی مل جائے گی۔''

اسے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوگی ورنہ چھوٹی موٹی تکلیفوں کا تو وہ ذکر ہی نہیں کرتا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ چلتی گاڑی میں، میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے جو گولیاں دی تھی، اس کی دو خوراکیں میں دے چکا تھا۔ شاید انہی کا اثر تھا کہ وہ اب تک کسی قدر آرام سے رہا۔ میں نے وہی گولیاں نکال کے اسے دیں۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ آدھے گلاس پانی سے نگل لیں۔ سر دبانے کے لیے ڈاکٹر نے مجھے منع کر دیا تھا۔ گولیاں کھا کے وہ پھر لیٹ گیا۔ میں اپنی نشست پر پہلو بدلتا رہا۔ مجھے تو اپنی فکر ہی رہتی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ بیمار بھی ہو سکتا ہے، اسے بھی چوٹ لگ سکتی ہے۔ اس دوران گاڑی دو ایک اسٹیشنوں پر ٹھیری اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں آراء جنکشن آ گیا۔ میں نے سامان سمیٹ لیا تھا۔ سمیٹنا بھی کیا تھا، صرف ایک بیگ ہی کھولا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے بہت کہا لیکن وہ آراء پر اترنے کو آمادہ نہیں ہوا۔ دوا سے شاید اسے کچھ افاقہ ہوا ہو۔ ''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟ کیا بات ہے، بتاتے کیوں نہیں؟'' میں نے بہ ظاہر ناراضی سے کہا۔

''ٹھیک ہے رے۔'' وہ بہت دھیمی آواز میں بولا۔

''میں کہتا ہوں، یہیں اتر جاتے ہیں۔ میری بات مان لو۔''

''پٹنے پہ دیکھیں گے۔''

میری التجا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کوئی تک ہی نہیں تھی کہ ہم اور دور جا کے فیض آباد والی گاڑی پکڑیں۔ میں اس حالت میں اس سے حجت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آراء شہر بھی گزر گیا۔ ہمارے ہمسفر نے پٹنے پہنچنے کا وقت سات بجے بتایا تھا۔ گاڑی آٹھ سے کچھ پہلے پٹنا شہر میں داخل ہوئی۔ بٹھل کو میں نے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ تیار تھا۔ میں دروازے پر کھڑا ہو گیا کہ قلی کو فوراً بلا لوں۔ گاڑی رکتے ہی قلی اندر آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مغل سرائے کے لیے اب گاڑی کس وقت ملے گی تو وہ حیرت زدہ ہوا تاہم اس نے بتایا کہ دو گھنٹے بعد ہاوڑا ایکس پریس ادھر سے گزرے گی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ ہمیں فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں پہنچا دے۔ بٹھل سنتا رہا تھا۔ جب میں قلی سے بات کر رہا تھا، وہ کچھ نہیں بولا۔ گاڑی سے اتر کے اس نے قلی کو اسٹیشن سے باہر چلنے کا حکم دیا۔ میں اس کی صوت دیکھتا رہ گیا۔

''شہر جانا ہے۔'' میں نے جھلا کر کہا۔ ''شہر کیوں؟ پھر بردوان ہی چلو۔'' کوئی جواب دینے کے بجائے وہ آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف بڑھتا رہا۔ میری کسی بات کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ مجھے بڑی جھنجلاہٹ ہو رہی تھی لیکن مجھے اس کے ساتھ ہی چلتے رہنا تھا۔ میں نے چپ سادھ لی۔

اسٹیشن کے باہر ایک دوسرے سے پیوست بگھیوں اور تانگوں کی ایک بڑی تعداد مسافروں کی

منتظر تھی۔ بٹھل نے بگھی والے کو اشارہ کیا اور اسے گرانڈ ہوٹل چلنے کو کہا۔ بگھی میں ہمارے درمیان سکوت رہا۔ ابھی رات کی ابتدا تھی۔ شہر کی سڑکیں صاف ستھری اور روشن تھیں اور خوب چہل پہل تھی۔ اسٹیشن سے ہوٹل کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ بگھی نے ہمیں ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ کاؤنٹر پر ہوٹل کے رجسٹر میں رسمی خانہ پری کے بعد مجھے کمرے کی چابی مل گئی اور مجھے حیرت ہوئی۔ کمرے میں جانے کے بجائے بٹھل کاؤنٹر کے سامنے صوفے پر بیٹھا رہا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب میں اپنی زبان ہی بند رکھوں گا۔ ہوٹل کے خدمت گار نے ایک کشادہ، نہایت آرام دہ کمرے میں ہمارا سامان پہنچایا۔ سامان رکھ کے اور کمرا مقفل کر کے میں فوراً بٹھل کے پاس چلا آیا۔ میرے پہنچتے ہی وہ اٹھ گیا۔ میں نے سنا نہیں تھا۔ اس نے کس وقت بگھی کو ٹھیرے رہنے کے لیے کہا تھا۔ کوچوان کو جب اس نے پٹنا میڈیکل کالج اسپتال کا نام بتایا تو میرا ماتھا ٹھنکا اور میں چپ نہ رہ سکا۔ ''اسپتال جا رہے ہو؟'' میں نے سراسیمگی سے کہا۔

''ہاں رے، دکھا دیں ادھری۔''

''کیا بات ہے؟ سچ بتاؤ، کیا حال ہے؟''

''دیکھتے ہیں رے ادھر جا کے۔''

''مجھ سے مت چھپاؤ۔'' میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

''تیرے ساتھ ہی چلتے ہیں۔''

''کیا، کیا بہت زیادہ......'' میری آواز پھٹنے لگی۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ مجھے احساس ہوا کہ میری پرسش یا دخل اندازی اسے گراں نہ گزر رہی ہو۔ اس موقع پر مجھے سوال جواب نہیں کرنے چاہئیں۔ میرا دل ہول رہا تھا۔ ہوٹل سے اسپتال کا فاصلہ کم نہیں تھا۔ بگھی کی رفتار سست تھی جتنی دیر ہو رہی تھی۔ میری وحشت بڑھتی جاتی تھی۔ آخر بگھی ایک بڑے اسپتال کے سامنے رک گئی۔ بگھی سے اتر کے ہم نے خاص عمارت کا رخ کیا۔ جانے بٹھل کس طرح چل رہا ہوگا۔ کچھ وہی جانتا ہوگا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ اسپتال کی عمارت میں اپنے پیروں سے داخل ہوا تھا لیکن ظاہر تھا، کسی بڑی تکلیف ہی میں اس نے سفر ترک کر کے اسپتال کا رخ کیا ہے۔ دواؤں اور علاج معالجے سے اسے ویسے بھی کبھی سروکار نہیں رہا تھا۔ اسپتال کے عملے نے ہمیں پختہ عمر کے ایک جواں شکل ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا دیا۔ کوئی توقف کیے بغیر میں نے اسے جلدی جلدی سارا واقعہ بتایا اور گزارش کی کہ وہ ہم پر خصوصی توجہ دے۔ وہ ایک کم گو آدمی تھا۔ عینک لگائے، کچھ ڈھیلا ڈھالا سا، کسی انگریزی کتاب کے مطالعے میں مصروف، بے تاثر سا ایک شخص۔ اس نے کچھ کہے بغیر بٹھل کو ایک گوشے میں رکھے معائنہ بستر پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا اور سر کے مختلف حصے دبا کے دیکھے اور کچھ وہی سوال کرنے لگا جو گزشتہ رات ریل کے ڈبے میں اکبر پور کے ڈاکٹر سکینہ نے کیے تھے۔ وہ مجھے نو آموز ڈاکٹر لگتا تھا۔ میں نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ بہتر ہے، وہ اسپتال کے کسی اور ڈاکٹر کو بلا کے اس سے مشورہ کرے۔ میری تجویز پر وہ برافروختہ نہیں ہوا، سر ہلانے لگا۔ گھنٹی بجا کے اس نے چپراسی کو طلب کیا اور کسی ڈاکٹر سری ناتھ کو بلانے کے لیے کہا۔

کچھ دیر میں کئی ڈاکٹر کمرے میں جمع ہو چکے تھے۔ ان میں ایک زیادہ عمر کا تھا۔ ان سب نے بٹھل اور مجھ سے سوالوں کی تکرار کی اور بٹھل کے پاس سے ہٹ کے مشورت کرنے لگے۔ وہ بیش تر انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ بہت کچھ مجھے بھی سنائی دے رہا تھا۔ پہلے تو وہ آپس میں الجھتے رہے۔ ان کی رائے تھی کہ بہ ظاہر کسی بڑی چوٹ کے آثار نظر

نہیں آتے۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ صبح تک بٹھل کو اسپتال میں روک لیا جائے۔ اسپتال کا بڑا ڈاکٹر، ڈاکٹر رائے صبح سویرے اسپتال آجاتا ہے۔ اس کے آنے تک بٹھل کو سکون کی دوائیں دی جاتی رہیں اور رات کسی طور گزار دی جائے۔ ممکن ہے، ایکس رے کی ضرورت پڑے۔ یہ فیصلہ بھی ڈاکٹر رائے ہی کر سکتا ہے۔ ان کا انداز بے حد سرد مہری کا تھا۔ آپس میں صلاح مشورے کے بعد بڑی عمر کا ڈاکٹر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہم مریض کو رات بھر کے لیے......''

مجھے معلوم تھا، وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے روک دیا اور انگریزی میں پوچھا۔ ''ڈاکٹر رائے اس وقت کیوں نہیں آسکتے؟''

مجھے انگریزی میں بولتا دیکھ کے ان کے جسم لہرا گئے، آنکھیں پھیل گئیں۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد نرمی سے کہا۔ ''وہ اس وقت گھر پہ رہتے ہیں اور مریض دیکھنا پسند نہیں کرتے۔''

''یہ کون سا ڈاکٹر ہے؟'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''مرض گھڑی دیکھتا ہے جو ڈاکٹر گھڑی کا پابند ہے۔ یہ اسپتال بھی رات کو بند کر دیا کریں۔ رات آرام کے لیے ہوتی ہے۔ آپ سارے بھی یہاں کیوں ہیں۔ گھر جا کے آرام کریں۔''

''آپ اطمینان رکھیے۔ ہم رات بھر ان کی خبر گیری کریں گے۔ کوئی ایسی گھبرانے والی بات نہیں معلوم ہوتی۔'' ڈاکٹر نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''ہم بردوان جا رہے تھے۔ پٹنے کے اس اسپتال میں دکھانے کے لیے ہم نے آگے کا سفر ختم کیا۔ ہم کسی امید سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ازراہِ کرم آپ ڈاکٹر رائے سے رابطہ کیجیے یا مجھے ان کا پتا بتائیے۔ میں ان کے پاس جا کے منت کرتا ہوں۔ ہم ان کی، جتنی بھی فیس ہو، ادا کر دیں گے۔''

''ڈاکٹر رائے کے کچھ اصول ہیں جناب۔'' ڈاکٹر نے متانت سے کہا۔

''پھر کسی اور ڈاکٹر کو بلانے کا بندوبست کیجیے۔ کیا اس بڑے شہر میں ڈاکٹر رائے کے سوا کوئی اور ڈاکٹر نہیں ہے۔ میں نے آپ سے کہا نا، روپے پیسے کی فکر مت کیجیے۔ کوئی بھی فیس اور کتنا بھی خرچ ہو۔'' میری درخواست میں درشتی شامل تھی۔

عمر رسیدہ ڈاکٹر کسی قدر بے چارگی کی سی کیفیت میں اپنے ساتھیوں کے چہرے دیکھنے لگا۔

''دیکھیے نا!'' میں نے اس سے کہا۔ ''اسپتال میں کوئی بھی مریض کسی وقت، کسی حالت میں آسکتا ہے، کیا بس یہاں ڈاکٹر رائے پر انحصار کیا جاتا ہے۔ آپ، آپ لوگ یہاں پھر کس لیے ہیں؟''

''یہ کیس پیچیدہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ دماغ کا معاملہ ہے۔ ہمیں احتیاط کرنا ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز الجھ رہی تھی۔

''پھر تو اور ضروری ہے۔ آپ یہ کیس صبح پر کیوں ٹال رہے۔ پھر ایک مہربانی کیجیے اس شہر میں، میں اجنبی ہوں، کوئی سواری مجھے فراہم کر دیجیے۔ میں خود ڈاکٹر رائے کے گھر جا کے دہائی دیتا ہوں یا جس ڈاکٹر کو آپ بتائیں جس کے اصول اتنے سخت نہ ہوں۔ جو اپنے پیشے سے انصاف کرتا ہو، جو واقعی ڈاکٹر ہو یا کوئی ایسا ڈاکٹر جو روپے پیسے کو بہت عزیز سمجھتا ہو۔۔۔ میری مدد کیجیے۔ یوں کھڑے کھڑے آپ وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔''

میرے منہ میں جو آیا، میں کہتا گیا۔ جی میں تو یہ آتا تھا کہ جیب سے چاقو نکال لوں۔ یہ زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی تو دوسری ضرور آئے گی۔

جواب میں عمر رسیدہ ڈاکٹر دیر تک چپ رہا پھر اس نے ایک نوجوان ڈاکٹر سے کہا۔ ''ڈاکٹر رائے کے پاس جا کے ساری صورت حال بتا دو ورنہ پھر انہیں ڈاکٹر سمپت کے پاس بھیجنے کا انتظام کرو۔

ڈاکٹر سمپت اس اسپتال میں نہیں آئیں گے۔ ان کے گھر ہی جانا ہوگا۔ وہ ایک مہربان آدمی ہے لیکن پہلے ڈاکٹر رائے کو دیکھو، شاید وہ......وہ۔'' وہ شانے اچکا کے بولا۔

''وہ نہیں آئیں گے جناب! آپ کو معلوم ہے، انہوں نے سختی سے تاکید کی ہے۔ پہلے بھی......'' نوجوان ڈاکٹر کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔

''اچھا ہے، ایک بار انہیں دیکھ لو۔'' عمر رسیدہ ڈاکٹر کا لہجہ نیم حکمیہ تھا۔ ''بعد کو کوئی شکایت بھی ہوسکتی ہے۔''

''آپ کہیں تو میں ساتھ چلتا ہوں۔'' میں کہنا چاہتا تھا، شاید میری التجا سے ڈاکٹر رائے متاثر ہوجائے۔

''نہیں۔'' عمر رسیدہ ڈاکٹر نے صاف انکار کر دیا۔ ''آپ یہیں ٹھہریں اور انتظار کریں۔ سر دست ہم مریض کو کچھ دوائیں دیتے ہیں۔''

اس سے اب کوئی اور بات کرنی مناسب نہیں تھی۔ اس کی ہدایت پر کمرے میں پہلے سے تعینات ڈاکٹر نے بٹھل کے بازو میں سوئی گھونپ دی اور چند گولیاں بھی کھلائیں۔ اس کے اور عمر رسیدہ ڈاکٹر کے سوا باقی ڈاکٹر چلے گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی، ہیبت ناک سی خاموشی۔ پھر عمر رسیدہ ڈاکٹر ......نے کرسی پر بیٹھ کے پائپ سلگایا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''یہ آپ کے کون ہیں؟''

''کیا بتاؤں۔'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے سب کچھ ہیں، میرے بھائی، دوست میرے بزرگ، میرے محسن......''

''آپ کا ان سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہے؟''

''تمام انسانوں کا ایک دوسرے سے خونی رشتہ ہوتا ہے۔''

''ہاں۔'' وہ کچھ بے قرار ہوا اور ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں بلکہ آپ نے بڑی سچی بات کہی ہے۔'' پھر پوچھنے لگا۔ ''آپ لوگوں کا کیا مشغلہ ہے؟''

مجھے جواب دینے میں تامل ہوا۔ وہ چمکتی آنکھوں سے منتظر تھا۔ میں نے کہا۔ ''ہماری زمینیں ہیں۔'' زمینوں کا سن کے عموماً دوسرے سوالات نہیں کیے جاتے۔

''آپ زمیں دار ہیں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''فیض آباد میں آپ کی زمینیں ہیں؟''

''اور بھی کئی جگہ......'' میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

اس نے توصیفی انداز میں آنکھیں پھیلائیں۔

''آپ تو خوب تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔''

''انگریزی گوئی سے مراد علم یافتگی نہیں ہے۔''

''ہاں ہاں۔'' اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ ''لیکن سمجھا کچھ ایسا ہی جاتا ہے۔''

''حکمرانوں کے لاؤ لشکر میں ان کی تہذیب بھی ہوتی ہے۔ گوروں کو تو یہاں حکمرانی کرتے ہوئے زمانہ گزر گیا۔''

''بے شک، بے شک، اور یہ بھی تو سچ ہے کہ اب وہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان کا وقت ہے، کیوں کہ ان کے پاس علم ہے۔'' اس وقت ان باتوں کا کوئی محل نہیں تھا۔ حکیم ڈاکٹر کو علاج معالجے کے علاوہ کچھ اور بھی جاننا چاہیے۔ اس کی مزید سوالوں سے بچنے کے لیے میں کرسی سے اٹھ گیا اور میں نے بٹھل کے بستر پہ جا کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ''ٹھیک ہے کچھ؟'' اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ ''بس اب ڈاکٹر صاحب آتے ہی ہوں گے۔'' میں نے اس کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔

اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ میں نے ہلکے ہاتھ سے اس کے بکھرے بال درست کیے اور ڈاکٹر کے پاس

آ کے بیٹھ گیا۔
"میں آپ کی بے چینی سمجھ رہا ہوں۔ کبھی مریضوں سے زیادہ ہمیں تیمارداروں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ مشکل یہ ہے، انہیں پرسکون رہنے کی دوا بھی نہیں دے سکتے۔" عمر رسیدہ ڈاکٹر مجھے تسلی دینے لگا۔ "اطمینان رکھیے، آپ صحیح جگہ آ گئے ہیں۔"
میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر بھی چپ ہو گیا۔ اسے کیا اندازہ ہو سکتا تھا، مجھ پر یہ وقت کیسے گزر رہا ہے۔ میں تو لمحے گن رہا ہوں۔ کمرے کی دیواری گھڑی نے ساڑھے گیارہ کا گھنٹا بجایا تو ڈاکٹر نے اپنے بند گلے کے کوٹ سے جیبی گھڑی نکال کے وقت کی تصدیق کی اور نوجوان ڈاکٹر سے بولا۔ "ہریش کو گئے دیر ہو گئی۔ اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے۔"
"ڈاکٹر رائے کا گھر کتنی دور ہے؟" میں نے تندی سے پوچھا۔
"ایسا دور نہیں، قریب ہی ہے۔" ڈاکٹر کے لہجے میں بے چینی بھی تھی، پشیمانی بھی۔ "کچھ دیر اور دیکھتے ہیں۔"
کچھ دیر اور گزر گئی۔ میری نگاہیں کبھی دروازے کی طرف اٹھتی تھیں کبھی بٹھل کی طرف۔ اگر ڈاکٹر رائے آمادہ نہ ہوا؟ بٹھل کی حالت مجھے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اس وقت اس اجنبی شہر میں، میں کہاں کہاں، کس کس دروازے پر دستک دوں گا۔ یہ سوچ سوچ کے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر کا حال یقیناً مجھ جیسا نہیں ہو گا لیکن وہ بھی اب خاصا متفکر معلوم ہوتا تھا۔ کرسی سے اٹھ کر وہ کمرے میں ٹہلنے لگا، بٹھل کے پاس بھی گیا اور اسے ایک نظر دیکھ کے پلٹ آیا۔ میں اس سے منت کرنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر رائے کا مزید انتظار کرنے کے بجائے وہ کوئی اور تدبیر کرے۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے ہمت استوار کی تھی کہ اسی دم کمرے کے باہر سے تیز قدموں کی چاپیں ابھریں۔ نوجوان ڈاکٹر نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "اگر واقعی وہی ہیں تو حیرت ہے؟" یہ کہتا ہوا وہ لپک کے دروازے کی طرف بڑھ گیا مگر اس کے باہر نکلنے سے پہلے ستر سال کے لگ بھگ عمر، اوسط قد کا، بھورے رنگ کی پتلون پر آدھی آستینوں کی پھول دار قمیض پہنے، کھلتی ہوئی سرمئی رنگت کا ایک صحت مند شخص کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے عقب میں نوجوان ڈاکٹر ہریش کے علاوہ ایک اور شخص بھی تھا۔
"کیا ہوا؟" ڈاکٹر رائے نے کھردری آواز میں پوچھا۔
عمر رسیدہ ڈاکٹر نے انگریزی میں مختصر بٹھل کے مرض کی نوعیت سے آگاہ کیا اور بٹھل کے بستر کی طرف انگلی اٹھائی۔ ڈاکٹر رائے نے خود بھی مڑ کے دیکھ لیا تھا۔ ناگواری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔
اپنے سرہانے سرسراتی آہٹوں پر بٹھل نے آنکھیں کھول دیں۔
"ڈاکٹر گوکھلے! تم کہہ رہے تھے، تم نے اسے......دی ہے۔" ڈاکٹر رائے نے کسی دوا کا نام لیا تھا۔ میں پوری طرح نہ سن سکا۔ "کتنی دیر ہوئی؟"
پہلی بار مجھے علم ہوا کہ عمر رسیدہ ڈاکٹر کا نام گوکھلے ہے۔ اس نے تندہی سے جواب دیا۔ "دیر ہو گئی جناب! شاید گھنٹا بھر پہلے۔"
"ایک گھنٹا!" ڈاکٹر رائے کی تیوری چڑھ گئی۔ "مگر یہ تو جاگ رہا ہے۔"
"جی، میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر ہم نے اسے پوری خوراک دی تھی۔ یا تو درد شدید ہے یا یہ آدمی اعصاب کا مضبوط ہے۔ یہ اپنے پیروں سے چل کے یہاں آیا تھا جناب!" ڈاکٹر گوکھلے کی عمر ڈاکٹر رائے کے برابر ہو گی، ممکن ہے، کچھ زیادہ ہی۔ وہ ڈاکٹر رائے کی جناب میں نہایت مودب تھا اور یہی

حال دوسرے ڈاکٹروں کا تھا۔ وہ تقریباً ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان سب کی نظروں میں ڈاکٹر رائے کی اس قدر منزلت سے مجھے کچھ سکون ہوا۔ وہ کوئی بڑا ہی ڈاکٹر ہوگا۔ ہر صاحب کمال کے اپنے تیور ہوتے ہیں۔ وہ بھی کچھ الگ قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

ڈاکٹر رائے، بٹھل کے جسم پر جھک گیا اور مختلف زاویوں سے تادیر اس کا سر دباتا رہا۔ بٹھل کا چہرہ کھنچتا اور کھلتا رہا۔ اس کی کوئی آہ یا کراہ بلند نہیں ہوئی۔ ''کتنا درد ہے؟'' ڈاکٹر نے ہندوستانی میں پوچھا۔

''ابھی تھوڑا کمی ہے۔'' بٹھل نے مدھم آواز میں رک رک کے کہا۔

ڈاکٹر اس کے سر پہ ٹھونگیں مارنے لگا اور اس نے اپنا کان سر کے قریب کرلیا۔ ''جدھر جاستی ہوتا ہے، مجھ کو بولو۔'' ڈاکٹر رائے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا اور پوچھنے لگا۔ ''ابھی پورا سننے میں آتا ہے، میں کیا بولتا ہوں؟''

بٹھل نے آہستہ سے سر ہلایا۔

ڈاکٹر نے پورے سر پہ ٹھونگیں مارنے کا عمل دہرایا۔ پہلے ہلکے ہلکے پھر رفتہ رفتہ زور زور سے۔ بٹھل کے چہرے پر شکنیں گہری ہوتی گئیں۔

''بولو، کس جگہ پہ زیادہ دکھتا ہے؟''

بٹھل نے آنکھیں بھینچ لیں اور بہ مشکل جواب دیا۔ ''سارا پھٹتا ہے۔'' ڈاکٹر رائے نے اس کے سر سے ہاتھ ہٹالیا اور آلہ لگا کے جسم کے مختلف حصوں کا جائزہ لیا، نبض دیکھی، پپوٹے اٹھا کے دیکھے اور بازو پر پٹی باندھ کے خون کے دوران کا معائنہ کرتا رہا۔ ''اس کے ساتھ کون ہے؟'' اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

میں ڈاکٹر گوکھلے کی آڑ میں کھڑا تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کے مجھے سامنے کیا اور مودبانہ کہا۔ ''یہ نوجوان اس کے ساتھ ہے۔''

ڈاکٹر رائے نے سر تا پا مجھے گھور کے دیکھا۔ ''اوہ...... تم! تم مریض کا کیا لگتا ہے؟''

وہی سوال! اس کے جواب سے مجھے خفقان سا ہونے لگتا تھا۔ میں کسی کو کیا جواب دوں۔ جو رشتے ناموں اور درجوں سے سوا ہوتے ہیں، کوئی ان کی تشریح کیا کرے۔ مجھے متذبذب دیکھ کے ڈاکٹر گوکھلے نے میری مشکل آسان کی۔ ''یہ دونوں بھائی ہیں جناب!''

ڈاکٹر رائے کے ہونٹ پھیل گئے۔ بٹھل کے سر پہ تھپکی دیتا ہوا وہ کمرے کے وسط میں رکھی میز کی طرف آگیا۔ میری نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے یا یہ میرا وہم تھا۔ میں کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ مجھے تو بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ''ہم اس کو ابھی ادھر روکتا ہے۔ سمجھے! ایک رات یہ آبزرویشن میں رہیگا۔ سویرے اس کو پھر دیکھے گا۔ مجھ کو ابھی سارا بات بولو۔'' ڈاکٹر رائے نے دوٹوک انداز میں مجھے مخاطب کیا۔

میں نے اپنا حلق تر کیا اور شکستہ آواز میں گزشتہ رات کی روداد سنانی شروع کی تو ڈاکٹر گوکھلے نے دخل دیا کہ بہتر ہے، میں ڈاکٹر رائے کو انگریزی میں تفصیل بتاؤں۔ ڈاکٹر رائے بھی میری انگریزی دانی پر متعجب ہوا تھا مگر اس نے گوکھلے کی طرح مجھ سے سوال جواب نہیں کیے۔ میں نے اسے ڈبے میں ڈاکٹر سکینہ کی آمد، اس کے معائنے، اس کے لکھے ہوئے نسخے اور دوا کے بارے میں بتایا۔ میں نے کہا کہ نسخے کی دوائیں خریدنے کا وقت ہی نہیں مل سکا۔ گولیوں کی تین خوراکیں دے چکا ہوں اور کوئی افاقہ نہیں ہوا ہے۔ جیب سے گولیوں کی پڑیا اور نسخہ نکال کے میں نے اسے پیش کردیا۔ اس نے غور سے نسخہ پڑھا، گولیاں دیکھیں اور دونوں چیزیں مجھے لوٹا دیں۔

''دیکھو نوجوان!'' اس نے میرے کندھے پر

ہاتھ رکھ کے کہا۔ اس کا لہجہ خاصا نرم تھا۔ کہنے لگا۔ ''ہم ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔ یہ اندرونی چوٹ ہے۔ ہمیں بہتری کی امید کرنی چاہیے۔ رات کے لیے ہم ایسی دوائیں دے رہے ہیں جو درد بھی کم رکھیں گی اور مریض کو نیند بھی آجائے گی۔ صبح تک انتظار کرو۔ ہوسکتا ہے، کچھ دن تمہیں یہاں ٹھیرنا پڑ جائے۔ کیا تمہارے لیے یہ ممکن ہے؟''

''میری سب سے بڑی ترجیح ان کا علاج ہے۔'' میری آواز بھرا گئی۔

''ٹھیک ہے۔ یہ لوگ مریض کو ایک آرام دہ کمرے میں منتقل کردیں گے۔ تم بھی وہیں رہ سکتے ہو۔ رات بھر وقفے وقفے سے ڈاکٹر آتا رہے گا اور مریض پر نگاہ رکھے گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو، درد زیادہ اٹھنے لگے تو تم ڈاکٹر طلب کرسکتے ہو۔ نرس بھی دیکھ بھال کرتی رہے گی۔''

''مناسب ہے جناب!'' میری آواز دھڑک رہی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''کوئی ایسی بات تو نہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''صبح ہم اور معائنے کریں گے۔ خون کے علاوہ اور کئی ٹیسٹ، ایکس رے بھی لیں گے۔ ضرورت پڑی تو دوسرے ڈاکٹروں کو بھی مشورے کے لیے بلایا جاسکتا ہے۔''

''خدا کے لیے کچھ کیجیے ڈاکٹر صاحب!'' میں نے عاجزی کی۔ ''جو بھی، جس طرح کا علاج ہو، بالکل فکر مت کیجیے۔''

''مجھے بتا دیا گیا ہے کہ تمہارے پاس بہت سونا چاندی ہے۔''

''یہ میں نے روپے پیسے کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ علاج میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔'' میں نے معذرت کی۔ ''اس کا مطلب کچھ اور نہیں تھا، اور پیسا پھر کس لیے ہوتا ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' وہ مسکرانے لگا۔ ''پیسا بھی کام آتا ہے مگر ہر موقع پر نہیں۔''

''بس آپ مہربانی کیجیے جناب!''

''ہم اپنی کوشش کریں گے، ہم یہاں اسی لیے ہیں۔''

''مجھے احساس ہے، میں نے آپ کو ناوقت زحمت دی پھر وہی پیسے کا ذکر آجائے گا لیکن وقت کا کوئی تو مول ہوتا ہے۔ آپ کچھ خیال مت کیجیے۔''

''بعد کو دیکھیں گے۔'' ڈاکٹر رائے آنکھیں چڑھا کے بولا۔ ''تم بھی کمرے میں جا کے آرام کرو، ادھر دوسرا بستر بھی ہے اور حوصلہ رکھو۔ تم سے اب صبح بات ہوگی۔ شب بخیر۔'' اس نے میری طرف سے مڑ کے ڈاکٹر گوکھلے کو سرگوشیانہ لہجے میں کچھ ہدایات دیں اور سیدھا دروازے کی جانب چل پڑا۔

آدھ گھنٹے کے اندر ایک کھلے ہوئے، صاف ستھرے، ہوادار اور آراستہ و پیراستہ کمرے میں وہ ہمیں لے آئے۔ ڈاکٹر گوکھلے کے ساتھ دو نوجوان ڈاکٹر بھی آئے تھے۔ انہوں نے بٹھل کو ایک اور سوئی لگائی اور مختلف قسم کی دوائیں دیں۔ بڑی عمر کی ایک فربہ اندام، چاق و چوبند نرس ان کی مدد کرتی رہی۔ کمرے میں کھڑکی کے پاس صوفہ لگا ہوا تھا، کرسیاں بھی تھیں اور مریض سے متعلق ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

''قریب ہی ادھر دریا ہے۔'' اپنے کام سے نمٹ کے ڈاکٹر گوکھلے میرے شانے پر ہاتھ رکھے مجھے صوفے پر لے آیا اور پوچھنے لگا۔ ''کہیے، کیسا ہے یہ کمرا؟''

میں نے لجاجت سے کہا۔ ''آپ کی بڑی مہربانی۔''

''مہربانی میری نہیں، ڈاکٹر رائے کی ہے۔'' وہ مجھے کمرے کے اوصاف تفصیل سے گنوانے لگا کہ اردگرد کے خاص الخاص لوگوں کے لیے یہ کمرے

مخصوص ہیں۔ گورے مریضوں کو بھی یہیں ٹھیرایا جاتا ہے۔ یہ خالی رہتے ہیں تو بھی ان کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں کے لیے لازم ہے کہ ان کمروں میں زیرعلاج مریضوں پر خصوصی توجہ دیں۔ یہاں ماہر نرسوں کا تقرر کیا جاتا ہے۔ دریا رخ ہونے کی وجہ سے یہاں بڑی نرم ولطیف ہوا آتی ہے وغیرہ۔ اسے تعجب تھا کہ ڈاکٹر رائے سے تو میری پہلی ملاقات تھی۔ میں نے کیا جادو کردیا کہ اس نے از خود اس کمرے میں ہمیں قیام کی اجازت دے دی ورنہ وہ تو بہت محتاط ہے۔ ڈاکٹر گوکھلے کو لفظ تلاش کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ غالباً وہ یہ کہنا اور جتانا چاہتا تھا کہ مریضوں کا حسب نسب، ان کے زور واثر سے مطمئن ہونے کے بعد ہی انہیں یہاں علاج کے اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔

میں چپ چاپ سنتا رہا۔ کہنے والے کو کچھ تو احساس ہونا چاہیے کہ سننے والا کتنا سن رہا ہے یا کتنا متوجہ ہے۔ بے موقع کلام بھی یاوہ گوئی ہے اور یاوہ گوئی ایک عارضہ ہے اور یہ عارضہ بہت عام ہے۔ لوگ ہر خبر کا حساب رکھتے ہیں۔ یہ حساب کوئی نہیں لگاتا کہ زندگی کا کتنا وقت بے موقع اور غیرضروری باتوں میں گزر جاتا ہے۔ مجھے ڈاکٹر گوکھلے کی باتوں سے چڑ ہورہی تھی۔ میں بٹھل کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا۔ اسے بستر پہ بے سدھ پڑا دیکھ کے میرا دل ڈوبا جارہا تھا، جسم کی جان جیسے کھنچی جاتی ہو۔ مجھے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں ڈاکٹر گوکھلے کا منہ کس طرح بند کرسکتا تھا۔ میری بے توجہی سے وہ ناراض بھی ہوسکتا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ وہ اگر ساتھ نہ دیتا تو اس وقت ڈاکٹر رائے کی آمد قطعی ناممکن تھی۔ شاید وہ میری توجہ بٹانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کررہا تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سننے والے کی آمادگی کے بغیر شیریں سخنی بھی فضول گوئی ہے۔ اس نے پھر پائپ سلگالیا۔ لگتا تھا، اسے کوئی کام نہیں ہے۔ میں ہوں ہاں کرتا رہا۔ میری آنکھیں تو بٹھل کے بستر پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ اس نے بار بار پائپ سلگایا اور جب پائپ کا تمباکو راکھ ہوگیا تو اسے کچھ بے چینی ہوئی۔ مزید تمباکو نوشی کے لیے وہ جیبوں میں پاؤچ ٹٹول رہا تھا اسے خیال آیا کہ وہ تو پچھلے کمرے میں چھوڑ آیا ہے مجھے بہت تسلی دلاسے دے کے کہیں وہ رخصت ہوا اور میں نے دانستہ بٹھل کے بارے میں اس کا قیاس جاننے سے اجتناب کیا کہ اس کے منہ سے بے سوچے سمجھے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔ میں نے اسے کمرے کے باہر تک رخصت کیا۔

اس وقت ایک بج رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی نرس نے آکے کمرے کی روشنی دھیمی کردی۔ بٹھل بالکل غافل تھا۔ اس کی سانسوں کا تواتر معمول کے مطابق تھا۔ باقی رات میں تین بار نرس آئی اور دو مرتبہ ڈاکٹر نے چکر لگایا۔ انہیں میرے جاگتے رہنے سے کیا پریشانی تھی جو ہر بار آکے وہ مجھے اس طرح سمجھاتے تھے جیسے میں کوئی پاگل ہوں یا بچہ ہوں۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے نرم گفتار نرس نے بٹھل کا معائنہ کرکے مجھ سے مشفقانہ لہجے میں کچھ دیر کمر ٹکالینے کو کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کرسی سے اٹھادیا۔ پھر مجھ سے منع نہ کیا جاسکا۔

میں بستر پہ آکے لیٹ گیا اور اس وقت مجھے محسوس ہوا، میرا سارا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ اپنا آپا ہی مجھ سے نہیں سنبھل رہا۔ میں نے جان کے آنکھیں بند نہیں کیں کہ کہیں کسی لمحے بٹھل کو میری ضرورت نہ پڑجائے۔

صبح آٹھ بجے سے منہ ہاتھ دھوکے اور کپڑوں کی شکنیں درست کرکے میں تیار بیٹھا تھا۔ نرس نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر رائے وقت کا بڑا پابند ہے۔ ٹھیک آٹھ بجے اسپتال آجاتا ہے۔ میرے کپڑے خاصے میلے ہوگئے تھے لیکن سامان ہوٹل میں رکھا ہوا تھا اور وہاں جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

فربہ اندام نرس رات کی ڈیوٹی سے فارغ ہونے سے پہلے میرے لیے ہلکا ناشتا خود لائی تھی اور سامنے بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے توس پر مکھن لگا کے مجھے پیش کیا تو مجھے زہر مار کرنا پڑا۔ وہ کم بولتی تھی اور اس کے انداز میں ایسا شفقت آمیز تحکم تھا کہ انکار آسان نہیں تھا۔ میں نے چند گھونٹوں میں چائے بھی ختم کرلی۔ نرس کا نام ـــ ایملی ڈینیل تھا۔ یہ نام اس نے خود بتایا اور مجھے شرمسار کیا۔ رات سے وہ متعدد بار کمرے میں آچکی تھی اور میں نے نہ اپنا تعارف کرایا نہ اس کا نام پوچھا تھا۔ اس نے بٹھل کی دیکھ بھال میں مستعد رہنے کے لیے مجھے اپنی حالت درست کرنے کی نصیحت کی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، اپنے آپ کو باندھے رکھے بغیر میں مریض، (بٹھل) کے کس کام آسکتا ہوں۔ وہ مجھ سے اس طرح پیش آرہی تھی جیسے ایک زمانے سے واقف ہو یا جیسے بٹھل کے بجائے میں بیمار ہوں۔ گھر کے کپڑے پہن کے وہ مجھے وداعی سلام کرنے آئی اور بٹھل اور میرے لیے چند رسمی دعائیہ جملے کہہ کر رخصت ہوگئی۔ پھر دروازے سے وہ پلٹی اور کہنے لگی کہ اس کی جگہ دن بھر کے لیے اب نرس سیورین کی ڈیوٹی ہے۔ اس نے سیورین کو تاکید کردی ہے کہ وہ اس کمرے کا خاص خیال رکھے۔ کوئی بھی کام ہو، بے جھجک اس سے کہا جاسکتا ہے۔ وہ ایک معاون لڑکی ہے۔

نرس ایمی کو گئے ابھی چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ گندمی رنگت، تیکھے نقش ونگار، متناسب قد کی دبلی پتلی ایک نوعمر نرس لپکتی جھپکتی کمرے میں آئی اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی بڑی آنکھیں تھیں۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں 'صبح بخیر' کہا اور مشاقی سے بٹھل کے بستر کی شکنیں درست کرنے اور چیزیں ترتیب سے رکھنے لگی۔ صوفے کے ساتھ والی کھڑکی کا پردہ بھی اس نے کھول دیا۔ کمرا روشن ہوگیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر رائے اب آیا ہی چاہتے ہیں۔ میں ہڑبڑا کے کرسی سے اٹھ گیا۔ سیورین نے وہ کرسی بھی دیوار کے ساتھ لگادی اور جس تیزی سے آئی تھی، اسی تیزی سے واپس چلی گئی۔

میں کمرے میں دبے قدموں ٹہلتا رہا۔ ٹھیک نو بجے ڈاکٹر رائے دو اور ڈاکٹروں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ان کے پیچھے نرس سیورین بھی تھی اور اسپتال کے مخصوص لباس میں ایک اور شخص تھی۔ ڈاکٹر رائے نے مجھے سرسری دیکھا، سر کی جنبش سے سلام کا جواب دیتا ہوا وہ بٹھل کے پاس جاکے ٹھیر گیا اور ان سب نے بٹھل کا بستر گھیر لیا۔ پائینتی پر لٹکی ہوئی رپورٹ دیکھ کے ڈاکٹر رائے نے بٹھل کا شانہ ہلایا۔ اس نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹر نے حال پوچھنا چاہا۔ بٹھل دیدے گھما کے رہ گیا۔ اس پر غنودگی کا شدید غلبہ تھا۔ ڈاکٹر رائے کے اشارے پر ایک ڈاکٹر نے بٹھل کی کلائی سے خون کھینچنے کے لیے سوئی پیوست کردی اور حاصل کیا ہوا خون شیشی میں منتقل کردیا۔ اس نے خون کی پھر ایک اور شیشی بھری۔ میں ان کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ڈاکٹر رائے کو اپنے درمیان میری موجودی سے جانے کیا خلل پڑرہا تھا کہ اس نے مجھے دور صوفے پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ میں نے مجبوراً تعمیل کی۔ وہ سارے بٹھل کے گرد جمع رہے۔ میں اپنے آپ کو جکڑے ہوئے دور بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ میں نے ان کی سرگوشیاں سننے کی کوشش کی لیکن کچھ پلے نہیں پڑا۔ مجھے تو چکر آرہے تھے۔

کچھ دیر میں ڈاکٹر رائے میری طرف آگیا اور مجھ سے گزشتہ رات بٹھل کی کیفیت کے متعلق پوچھنے لگا۔ میری آواز ڈول رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ساری رات وہ بے خبر رہا ہے۔ دو ایک بار مجھے اس کی کراہ کا گمان ہوا اور میں نے اٹھ کے اس سے پوچھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھا کیا۔ اس کی آنکھیں سکڑتی اور پھیلتی رہیں او

وہ کچھ کہے بغیر نیند میں ڈوب گیا۔
ڈاکٹر رائے سوچتا رہا، پھر اکڑی ہوئی آواز میں بولا۔ ’’ہم اسے ایکس رے کے لیے لے جائیں گے۔ وہاں کچھ اور ٹیسٹ بھی لیں گے۔‘‘
’’آپ کیا سمجھتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟‘‘ میں نے ناتوانی سے پوچھا۔
’’ٹیسٹ کے نتائج کے بعد ہی یقین سے کچھ کہا جاسکتا ہے اور ان کی رپورٹ آنے میں دو دن لگ سکتے ہیں۔‘‘
’’ان رپورٹوں میں جلدی نہیں ہوسکتی؟‘‘
’’بعض کے نتائج فوراً سامنے آجائیں گے لیکن تمام میں دیر ہوسکتی ہے۔‘‘ اس کے لہجے میں ذرا سی لچک نہیں تھی۔
’’میں اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے خود پر جبر کیا۔
’’دو دن میں صورتحال واضح ہوجائے گی۔‘‘ مجھے گم ہم دیکھ کے وہ کہنے لگا۔ ’’تمہیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے اور یہ یقین بھی کہ تم ایک بہتر جگہ پر ہو۔‘‘
’’ڈاکٹر صاحب!‘‘ میں نے ہمت جمع کرکے کہا۔ ’’یہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ باقی چیزیں تو ثانوی ہیں، جان سے زیادہ......‘‘
ڈاکٹر نے میری بات قطع کردی۔ ’’ہم اپنی کوشش کررہے ہیں، اپنے امکان بھر۔‘‘
’’لیکن میں اپنے امکان سے سوا جاسکتا ہوں اور میرے امکانات محدود نہیں ہیں۔‘‘
’’لیکن مرحلے اپنی جگہ ہیں اور ان کے لیے برداشت چاہیے، کسی اور چیز سے زیادہ......‘‘ ڈاکٹر رائے کے لہجے کی تلخی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔
’’ڈاکٹر صاحب! مجھے معلوم نہیں، آپ سے یہ کہنا مناسب ہے یا نہیں مگر ازراہِ کرم، اس سے بہتر کوئی صورت، کوئی اور جگہ ہو تو مجھے بتائیے۔ اس شہر میں یا کہیں اور کلکتہ، بمبئی، دلی...... میں کہیں بھی جاسکتا ہوں، ہندوستان سے باہر بھی۔‘‘
’’اب اس کا وقت نہیں ہے۔ اس سے بہتر جگہیں یقیناً بے شمار ہیں لیکن مریض کی حالت فی الحال ادھر سے ادھر منتقل کرنے کی نہیں۔‘‘ وہ کسی قدر بے اعتنائی سے بولا۔ ’’بہر حال، تم جو چاہو فیصلہ کرسکتے ہو۔ ذمے داری، ظاہر ہے، تمہاری ہوگی۔‘‘
’’میرا مطلب غلط نہ سمجھئے۔ میرا مقصود مریض سے اپنے تعلق کا اظہار ہے۔ میری جان، میں جانتا ہوں، کسی کام کی نہیں لیکن ثانوی چیزیں اہمیت رکھتی ہیں اور بہت سے لوگ تو انہیں جان سے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ میرے لیے میرا مریض ہر چیز سے زیادہ اہم ہے۔ آپ بڑے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کے مشوروں کے بغیر میں کوئی فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا بلکہ اس وقت تو مجھ میں کسی نتیجے تک پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میرا حال سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں آپ کے آگے......‘‘
’’دیکھو نوجوان! اب ہم پر چھوڑ دو، جہاں جاؤ گے، یہی کچھ ہوگا۔ انہی مرحلوں سے گزر کے کوئی رائے قائم کی جائے گی۔ ایلوپیتھی طب کا اپنا ایک منظم طریق کار ہے۔‘‘
میں چپ ہوگیا۔ اتنی دیر میں بٹھل کا بستر گھیرے ہوئے ڈاکٹر رائے کے ماتحت اس کے پاس سے ہٹ چکے تھے۔ ڈاکٹر رائے نے میرا بازو پکڑ کے مجھے حوصلے اور اعتماد کی تلقین کی اور کمرے سے چلا گیا۔
باہر اسے رخصت کرکے نرس سیورین کمرے میں واپس آگئی اور اس نے مجھے بٹھل کی جیبوں میں رکھی ہوئی چیزیں تحویل میں لینے کی تاکید کی۔ بٹھل کو ایکس رے کے لیے لے جانے سے قبل انہیں اسے اسپتال کا رسمی لباس پہنانا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ویسے ہی پھول رہے تھے۔ میں یہ کہنے والا تھا کہ نرس یہ کام خود کرے لیکن معاً مجھے

خیال آیا کہ بٹھل کی جیب میں چاقو بھی ہوگا۔ اسے کرتے کے نیچے بنیان کی جگہ ہلکی بنڈی پہننے کی عادت ہے۔ ہوسکتا ہے، کوئی اور ہتھیار بھی اس کے پاس ہو۔ سیورین کو جلدی تھی مگر وہ سامنے کھڑی تھی۔ جیبوں سے برآمد ہونے والی ہر چیز اس کی نظر میں آسکتی تھی۔ اس کی عدم موجودگی ہی میں مجھے جامہ تلاشی کا یہ اذیت ناک فریضہ انجام دینا چاہیے تھا۔ میں نے ناوقت سہی مگر چائے کی خواہش ظاہر کی تو وہ فوراً کمرے سے چلی گئی۔ بٹھل کے بستر پہ پہنچ کے اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے میں نے اسے آہستہ سے پکارا۔ اس کے پپوٹوں میں کلبلاہٹ ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے بے ربطی سے اسے بتایا کہ مجھے اس کی جیبیں خالی کرنی ہیں۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار ہویدا ہوئے۔ معلوم نہیں، اس نے کچھ سمجھا کہ نہیں۔ سیورین کسی لمحے واپس آسکتی ہے۔ میں نے جلدی جلدی باہر سے کپڑے ٹٹول کے پہلے چاقو نکالنا چاہا۔ چاقو کرتے کی جیب ہی میں تھا۔ میں نے اسے واسکٹ کی جیب میں محفوظ کیا اور گریبان کے بٹن کھول کے بنڈی دیکھیں۔ بنڈی کی دونوں جیبوں میں نوٹوں کی دو گڈیاں تھیں۔ کوئی اور ہتھیار کسی جیب میں نہیں تھا۔ کپڑوں میں اور جیبیں بھی تھیں لیکن مختلف مالیات کے نوٹوں کے علاوہ مجھے کچھ اور نہیں ملا۔ کرتے کی جیب میں چاقو کے ساتھ چند سکے بھی پڑے ہوئے تھے۔ سیورین کو باہر گئے منٹ دو منٹ ہوئے ہوں گے کہ واپس آگئی اور اس نے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی واسکٹ نکال کے مجھے دی۔ اپنی بدحواسی میں مجھے اس واسکٹ کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ رات کس وقت نرس ایمی یا کسی اور نے یہ واسکٹ اتاری تھی۔ حالاں کہ میں تو رات بھر جاگتا ہی رہا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ اس سے پہلے والے کمرے میں ڈاکٹروں نے بٹھل کے جسم کا معائنہ کرتے ہوئے واسکٹ کے دونوں بٹ کھول دیے تھے۔ اسپتال سے رخصت ہوتے ہوئے شاید، ایمی مجھے واسکٹ کے بارے میں بتانا بھول گئی۔
سیورین سے واسکٹ لے کے میں صوفے پر آگیا۔ اس کی مختلف جیبوں میں بھی سوٹ کیس کی چابیوں کے علاوہ خاصے پیسے تھے۔ سینے کے حصے کی اندرونی جیبیں اندرونی بٹن سے بند تھیں۔ دائیں طرف کی جیب کا بٹن کھولنے پر میری انگلی میں ریشمی ڈوری آگئی۔ ڈوری کا ایک حصہ بٹن سے لپٹا ہوا تھا، اسے کھینچنے پر دوسرے حصے سے ملحق پان کے بٹوے کی شکل کی مختصر سی عنابی مخملی تھیلیا برآمد ہوئی۔ تھیلیا کے سکڑے ہوئے منہ پر ڈوری سے گرہ لگی ہوئی تھی اور آسانی سے نہیں کھل سکتی تھی۔ اس احتیاط سے ظاہر تھا کہ اندر کوئی قیمتی چیز موجود ہے۔ وہ ہیرے ہی ہوسکتے تھے۔ ٹٹولنے سے کچھ یہی اندازہ ہوتا تھا۔ تھیلیا میں روئی بھری تھی۔ روئی کی تہوں میں ہیرے چھپے ہوں گے جو انگلیوں پر ان کی سطح کی سختی محسوس نہیں ہوتی تھی اور نہ تھیلیا گر جانے پر ہیروں کے ٹوٹنے کا امکان رہا تھا۔ بٹن سے لپٹی ڈوری گھمانے پر تھیلیا آزاد ہوگئی۔ میں نے اسے اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔
نرس سیورین کے پیچھے پیچھے اسپتال کے دو کارکن بھی کمرے میں آگئے تھے۔ سیورین نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں نے جیبوں کی اچھی طرح تلاشی لے لی ہے۔ نسبتاً بلند آواز کی وجہ یہی ہوسکتی تھی کہ میرے اقرار کے دو آدمی گواہ رہیں۔ دونوں کارکنوں نے اسپتال کا لباس پہنانے کے لیے بٹھل کے جسم پر لمبی چادر ڈال دی۔ نرس سیورین باہر چلی گئی۔ مجھ سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ سیورین کے پیچھے میں بھی باہر نکل آیا۔ کارکن، بٹھل کا پہیوں والا پلنگ باہر لے آئے تو میں نے بھی ان کی پیروی کی...... ان کی رفتار معتدل تھی لیکن میری ٹانگیں ان کا ساتھ نہیں دے پارہی تھیں۔ وہ زیادہ

دور نہیں گئے اسپتال کی خاص عمارت میں داخلے کے دروازے کے قریب ہی ان کی منزل تھی۔ انہوں نے مجھے دروازے پر روک دیا۔ میں نے ان سے حجت کی کہ یہ آپریشن کا کمرا تو نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ایکس رے کے کمرے میں بھی مریض کے لیے حاضر باش شخص کا داخلہ ممنوع ہے۔ ناچار مجھے باہر ہی رہنا پڑا۔ بٹھل کو اندر لے جاکے انہوں نے دروازہ بھی بند کرلیا۔

اسپتال میں مریضوں اور ان کے متعلقین کی تعداد اس وقت اچھی خاصی تھی۔ مجھ سے ٹھیک طرح اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ وہیں دیوار کے پاس لگی ہوئی کرسیوں میں ایک کرسی خالی ہوئی تو میں نے جلدی سے اس پر قبضہ کرلیا۔ کچھ دیر کے لیے میں آنکھیں بند کرلینا چاہتا تھا لیکن مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں تھا۔ دماغ میں جالے پڑے ہوئے تھے مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ میں اور کیا کرسکتا ہوں؟ میری استطاعات میں اور کیا ہے؟ مجھ سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی؟ جانے ڈاکٹر کیا فیصلہ صادر کرے۔ اب سب کچھ اسی پر ہے۔ ہم دونوں اسی کے شکنجے میں ہیں۔ اگر اس نے زیادہ دن رکنے کو کہا تو میں اکیلا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ یہی بہتر ہے کہ مجھے کسی کو بلا لینا چاہیے۔ ابا جان کو تار دوں یا جامو کو مطلع کروں یا زریں کو بلا لوں۔ جیسے ہی تار ملے گا، وہ پہلی گاڑی سے آجائے گی۔ بٹھل کی صحیح نگہ داشت وہی کرسکتی ہے۔ اس کے آنے سے مجھے بھی آسرا ہو جائے گا۔ اس میں وہ برداشت اور حوصلہ ہے، ڈاکٹر رائے جس کی تعلیم مجھے دے رہا تھا۔ بٹھل بھی زریں کو پاس دیکھ کے بہت مطمئن ہوگا۔ اچھے تیماردار بھی علاج میں کارگر ہوتے ہیں۔ میرا تو کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں یوں بھی ایک ناکارہ آدمی ہوں۔ ایسے وقت میرے حواس تو منتشر ہو جاتے ہیں۔ مجھے کچھ دکھائی سمجھائی نہیں دیتا۔ میں اکیلا کوئی بھی غلط قدم اٹھا سکتا ہوں۔

آدھ گھنٹا گزرا یا اس سے زیادہ۔ ایکس ر کے کمرے کا دروازہ کھلنے کے انتظار میں مے آنکھیں پتھرانے لگی تھیں، دروازہ کھلا تو چند قدمو کا فاصلہ میں نے بھاگ کے طے کیا۔ ابھی وہ با نہیں نکلے تھے کہ میں نے اکھڑی ہوئی سانسوں پوچھا۔ "کیا ہے، سب ٹھیک تو ہے نا؟"

اسپتال کا کارندہ مسکرانے لگا اور ہمدردانہ میں بولا۔ "ابھی کیا بولیں بھیا صاحب! دھیر رکھو۔ پہلے رپورٹ بنے گا پھر ڈاکٹر دیکھے گا۔ و ٹھیک سے بتائے گا۔" اس نے مجھے سامنے ہٹ جانے کو کہا۔

وہ بٹھل کو واپس کمرے میں لے گئے اور پہ والی جگہ پر لوہے کا پلنگ ٹھیرا کے وہ جانے لگے تو مے نے جیب سے چند نوٹ نکال کے ان کی نذر کر چاہیے۔ وہ تو ایسے گھبرائے جیسے میرے ہاتھ میں نوٹ نہ ہوں، بچھو ہوں — دونوں نے انک کردیا۔ میرے اصرار پر کہنے لگے، ہاں جب مریض صحت مند ہو کے یہاں سے رخصت ہ مٹھائی کھلانا مت بھولیے گا۔

بٹھل کے جسم پر چادر ڈھکی ہوئی تھی اور چہرہ کھ ہوا تھا۔ جانے انہوں نے کون سی دوا دی تھی کہ ا اب تک بے خود پڑا ہوا تھا۔ میں کرسی کھینچ کے ا کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اتنے میں سیورین آگئی۔ ا کچھ فراغت میں نظر آتی تھی۔ میرے قریب ہی بیٹ گئی اور شستگی سے بولی۔ "سسٹر ایمی بتا رہی تھی آپ رات بھر ایک پل کے لیے نہیں سو پائے ہیں بہتر ہوگا، اب آپ آرام کرلیں۔ میں یہاں موجو ہوں۔ ڈاکٹر رائے نے میری ڈیوٹی صرف ا کمرے تک محدود کردی ہے۔"

"آپ کی کچھ بات ہوئی ڈاکٹر صاحب سے؟" میں نے اضطراری آواز میں پوچھا۔ "ک کہتے تھے؟"

"انہوں نے مسلسل مریض پر نگاہ رکھنے کی ہدایت کی ہے۔"

"آپ، آپ کیا سمجھتی ہیں؟"

"میں صرف ایک نرس ہوں۔" وہ انکسار سے بولی۔

"ہاں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "مگر آپ کا تجربہ بھی ہوگا۔"

"میرا کیا تجربہ۔" وہ شرما سی گئی اور کہنے لگی۔ "ڈاکٹر رائے مریض کے معالج ہیں۔ وہ ایک تجربہ کار اور باکمال ڈاکٹر ہیں۔ دور دور سے بیمار انہیں دکھانے آتے ہیں۔"

"مگر انہوں نے......" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔ "آپ کو انہوں نے مستقلاً یہاں معین کیا ہے تو کوئی، کوئی بات تو ضرور......" میری آواز گلے میں رندھ گئی۔

"نہیں نہیں، ایسا مت سوچیے۔" اس نے بہ شدت تردید کی۔ "ان کمروں میں مستقل طور پر نرسیں مقرر کردی جاتی ہیں اگر مریض اور اس کے پرسان حال درخواست کریں۔ کیا آپ نے ڈاکٹر رائے سے خصوصی نگہ داری کی درخواست کی تھی؟"

"جی، جی ہاں۔" مجھے اس کی صراحت سے طمانیت ہوئی۔ "میں نے کئی بار ان سے یہ التجا کی ہے۔"

سیورین کے چہرے سے بھی تکدر دور وا۔ "آپ کہاں سے آئے ہیں۔" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"فیض آباد سے۔" میں نے مختصراً اسے اکبر ر کے اسٹیشن کے حادثے کے بارے میں بتایا۔

"یہ آپ کے کون ہیں؟"

مجھے اس سوال کی توقع تھی۔ میں نے کسی توقف ے بغیر کہا۔ "یہ میرے بھائی ہیں۔" اس کے رے پر چمک سی پیدا ہوئی۔ "اور، اور آپ ان ے بہت قریب ہیں۔" وہ پلکیں جھپکا کے بولی۔

میری آنکھیں جلنے لگیں اور میں نے بہ مشکل اپنے آنسو ضبط کیے۔

"بھائیوں میں ایسی یگانگت دیکھ کے خوشی ہوتی ہے۔ میری دعا ہے، خدا آپ کے بھائی کو جلد صحت یاب کرے۔" اس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔

نرس ایمی صحیح کہہ رہی تھی۔ سیورین ایک شایستہ، شگفتہ اور غم گسار لڑکی تھی۔ وہ نرس تو معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ خوش صورتی پہ خوش سیرتی متزاد خوبی ہے۔ اس کی انگریزی گوئی میں نفاست، سلاست اور روانی تھی۔ دھیمی آواز میں کلام کرنے کے باوجود آواز کھنکتی تھی، کہنے لگی۔ "آپ کو تنہائی کی ضرورت ہے تو میں کمرے کے باہر سائبان میں بیٹھ جاتی ہوں۔ آپ یہاں آرام کیجیے۔"

”مجھے نیند نہیں آرہی۔“ میں نے پژمردگی سے کہا۔

”ڈاکٹر رائے ٹھیک ڈیڑھ بجے گھر جاتے ہیں۔ ایک بجے کے قریب شاید وہ یہاں آجائیں۔ پھر شام کو پانچ سے سات تک اسپتال میں رہتے ہیں۔ ابھی ساڑھے دس ہورہے ہیں۔ ایک بجنے میں پورے ڈھائی گھنٹے ہیں۔ اس دوران گھنٹے دو گھنٹے کے لیے آپ آرام کرلیں تو مناسب ہوگا۔“

”پہلے تو مجھے یہ لباس تبدیل کرنا چاہیے۔“ میں نے شش و پنج سے کہا۔ ”مجھے کچھ تار بھی دینے ہیں۔“

”آپ کہاں ٹھیرے ہیں؟“

میں نے اسے بتایا کہ گزشتہ رات اسٹیشن سے ہم گرانڈ ہوٹل میں کمرا محفوظ کرانے گئے تھے۔ سامان رکھ کے فوراً یہاں آگئے۔ پھر ہوٹل واپس جانا ممکن نہ ہوسکا۔ ہوٹل والے بھی کیا کہتے ہوں گے۔

”گرانڈ ہوٹل ایسا دور نہیں ہے۔“ اس نے لپکتی آواز میں کہا۔ ”ڈاکٹر رائے کے آنے تک آپ واپس آسکتے ہیں۔ مجھ پر بھروسا کیجیے۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے لیکن......“ میں کہنا چاہتا تھا کہ میرا دل نہیں چاہتا۔

”لیکن کیا......؟“ وہ تجسس سے بولی۔

مجھ سے جواب نہ دیا جاسکا۔

”شاید آپ کا دل نہیں مانتا لیکن آپ اتنی دیر میں اپنا کچھ کام بھی کرلیں گے۔ آپ کے ذہن پر کم از کم یہ بار نہیں رہے گا۔ میں یہاں ہوں۔“ اس نے کسی حد تک التجا انداز میں مشورہ دیا۔

”میں کتنی دیر میں واپس آسکتا ہوں؟“

”ڈیڑھ دو گھنٹے میں آپ اطمینان سے واپس آسکتے ہیں۔ اسپتال کے باہر آپ کو سواری مل جائے گی۔ اسے ساتھ ہی رکھیے۔“

بٹھل کے سرہانے جاکے میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کی غفلت جاری تھی۔ کچھ دیر اس کش مکش میں گزر گئی۔ مجھے جانا چاہیے یا نہیں۔ سیورین کے چہرے پر چھایا ہوا ثبات دیکھ کے میں نے عزم کرلیا۔ لاؤنج عبور کرکے میں چند قدم ہی گیا ہوں گا کہ سیورین کی آواز آئی۔ اس نے کاغذ کا ایک بڑا تھیلا میرے حوالے کیا۔ میں نے کھول کے دیکھا، اس میں اتارے ہوئے بٹھل کے کپڑے رکھے تھے۔۔ اسپتال کے باہر ہی مجھے تانگا مل گیا۔ دن پوری طرح جاگ چکا تھا۔ سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی۔ تانگے کی رفتار بھیڑ کی وجہ سے متاثر ہورہی تھی۔ کئی بار جی میں آئی کہ واپس چلوں لیکن تانگا ہوٹل کا فاصلہ کم کرتا رہا اور جلد ہی ہوٹل پہنچا دیا۔ رات کا عملہ بدل چکا تھا۔ میں نے کمرے کی چابی طلب کی تو کاؤنٹر پر کھڑے خوش پوش، خوش اطوار نوجوان نے متجسس نظروں سے مجھے دیکھا اور خیریت پوچھی۔ میں نے اسے سرسری بتایا کہ میرے ساتھی کی طبیعت خراب ہوجانے کی وجہ سے سامان ہوٹل میں رکھ کے ہمیں اسپتال جانا پڑا۔ رات وہیں گزری ہے۔ اس نے تاسف کا اظہار کیا اور پوچھا کہ اب ساتھی کا کیا حال ہے؟ میں نے بتایا کہ انہیں اسپتال میں روک لیا گیا ہے۔ جب تک ڈاکٹر اجازت نہ دے، ہم وہیں رہیں گے۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے اور میں صرف لباس تبدیل کرنے آیا ہوں۔ وہ فکر مند ہونے لگا کہ یہ ہوٹل خاصا مہنگا ہے۔ اس طرح تو مجھ پر بے جا مصارف کا بوجھ ہوگا۔ میں نے کہا کہ اسپتال میں کوئی شناسا نہیں ہے۔ اب جو بھی ہو۔ وہ ایک شریف النفس نوجوان تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود مجھے ہوٹل کے پختہ کار لیکن چست و مستعد منیجر کے پاس لے گیا اور اسے ساری روداد سنائی۔ منیجر بھی خاصا معقول آدمی تھا۔ پہلے کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے پیش کش کی کہ مجھے کوئی عار نہ ہو تو ایک دو روز کے لیے وہ میرا سامان محفوظ کرنے کا بندوبست کرسکتا ہے۔ جب

بھی ضرورت پڑے، میں ہوٹل آکے اپنا سامان کھول سکتا ہوں۔ اسپتال میں خدا نہ کرے، زیادہ دن ٹھیرنے کی صورت میں کسی اور تدبیر پر غور کریں گے۔ میں اس کے شہر اور اس کے ہوٹل میں مہمان ہوں اور مجھ پر اچانک یہ افتاد آپڑی ہے۔ سو وہ اپنی بساط بھر مجھ سے یہی سلوک کرسکتا ہے۔ استعمال کیے بغیر کمرے کا گراں کرایہ ادا کرنا کہاں تک درست ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ میرے جواب سے وہ جزبز بھی ہوا، متعجب بھی۔ میں نے کہا کہ میرے لیے یہ زیادہ تسلی کی بات ہوگی کہ میں کمرا اپنے پاس ہی رکھوں۔ ڈاکٹر بھی مرض کی نوعیت جاننے کی کوشش کررہے ہیں۔ دو ایک دن میں ساری صورت حال واضح ہوجائے گی۔ منیجر مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگا۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے اسپتال پہنچنے کی جلدی ہے۔ میری عدم موجودگی میں کہیں ڈاکٹر نہ آجائے۔ وہ خاموش ہوگیا اور اس نے کرسی سے اٹھ کے مجھے رخصت کیا۔ بٹھل کی صحت یابی کے لیے دعا کی اور کہا کہ ہوٹل کے علاوہ بھی کوئی کام ہو تو میں بے تکلف اس سے کہہ سکتا ہوں۔ میں نے گزارش کی کہ میں اپنے اعزا کو تار بھیج رہا ہوں اور ہوٹل کا پتا دے رہا ہوں۔ میری بات پوری ہونے سے پہلے اس نے پرتپاک انداز میں یقین دلایا کہ جیسے ہی میرا کوئی خط یا تار موصول ہوا، وہ کسی تاخیر کے بغیر اسپتال پہنچادے گا۔

کمرے میں سامان اسی جگہ رکھا ہوا تھا جہاں رات میں نے چھوڑا تھا۔ بیگ کھولنے پر توشہ دان نظر آیا۔ کھانا اب تو خراب ہوچکا ہوگا۔ خدمت گار کو بلا کے میں نے توشہ دان اس کے سپرد کیا کہ اسے خالی کرکے واپس کمرے میں رکھ دے۔ دس روپے کی بخشش پر اس نے جھک کر سلام کیا اور کوئی اور خدمت بجالانے کے لیے بے قرار ہوگیا۔ وہ چلا گیا تو ایک بیگ خالی کرکے میں نے اس میں بٹھل کا سیفٹی ریزر، صابن، برش، پھٹکری کی ڈلی، منجن، کنگھی، آئینہ، رومال اور اپنا بھی کچھ یہی سامان اور اپنا اور بٹھل کا ایک ایک جوڑا رکھا۔ ہوٹل میں کپڑوں کی دھلائی اور استری کا اہتمام تھا لیکن استری میں دیر لگتی۔ کپڑوں پر ایسی شکنیں بھی نہیں پڑی ہوئی تھیں۔ اسپتال میں مریض کے ساتھ رہنے والے کے لیے بھی کمبل موجود تھا۔ میں نے اپنا کھیس بھی رکھ لیا اور حفظ ماتقدم کے طور پر بمبئی کے بینک میں جمع کرشنا جی کی عطیہ رقم کی چیک بک بھی بیگ میں ڈال دی۔ منہ ہاتھ دھو کے کپڑے بدلنے کا ارادہ تھا۔ غسل خانے میں آکے چپ چپاہٹ کا احساس ہوا۔ نہانا کیا، بس جسم بھگویا اور خشک کرلیا اور خاصی تازہ دمی محسوس ہوئی۔ میلے کپڑوں کی جیبیں خالی کرتے ہوئے اپنی واسکٹ کی نچلی جیب میں چرمی بٹوا دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔ بٹوا بہت نرم و نفیس تراش خراش کا اور بالکل نیا تھا اور نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ سفر میں کئی بار جیب بھاری بھاری لگی تھی لیکن اس یقین سے میں نے ایسی توجہ نہیں دی تھی کہ زریں کے سوا کون ہوسکتا ہے۔ وہ اسی طرح چونکاتی اور اپنی قدر و منزلت فزوں کرتی ہے، اسی نے کوئی چیز رکھی ہوگی، کسی جگہ ٹھیرنے پہ اطمینان سے دیکھوں گا۔ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ یہ نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوا ہوسکتا ہے۔ میری واسکٹ میں، بٹھل کی واسکٹ سے نکالی ہوئی نوٹوں کی دو گڈیاں بھی تھیں، انہیں سوٹ کیس میں محفوظ نہیں کیا جاسکتا تھا اور اتنی رقم مستقل ساتھ رکھنی بھی حماقت معلوم ہوتی تھی۔ ہیروں کی تھیلیا... کا تو کوئی وزن ہی نہیں تھا۔ عجلت کے خیال سے نہ میں نے اس کی گرہ کھولی نہ اپنے پاس موجود رقم گننے اور مالیت کا اندازہ لگانے میں وقت ضائع کیا جس طرح ہیروں کی مخملی تھیلیا اور زر و پے پرانی واسکٹ کی جیبوں میں رکھے ہوئے تھے، اسی ترتیب سے نئی واسکٹ کی جیبوں میں رکھ لیے۔ بٹھل کا چاقو اس

کے سوٹ کیس کے خفیہ خانے میں چھپایا۔ اسپتال میں اپنا چاقو ساتھ رکھنا غیر ضروری لگتا تھا لیکن میں اسے سوٹ کیس میں رکھتے رکھتے رہ گیا اور کسی نا معلوم اندیشے میں، کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔ گھنٹی بجانے پر خدمت گار پھر حاضر ہوگیا۔ میلے کپڑے اس کے حوالے کرکے تیز قدموں سے میں نے کاؤنٹر کا رخ کیا۔ کاؤنٹر کے وسط میں نصب گھڑی میں ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ گویا مجھے ہوٹل میں آئے قریباً آدھ گھنٹا ہی گزرا تھا۔

کاؤنٹر پر تعینات نوجوان نے خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ ہوٹل سے نکلتے نکلتے مجھے خیال آیا، کیوں نہ نوٹوں کی گڈیاں منیجر کے پاس جمع کردوں۔ وہ ذمے دار شخص معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو بعد میں دیکھ لیں گے۔ واپس کاؤنٹر پر آکے میں نے نوجوان سے مشورہ کیا۔ وہ مجھے دوبارہ منیجر کے پاس لے گیا۔ بیس ہزار روپے کی رقم دیکھ کے منیجر مخمصے میں پڑ گیا۔ میرے اصرار پر پس و پیش کے بعد آمادہ ہوا اور خزانچی کو طلب کرکے رقم امانتہً محفوظ کرنے کا حکم دیا۔ وہ تازہ نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ خزانچی نے دو بار نوٹ گنے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس کام میں پندرہ بیس منٹ صرف ہوجائیں گے۔ خزانچی بہت محتاط تھا۔ رسید لکھتے وقت بھی اس نے بڑی دیدہ ریزی کی۔ فیض آباد کا پورا پتا لکھا اور میرا وقت گنوایا۔

باہر تانگے والا میرا منتظر تھا۔ سیورین نے کمرے میں ڈاکٹر کی آمد کا وقت ایک بجے بتایا تھا۔ ابھی سوا گھنٹا باقی تھا۔ تانگے والے نے مجھے کچھ فاصلے پر واقع ڈاک خانے پہنچا دیا۔ یہاں سے تار بھی دیے جاسکتے تھے۔ ڈاک خانے میں اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ تار فارم حاصل کرکے پہلے میں نے ابا جان، جامو اور زریں کو بٹھل کی بیماری کا حال لکھا۔ ابا جان کو تار لکھتے ہوئے مجھے کیلاش یاد آیا۔ وہ بھی تو ڈاکٹر ہے بلکہ اس کی بہن رما بھی ڈاکٹر ہے۔ گو ڈاکٹری کرتی نہیں ہے مگر کیلاش تو باقاعدہ اسپتال میں ہے۔ میں اسے کیوں نہ یہاں بلالوں۔ میرا تار ملتے ہی چل پڑے گا۔ بمبئی بہت دور ہے لیکن وہ چاہے تو ڈیڑھ دو دن میں یہاں پہنچ سکتا ہے۔ اس کے آجانے سے مجھے بڑی آسانی ہوجائے گی۔ پھر میں نے تینوں تار فارم تلف کردیے۔ بیماری کی اطلاع سن کے سبھی پریشان ہوجائیں گے۔ جب تک ڈاکٹر رائے کسی نتیجے تک نہ پہنچے، مجھے تحمل کرنا چاہیے۔ جامو تو فوراً کلکتے سے نکل کھڑا ہوگا اور جانے اس کے ساتھ اڈے کا کون کون آدمی آجائے۔ تار پہنچنے کے بعد بات چھپی نہیں رہے گی۔ کوئی کتنا ہی انہیں روکے، کلکتے میں بٹھل کے بہت فدائی ہیں، وہ نہیں رکیں گے۔ اسپتال میں ان کی آمد سے ہڑبونگ مچ سکتی ہے۔ ادھر فیض آباد میں زریں کا بھی یہی حال ہوگا۔ وہ بھی وہاں نہیں ٹھیرے گی اور ابا جان کتنے ہی اپنے آسودگی کے معاملات میں گھرے ہوں، بٹھل کا سن کے ذرا بھی دیر نہیں لگائیں گے........ لونا

بھی بٹھل سے پوچھے بغیر کسی کو بھی اس کی حالت کے بارے میں کچھ نہیں لکھنا چاہیے لیکن جامو کو پٹنے میں اپنی موجودی کا تار دینا ضروری تھا۔ بٹھل، فیض آباد میں پولیس افسر ورما کو مطمئن کرکے آیا تھا کہ وہ جہاں بھی ہوگا، پولیس کی طلبی پر ایک دو دن میں فیض آباد پہنچ جائے گا اور یہ اس صورت میں ممکن تھا کہ جامو کو سفر میں ہمارے ٹھکانوں سے آگہی ہوتی رہے۔ پولیس نے ہمیں فیض آباد سے نکلنے دیا تھا اور کوئی شرط بھی عاید نہیں کی تھی لیکن ان کے اطوار سے ظاہر تھا کہ ان کے دل ہماری طرف سے صاف نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے، فیض آباد سے ہمارے چلے جانے کے بعد وہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ ہمارے رابطے کہاں کہاں ہیں۔ فیض آباد اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ایک شخص ہماری نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں،

وہ ہمارے ساتھ گاڑی میں بھی سوار ہوا تھا یا نہیں یا انہوں نے کسی اور شخص کو ہمارے تعاقب کی ذمے داری سونپی تھی۔ اکبر پور اسٹیشن پر نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ہمیں نگاہ میں رکھنے والا بھی بہت متاثر ہونے والوں میں شامل ہوسکتا ہے۔ میں نے پھر صرف دو مختصر فارم بھرے، ایک جامو کے نام، دوسرا زریں کے۔ دونوں کا مضمون ایک تھا کہ ہم پٹنے کے گرانڈ ہوٹل میں مقیم ہیں اور تا اطلاع ثانی یہیں رہیں گے۔

تار کی کھڑکی پر قطار لگی ہوئی تھی۔ تار کا مطلب ہے، جلد سے جلد اطلاع کی ترسیل۔ ہر ایک کو جلدی تھی اور مجھے ان سب سے زیادہ، کھڑکی کے پار کوئی سست رو شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک لفظ بار بار گن کے حساب لگاتا، پھر پیسے وصول کرتا تھا۔ اسپتال واپسی کا وقت تنگ ہوتا جارہا تھا۔ میں نے تار دیے بغیر واپسی کا قصد کرلیا تھا کہ سوچا، پوسٹ ماسٹر سے بات کرکے دیکھوں۔ شاید کوئی بھلا آدمی ہو۔ اس کے کمرے میں داخل ہوکے میں نے اپنی عجلت اور اس کی وجہ مختصراً بیان کی۔ میں نے کہا کہ میں تار فارم اور مطلوبہ رقم اس کے پاس چھوڑے جاتا ہوں۔ وہ ایک اجنبی سے اتنی مہربانی کرے کہ میرے یہ تار روانہ کروادے۔ میں نے دس روپے کا نوٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑگئیں لیکن اس دوران اس نے تار کا مضمون پڑھ لیا تھا۔ ہوٹل کا نام دیکھ کے اس کی آنکھیں چوڑی ہوئیں۔ اس نے سر اٹھا کے مجھے گھور کے دیکھا اور بولا۔ ”مگر یہ پیسے تو زیادہ ہیں۔“ میں نے کہا کہ دونوں تار ارجنٹ کردیے جائیں۔ میں کل پرسوں آکے رسید اور باقی پیسے لے جاؤں گا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

ابھی میں ڈاک خانے کی عمارت میں تھا کہ گیروے رنگ کے کرتے اور سفید پاجامے میں ملبوس ایک نوجوان نے پیچھے سے ”بابو صاحب“ کہہ کے آواز دی۔ میں نے ٹھیر کے اور پلٹ کے دیکھا۔ وہ لپک کے میرے سامنے آگیا اور اس نے ایک تار فارم میری طرف بڑھا دیا اور عاجزی سے بولا۔ ”اپنا ابھی ایک تار بھر دیو بابو صاحب، ہمری ماتا جی......“ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ میں اپنی معذوری کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ پہلو سے ایک دوسرا، اسی قماش کا ایک اور نوجوان تار فارم ہاتھ میں لہراتے ہوئے آموجود ہوا۔ اس کا لہجہ پہلے والے نوجوان سے لجاجت آمیز تھا۔ وہ تو تقریباً مجھ سے چمٹ گیا تھا اور پہلے والے نوجوان سے سبقت لے جانے پر تلا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کے پہلے والے نے میرا بازو پکڑ لیا۔ دونوں اس طرح منتیں کرنے لگے جیسے بھیک مانگ رہے ہوں۔ وہ مجھے کوئی عذر پیش کرنے، یہاں تک کہ فارم بھرنے کی مہلت بھی نہیں دے رہے تھے۔ میں ابھی کچھ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ فارم بھروانے کے لیے اتنی منت سماجت کی کیا ضرورت ہے، ڈاک خانے میں اور بہت سے پڑھے لکھے لوگ موجود ہوں گے۔ یکایک مجھے اپنے دائیں طرف، ٹانگ میں چبھن محسوس ہوئی۔ دوسرے لمحے میں اچھل پڑا۔ دوسرا نوجوان چابک دستی سے میری جیب سے کچھ نکالنے میں کام یاب ہوگیا تھا۔ وہ تو جیب میں اس کے ہاتھ ڈالنے پر تہہ میں پڑے ہوئے چاقو کی حرکت کی وجہ سے مجھے احساس ہوگیا ورنہ خبر بھی نہ ہوتی۔ میرا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتا کہ ادھر پہلے والے نوجوان کی عاجزی میں شدت آگئی۔ کچھ اس کی داد فریاد اور بازو جکڑنے کے سبب سے میری توجہ منتشر ہوئی، کچھ میری حواس باختگی۔ اس اثنا میں دوسرے نوجوان نے عمارت کے دروازے کی طرف تقریباً جست لگائی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہوئی ہے۔ اب سب کچھ ذہن میں صاف ہوگیا تھا۔ پہلے والے نوجوان کو دھکا دے

کہ میں نے خود سے دور کیا اور دروازے کی جانب دوڑ لگائی۔ دوسرا عمارت سے نکل کے دائیں طرف مڑ گیا تھا۔ میں نے پوری قوت سے اس کا پیچھا کیا۔ کاش میں اس پر لعنت بھیج کے تعاقب چھوڑ دیتا۔ وہ بے تحاشا بھاگتا ہوا پہلی گلی میں مڑ گیا اور اس سے پہلے کہ میں اس کے سر پر پہنچوں، اسے جیب سے چاقو نکالنے اور چشم زدن میں کھولنے کا موقع مل گیا۔

میرا دماغ الٹ گیا تھا میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے فی الفور وہاں سے واپس ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کی بھپکی سے خون کھولنے لگا۔ میں نے بھی پھر اپنی رفتار سست کی اور ٹھہر گیا۔ وہ چاقو گھماتا رہا۔ آہستہ قدموں سے میں نے اس کے قریب ہونا شروع کیا۔ مجھے نہتا اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے اسے ہراساں نہیں تو متوحش ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ اچکا تھا، ایک نظر میں اس کا تخمینہ ہو گیا تھا کہ چاقو سے اس کی نسبت کس قدر ہے اور وہ کتنی دیر ٹکنے والا ہے۔ بتدریج اپنی جانب میری پیش قدمی سے غیر ارادی طور پر وہ پیچھے ہٹا۔ گلی میں اتنی گنجائش نہیں تھی۔ یقیناً اپنے پاس چاقو کی موجودی سے برتری کا کوئی احساس اس پر غالب ہوا۔ وہ بھپکیاں دیتا ہوا میری طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا، وہ چاقو مارنے کے بجائے مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے ایک قدم بڑھ کے فاصلہ اور کم کیا۔ چاقو والا ہاتھ بڑھانے میں اس کا تامل وتردد لازم تھا۔ میں اس کے خاصا قریب ہو چکا تھا اور اسے میرے دماغی توازن پر شبہ ہونا چاہیے تھا۔ ایسی صورت میں، احتیاط کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے پھر چاقو بڑھایا۔ میں تیزی سے دائیں پہلو ہوا پھر بائیں۔ تین چار بار اس عمل کی تکرار سے اسے متذبذب کرنا مقصود تھا۔ وہ کبھی اس طرف ہاتھ بڑھاتا کبھی اس طرف۔ میں نے اسے مزید آزمائش سے دو چار نہیں کیا، ایک بار مجھے دائیں طرف ہوتا دیکھ کے اس نے اسی جانب ہاتھ بڑھایا تھا کہ میں یک دم بیٹھ گیا اور اسی لمحے اٹھا تو اس کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی میرے پنجے میں تھی۔ یہ حربہ میں نے پہلے بھی کسی جگہ اختیار کیا تھا اور نتیجہ اچھا ہی نکلا تھا۔ ساتھ ہی میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ پر ضرب لگائی۔ وہ بہت زور سے چیخا اور بلبلانے لگا۔ چاقو اس کی انگلیوں کی گرفت میں قائم نہ رہ سکا۔ اسے پھر میں نے سنبھلنے کی فرصت نہیں دی۔ اس کی گردن اور پسلیوں پر پے در پے ضربیں لگائیں۔ وہ دہرا ہو گیا اور ادھ موا ہو کے پیٹ پکڑے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وہ اب مزاحمت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے آسانی سے اس کے کرتے کی جیب سے اپنا بٹوا نکال لیا۔ میری جیب میں کھلے روپے بھی تھے وہ بھی میرے ہاتھ میں آ گئے۔ میرا وزنی چاقو جیب کی تہہ میں پڑا ہوا تھا اس لیے انگلیاں چاقو تک نہ پہنچ سکیں اور اسے میری جیب میں چاقو ہونے کا گمان بھی نہ ہو گا۔

اس سے نمٹنے میں چند منٹ ہی لگے ہوں گے۔ تین چار زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔ اس دوران ان گلی میں کئی راہ گیر جمع ہو چکے تھے۔ جیب کترے کی چیخوں اور کراہوں سے آمنے سامنے کے مکانات کے دروازوں کی آڑ اور کھڑکیوں سے عورتیں اور بچے بھی جھانکنے لگے تھے اور شور گونجنے لگا تھا۔ کوئی راہ گیر قریب نہیں آیا۔ انہوں نے درمیان میں پڑا چاقو دیکھ لیا تھا۔

میں نے شکستہ حال نوجوان کا چاقو زمین سے نہیں اٹھایا۔ اس سے نمٹنے میں گو ساری توجہ مرکوز رہی تھی لیکن میں اس کے دوسرے ساتھی سے بھی غافل نہیں رہا تھا۔ ڈاک خانے میں تار فارم پر کرانے کے لیے مجھ سے التجا کرنے والا پہلا شخص یقیناً اسی کا ساتھی تھا۔ جیب کترے عموماً تنہا نہیں ہوتے، یہی ہوا۔ میں جلد سے جلد گلی سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ابھی میں مڑے تڑے ہوئے نوجوان کو ٹھوکر مار کے پلٹا ہی تھا کہ ڈاک خانے کی سڑک

سے دو آدمی دیوانہ وار گلی میں نمودار ہوئے۔ دونوں نہتے تھے۔ گلی میں داخل ہوتے ہی انہوں نے مجھے آتے دیکھا تو ٹھٹک کے رک گئے۔ راہ گیر اور تماشائی، گھن گھناتا شور اور کچھ فاصلے پر اپنے ساتھی کے حال سے سارا ماجرا انہیں سمجھ جانا چاہیے تھا۔ سامنے کھلا چاقو بھی پڑا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک ساتھ جیبوں میں ہاتھ ڈال کے چاقو نکال لیے اور زقند لگاتے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ میں ایک کی توقع کر رہا تھا۔ وہ دو تھے۔ ان کی آمد میں اتنی دیر کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی تھی۔ یا تو انہیں اپنے ساتھی کے فرار کی سمت کا علم نہیں تھا یا پھر تیسرے ساتھی کو اطلاع دینے اور اسے ساتھ لانے میں کچھ وقت صرف ہوا۔ میرے لیے مفر کی ایک ہی صورت تھی کہ سڑک پر جانے کے بجائے میں گلی میں مخالف سمت بھاگنے لگوں مگر آگے گلی کے طول عرض کا بھی مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ مجھے اب وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے تو اسپتال پہنچنا ہے، وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور وہ مجھے اس طرح جانے نہیں دیں گے۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں ان سے بات کرنے کی ایک کوشش کروں۔ وہ مان جائیں تو ٹھیک ہے۔ میں بٹوا ان کے حوالے کر دوں گا یا پھر ان سے مڈبھیڑ۔ انہوں نے مجھے زچ ہو جانے کا موقع نہیں دیا۔ وہ چاقو لہراتے، چیخ پکار کرتے ہوئے میری طرف بڑھ چکے تھے۔ ان میں ایک تیس سال کے قریب تھا، دوسرے کی عمر بیس بائیس سال ہو گی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے ڈاک خانے میں مجھے پہلے روکا تھا۔

میں اپنی جگہ ٹھہر گیا اور میں نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور بلند آواز سے کہا ”ٹھہرو، ٹھہرو، میری بات سنو۔“ میری صدا کا ان پر کچھ اثر ہوا۔ وہ ٹھہر گئے تو میں نے مفاہمانہ لہجے میں کہا۔ ”میری بات دھیان سے سن لو۔ میں دہراؤں گا نہیں۔ میں تمہارے شہر میں اجنبی ہوں میرا ایک عزیز اسپتال میں ہے۔ مجھے جلد اس کے پاس پہنچنا ہے۔ تم لوگوں سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تمہارے ساتھی نے مجھ سے زیادتی کی تھی اسی لیے مجھے اس کے پیچھے بھاگنا پڑا، اس نے چاقو نکال لیا۔ مجھے اسے بتانا پڑا کہ سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہتھیار ایسے ہی ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں تمہیں بھی دیکھ لیتا لیکن میں نے تم سے کہا ہے، میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اپنی مجبوری کی وجہ سے وہ بٹوا میں تمہارے حوالے کر دوں گا جو تمہارے ساتھی نے میری جیب سے نکالا تھا۔ تم لوگ میرے راستے سے ہٹ جاؤ، کچھ غلط مت سمجھنا۔ تم ایک ساتھی کو دیکھ رہے ہو۔ چاقو کا کھیل اچھا نہیں ہوتا۔ کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہو گی۔ تمہیں پیسا چاہیے۔ وہ میں تمہیں دیے دیتا ہوں۔ مجھے فوراً جواب دو۔“

”یوہ! ای کا بڑبڑ کرت ہے۔“ جواب میں زیادہ عمر کے آدمی نے اپنے ساتھی کو دیکھتے ہوئے نخوت سے کہا۔ اس نے چاقو ہوا میں اچھالا اور مہارت سے اسے اچک لیا۔ بٹوا نکالنے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا کہ وہ تیزی سے میری طرف جھپٹا۔ میں بٹوا نکال چکا تھا لیکن اس کے تیور اچھے نہیں تھے۔ بشرے ہی سے وہ ایک شورہ پشت آدمی دکھائی دیتا تھا۔ چہرے کی جلد کھردری، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، تنگ پیشانی، تیل میں چمکتے بال اور بیچ میں مانگ نکلی ہوئی، دانتوں پر پانوں کی تہہ، ناک، ہونٹ اور دائیں طرف کے گال پر چاقو کے نشانات، دبا ہوا قد، گٹھا ہوا جثہ، لکیر والی مونچھ۔ اپنا ہاتھ کھلا رکھنے کے لیے مجھے بٹوا دوبارہ جیب میں ڈالنا پڑا۔ دونوں مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کے رک گئے اور ہاتھ پھیلائے، جسم مٹکاتے تھرکاتے ہوئے وار کرنے کا تاثر دیتے رہے۔ ”ہم کا، کا سمجھے ہو ببوا! ہم، تم کا بھیک منگا دکھائی پڑت ہے؟“ زیادہ عمر

والے نے دھتکارنے والے انداز میں کہا۔

میرے منہ پہ آیا، کہوں کے چوری سے اچھی بھیک ہوتی ہے۔ میں خاموش رہا۔ حجت میں وقت اور ضائع ہوتا۔ بڑے کی چاقو پر دست رس معلوم ہوتی تھی، چھوٹا نوآموز نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنی آواز دھیمی رکھی۔ ”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“

”تم ہمرا منئی (آدمی) پہ کاہے ہاتھ اٹھائے؟ اس کو مارن ہو، ہاں!“ وہ گرج کے بولا۔

”اور اس نے کچھ نہیں کیا؟“ اس کی ڈھٹائی پر میرا سر چٹخنے لگا۔

”یہی ٹھورا اپنے میدا استاد راج کرت ہیں۔ دوسر کا کونوں حکم ناہی چے۔ ہم، تم کا بتائے دے کہ جونوں سر میدا استاد کا آدمی پہ ہاتھ اٹھائے تو سمجھو، وہ اس دھرتی پہ ناہی رہے۔“

”دیکھو استاد!“ میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ایسا ہے تو میں پھر آ جاؤں گا۔ تم سے وعدہ ہے۔ مجھے اس وقت جانے دو۔ میں تمہارے میدا استاد کے پاس بھی آ جاؤں گا۔ مجھ سے اس وقت مت الجھو تم سمجھتے کیوں نہیں۔“

”ہم سارا بجھت ہیں۔ تم کا الو کا پٹھا دکھائی پڑت ہیں ہم؟ تم کا ایسا نہیں چھوڑ دہیں۔ ابھئی سبک پڑھائے دیت ہیں۔“ میری خاموشی پر وہ زہریلی آواز میں بولا۔ ”تم کا چپ کاہے لگی ہے؟“

”تم مجھے آدمی نہیں لگتے۔“ میں نے شگفتگی سے کہا۔ اس کے چہرے پر کئی نقش تھے۔ جی میں آتا تھا، زندگی بھر یاد رہ جانے والا کوئی نقش میں بھی ثبت کر دوں۔ آئینے کی طرف کبھی منہ نہ کر پائے۔

”ابھی تم سول آنا ٹھیک سمجھت ہو۔ ہم اپنا میدا استاد کا نمبر ایک پالتو ہے۔ سمجھا کہ نئیں۔ اس کا پٹا اپنی گردن میں ہے۔“ وہ جو منہ میں آیا، بکتا رہا۔ کوئی بات کہہ کے وہ ارد گرد کھڑے تماش بینوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا یا جیسے انہیں کچھ جتانا چاہتا ہو۔ لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن اب ان پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میری ہر استدعا بے اثر رہے گی۔ ان سے ایسے چھٹکارا نہیں ملے گا لیکن مجھے پہل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری خاموشی نے بڑی عمر والے کا اضطراب اور مہمیز کیا۔ اس نے اپنے کم عمر ساتھی کو کوئی اشارہ کیا اور کچکچاتی آواز میں بولا۔ ”ابھئی تم کا گلا پکڑائے کے استاد کا دربار میں لیے چلت ہیں۔ اس کے آگے ماتھا رگڑنا اور دکشنا بھی دینا۔“

دونوں نے ہاتھ پھیلائے دو قدم بڑھ کے فاصلہ اور کم کیا۔

میں نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ وہ مجھ سے اور قریب ہو گئے۔ بڑی عمر والا چاقو کبھی اس ہاتھ سے لیتا کبھی اس ہاتھ میں۔ مخالف پر اپنی ہنرمندی کی دھاک بٹھانے کے لیے یہ ایک عام اور موثر شیوۂ اظہار ہے۔ اصل میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک چاقو پھینکنے میں ہاتھوں کے درمیان فاصلے اور پھرتی پر بہت کچھ منحصر ہے، کتنا فاصلہ اور کیسی پھرتی۔ پھرتی سے مراد تکرار کی تیزی و تیز رفتاری ہے۔ بعض مشاق کا ایک ہاتھ چاقو پھینکتا ہے تو دوسرا ہاتھ بے اختیار اسی سمت اٹھتا ہے اور نگاہ کا اس عمل میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ہاتھ مشین بن جاتے ہیں مگر صرف یہی ہنرمندی نہیں۔ یہ کوئی داؤ نہیں، ایک طرف کی بازی گری ہے۔ چاقو پر گرفت ایک خوبی ہے، دوسری خوبی چاقو اور نگاہ، چاقو اور دماغ، چاقو اور بل کا تال میل یا توازن ہے۔ موقع محل کے اعتبار سے مہارت آزمائی جاتی ہے۔ ضرورت پر مرحلہ در مرحلہ۔ پہلے ہی مرحلے پر اپنے جوہر عیاں نہیں کر دیے جاتے۔ بٹھل تو نیت کی بھی بات کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے، نیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے اور کہتا ہے، چاقو تبھی اٹھانا چاہیے جب ذہن صاف، آلودہ نہ ہو، کوئی مقصد ہو، بے مقصدی نہ ہو اور تب جب کوئی چارہ نہ ہو۔

میری جانب سے کوئی مزاحمت نہ دیکھ کے بڑی

عمر والے کا بگڑا ہوا چہرہ اور بگڑ گیا۔ اپنے آیندہ اقدام کے بارے میں اسے کش مکش سے دوچار ہو جانا چاہیے تھا۔ میں اسے بت کی طرح دیکھتا رہا۔ اس کا ساتھی اس سے ڈیڑھ گز کی دوری پر ترچھا کھڑا تھا، پر تولے ہوئے۔ زیادہ عمر کا آدمی ایک قدم اور بڑھ آیا۔ میرا خیال تھا، وہ میری جیبوں میں ہاتھ ڈال سکتا ہے لیکن وہ سیانا آدمی تھا۔ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے اپنا خالی ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ ہمارے درمیان اب گز بھر کی دوری رہ گئی تھی۔ اس نے میری ٹھوڑی پکڑی، پہلے آہستہ، پھر پنجہ ٹھوڑی پر کس دیا اور ناخن گڑو دیے اور چاقو بردار ہاتھ اٹھا کے چاقو کی دھار میری ناک پر پھیری، پھر کان پر اور گالوں پر۔ میں نے اپنا جسم منجمد کیے رکھا۔ مجھ پر لمحہ لمحہ پہاڑ کی طرح گراں تھا۔ اس نے چاقو والا ہاتھ دور کر کے میرے منہ پر زور سے مکا مارا...... دوسرا، پھر تیسرا......

میں نے سوچا، اس میں کہیں چھپی ہوئی غیرت وحمیت اجاگر کرنے کی ایک کوشش کیوں نہ کروں۔ اس سے کہوں کہ وہ دو ہیں۔ دونوں کے ہاتھ میں چاقو ہیں۔ ایسے میں، میں کیا اپنا دفاع کر سکتا ہوں۔ بہت ممکن ہے، لوگ ارد گرد موجود ہیں، وہ کسی خمار یا غرّے میں آ جائے اور ہو سکتا ہے، اپنے ساتھی کو پیچھے ہٹا کے اس کا چاقو بھی میرے حوالے کر دے۔ یہ تدبیر طوالت انگیز ہو سکتی تھی۔ ان دونوں پر اعتماد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کا تعلق اڈے سے واجبی معلوم ہوتا تھا۔ چاقو تو ہر کوئی چلانا سیکھ لیتا ہے مگر چاقو بازوں کے اپنے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔ کم عمر نوجوان سے تو کچھ بعید نہیں تھا کہ اس جلد باز کے سر میں کس وقت کیا سما جائے اور میرے اس مطالبے میں دعوے کا پہلو نکلتا تھا۔ میرے بارے میں ان کا لاعلم رہنا ہی بہتر تھا حالاں کہ ان کا ایک ساتھی ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکا تھا اس کی خستہ حالی میری شد بد کی شہادت تھی۔

کسی شعبدہ کاری ہی سے جلد نجات ممکن تھی۔ بہر حال میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ فیصلہ کرنے کے بعد عواقب و نتائج پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔ بڑی عمر والے کے مکے کی چوتھی ضرب بھی میں نے برداشت کر لی۔ میں بے حس و حرکت رہا۔ پھر جیسے ہی اس نے پانچویں مکے کے لیے ہاتھ اٹھایا، اس کی ضرب سے بچنے کے لیے میں مخالف سمت کسی قدر جھکتا ہوا مڑ گیا۔ چار مرتبہ کے تجربے کے بعد اسے یقین ہو گا کہ میں اسی طرح ساکت کھڑا رہوں گا۔ جھک کے مڑتے ہوئے میں نے چیخ جیسی صدا بلند کی اور اچھل پڑا۔ یہ غیر متوقع چیخ اسے مزید منتشر کرنے کے لیے تھی۔ وہ ہاتھ اٹھا چکا تھا اور اس کی ساری توجہ پانچویں ضرب لگانے پر مرکوز تھی۔ آناً فاناً بیک وقت میرے جھکنے، مڑنے، اچھلنے اور چیخ مارنے پر لازماً اپنا اٹھا ہوا ہاتھ پیچھے ہٹانے نہ ہٹانے میں اسے تذبذب و تردد ہونا چاہیے تھا۔ مجھے ضرب کی پروا نہیں تھی کہ یہ چہرے کے بجائے جسم کے کسی حصے پر لگتی ہے۔ اس کا چاقو والا ہاتھ بھی شعوری، غیر شعوری طور پہ متحرک ہوا۔ میں نے بھی کچھ طے کر کے اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔

مڑ جانے سے اس کا چاقو والا ہاتھ پوری طرح میری نظروں اور میرے وجود کی نظروں میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا اور میری ذرا سی چوک سے کہیں بھی پیوست ہو سکتا تھا۔ ادھر سے اضطراب کے عالم میں اس کا چاقو والا ہاتھ مجھے نشانہ لینے کے لیے قریب ہوا، ادھر میرے دونوں ہاتھ اسے روکنے کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ اس صورت میں اسے خود کو سنبھالنے یا سانس استوار کر کے کچھ سمجھنے کے لیے چاقو والا ہاتھ اضطراری طور پر پیچھے بھی کرنا چاہیے تھا۔ اس پر یہ ہیجان طاری نہ ہوتا تو بھی میں تو اپنے ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ پلک جھپکنے کی مدت میں میرے دونوں پنجوں کی گرفت

میں اس کی کلائی تھی۔ مجھے اب فوراً دوبارہ اچھل کے اور ذرا سی ڈھیل دے کے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دینا تھا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ میرے اچھلنے اور جھٹکا دے کے جسم کا سارا وزن، سارا زور ڈالنے سے بازو اکھڑ جانا چاہیے تھا۔

یہی ہوا۔ اس کی کرب ناک چیخ دور تک گونجی ہوگی۔ چاقو پھر اس کے ہاتھ میں برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ پیر پٹخنے لگا۔ میں اسے مزید بے قابو کرنے کے لیے کسی تاخیر کے بغیر ضربیں لگانا چاہتا تھا کہ میں نے دیکھا، اس کا کم عمر ساتھی چاقو سیدھا کیے میری طرف بڑھ چکا ہے۔ وہ گھوم کے میری پشت پر وار کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس یہی راستہ تھا کہ جیسے تیسے میں اس کے پختہ کار ساتھی سے دست بردار ہو کے اب اس سے بچنے کی راہ ڈھونڈوں۔ اس پر ٹوٹ پڑنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میرے پاس سنبھلنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ نوجوان اپنی جھونک میں تیزی سے بڑھ چکا تھا۔ گو مجھے اس کے ساتھی کو چند ایک آزمودہ ضربوں سے بے حال کر کے اس کی طرف ہی پلٹنا یا اس کی دیوار بھی ہٹانا تھی۔ ظاہر ہے، وہ ہاتھ پیر پسارے تماشا تو نہیں دیکھتا رہتا۔ اپنے ساتھی کو محفوظ کرنے کے لیے کوئی طور تو اسے اختیار کرنا تھا اور جواب میں مجھے یہی کرنا تھا کہ اس کے ساتھی کو ڈھال بنائے رکھوں اور اس کی پس پائی تک مسلسل ضربیں لگاتا ہوں۔ نوجوان نے بڑی جلدی کی۔ اسے ابھی ہتھیار ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے تھا۔ بٹھل کے بہ قول، گھوڑے کی طرح نو مشقوں سے ہتھیار بدکتا رہتا ہے۔ میں نے خود کو اور اپنے قبضے میں آئے اس کے ساتھی کو سامنے سے ہٹانے کی پوری کوشش کی تھی۔ نوجوان چاقو بردار خود کو تھام نہ سکا۔ وہ اندھا دھند پاگلوں کی طرح اپنی جگہ سے انڈا تھا۔ اس کا چاقو اپنے ساتھی کی پسلی میں پیوست ہوا۔ پسلی کی رعایت بھی اس سبب سے ممکن ہوئی کہ میں اسے نشانے سے ہٹانے میں کس حد تک کامیاب رہا تھا ورنہ چاقو اس کے پیٹ میں کھب جاتا۔

راہ گیروں اور دروازوں، کھڑکیوں پر کھڑی عورتیں اور بچوں کی سسکاریاں نکل گئیں۔ نوجوان اس ناگہانی، نادیدنی سے ہکا بکا رہ گیا۔ میں اسے سکتے کی اس لمحاتی کیفیت سے دو چار چھوڑ کے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اور دیوانہ ہو سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اسی حالت میں اس کے بال پکڑ کے اسے کئی ضربیں لگائی۔ وہ خود بھی بے خبر ہو جانا چاہتا ہوگا۔ ایسے صدمے میں، آدمی کو اپنے حواس کھو دینے، خود سے بے نیاز ہو جانے کی ایک طلب ہوتی ہے۔ اس نے کوئی مدافعت نہیں کی جیسے سزا کے طور پر یہ ضربیں کھا رہا ہو۔ پھر وہ چکرا کے زمین پر گر گیا۔

میں نے اپنے کپڑے جھاڑے اور ایک نظر لوگوں کی طرف دیکھا۔ کوئی بھی میرے قریب نہیں پھٹکا بلکہ انہوں نے نظریں جھکا لیں۔ بھاگنا بے محل تھا۔ تیز قدموں سے میں نے سڑک کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ دفعتہً شور اٹھا۔ میں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ راہ گیر زخمی نوجوان کو اس حالت میں کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ خون نے اسے سرخ کر دیا ہوگا۔ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا۔ تعاقب کرتا تو آہٹ ضرور ہوتی۔ گلی سے نکل کے میں ڈاک خانے والی چوڑی سڑک پر آ گیا۔ کوچوان تانگا لیے ڈاک خانے کی عمارت کے پہلو میں بدحواس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھنے لگا کہ خیریت تو ہے۔ میں ڈاک خانے سے اس آدمی کے پیچھے کیوں بھاگا تھا۔ کہنے لگا کہ تانگے میں میرا بیگ رکھا ہوا تھا۔ وہ تانگا چھوڑ کے گلی میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں اسے کیا کچھ بتاتا۔ میرا تو سر چیخ رہا تھا۔ میں نے اس سے جلد سے جلد اسپتال پہنچنے کی درخواست کی۔ جیسے ہی میں تانگے پر سوار ہوا، گلی سے چند آدمی بھاگتے ہوئے سڑک پر آتے دکھائی دیے۔ سڑک پہ

آ کے انہوں نے خود کو روکا اور بولائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کسی کو تانگا نظر آ گیا۔ اسی شخص نے میری جانب سب کو متوجہ کیا۔ کوچوان نے تانگا چلا دیا تھا۔ کوئی بھی تانگے کے پیچھے نہیں بھاگا۔ میں دیکھتا رہا۔ وہ انگلیاں اٹھا کے ایک دوسرے کو میری طرف اشارے کر رہے تھے۔ آگے کچھ فاصلے پر سڑک گھوم گئی اس لیے وہ سارے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

سڑک پر اب بھیڑ زیادہ ہو گئی تھی۔ دھوپ میں بھی خاصی تیزی تھی۔ کچھ ایسا وقت نہیں گزرا تھا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ اوپر ہوئے ہوں گے۔ گھڑی یوں وقت کا مستند پیمانہ ہے لیکن کس پر کب کیسا وقت گزرتا ہے، اس کا شمار کون کرے۔ وقت سب پر یکساں نہیں گزرتا سو ہر ایک کے لیے پیمانے بھی جدا ہونے چاہئیں۔ اسپتال دور تھا اور بھیڑ کی وجہ سے تانگے کی رفتار متاثر ہو رہی تھی۔ اگر وہ تینوں واقعی اڈے سے متعلق آدمی تھے تو اڈے کے دیگر آدمیوں کو کسی وقت بھی خبر ہو سکتی تھی۔ بری خبر بے طرح پھیلتی ہے۔ لوگوں کو اس کی جستجو بھی بہت ہوتی ہے۔ میں نے اسپتال کا ذکر کیا تھا۔ یہ ان کا شہر ہے۔ میری تلاش میں اڈے کے آدمی شہر کا کوئی اسپتال نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے اپنے سر سے تمام اندیشے جھٹکنے چاہے۔ بعد کی بات بعد کی ہے۔ اس وقت تو مجھے کسی طرح اسپتال پہنچنا چاہیے۔ مجھی سے غلطی ہوئی۔ اس نرس سیورین کے کہنے پر اتنے کم وقت میں مجھے ہوٹل کا رخ ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نہ جانے بٹھل کا کیا حال ہو گا؟ ڈاکٹر رائے کمرے میں نہ آ گیا ہو۔ مجھے وہاں نہ دیکھ کے کیا سوچے گا؟''

یہی بہتر نظر آتا تھا کہ تانگے سے اتر کر سڑک پہ بھاگنا شروع کر دوں۔ اس طرح تانگے سے جلدی اسپتال پہنچ سکتا ہوں مگر لوگ ایک آدمی کو بھاگتا دیکھ کے پاگل ہی سمجھیں گے۔ سڑک پر بہت سے سائیکل سوار تھے۔ کاش کوئی سائیکل ہی مل جاتی۔ بھیڑ میں سائیکل گزارنے کی جگہ جلد مل جاتی ہے۔ کیوں نہ تانگے سے اتر کے کسی سائیکل سوار سے التجا کروں کہ وہ مجھے کیرئیر پہ بٹھا کے اسپتال پہنچا دے یا کسی موٹر والے کو روکوں۔ پوں پوں کرتی اکا دکا موٹریں بھی گزر رہی تھیں۔ شاید کوئی مہربان ہو جائے۔ میں اسے منہ مانگے معاوضے کی پیشکش کروں گا۔ معاوضے کا سن کے وہ ناراض تو ہو گا لیکن اس طرح اسے میری منت گزاری کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ کوچوان بھی میری پریشانی سمجھ رہا تھا۔ وہ کبھی گھوڑے کو چابک مارتا، کبھی لگام کھینچتا، طرح طرح آوازیں نکالتا اور گالیاں بکتا تھا۔ وہ بے چارہ اپنے جتن کر رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو آگے چلنے والی گاڑیوں کے اوپر سے تانگا گزار کے آگے لے جاتا۔

ڈاک خانے سے چلے پندرہ منٹ کے قریب ہوئے ہوں گے۔ تانگے نے ابھی بہت کم فاصلہ طے کیا تھا کہ مجھے اپنے کانوں پہ شبہ ہوا مگر سیٹیوں کی گونج واضح تھی۔ پولیس کی سیٹی کی آواز الگ ہوتی ہے۔ میں نے مضطربانہ اپنی نشست سے اچھل کے دیکھا اور میری آنکھیں دھندلانے لگیں۔ دور خاصے فاصلے پر سائکلوں پر سوار کئی پولیس والے مجھے اپنی طرف آتے نظر آئے۔ سادہ لباس میں چند لوگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہیں بھی تیز رفتاری سے سائکلیں دوڑانے کے لیے راستہ صاف نہیں مل رہا تھا۔ مسلسل سیٹیاں بجانے کا مقصد رکاوٹ بننے والے راہ گیروں اور سواریوں کو ایک طرف سمٹ جانے اور راستہ دینے کی تاکید کرنا ہی ہو گا۔ پولیس کو دیکھ کے لوگ ویسے بھی کنارے ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی وقت بھی مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خوش گمانی کی کہ شاید انہیں میری تلاش نہ ہو، مجھے خاطر جمع رکھنی چاہیے اور اگر انہیں میری ہی تلاش ہے تو مجھے اپنے اوسان بجا رکھنے کی ضرورت ہے۔ میری

جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کچھ کرتا۔ مجھے ساری صورت حال ان کے گوش گزار کر دینی چاہیے کہ میں نے تو صرف اپنا دفاع کیا ہے۔ میں نے ان سرکشوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ انہوں نے میری کوئی بات نہیں سنی اور چاقو نکال لیے۔ میرے ہاتھ میں تو چاقو بھی نہیں تھا۔ اس نے دیکھا ہے کہ بڑی عمر کا نوجوان اپنے ساتھی کی نادانی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے۔ میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن...... لیکن کوئی سنے بھی تو! وہ پولیس کے آدمی ہیں اور پولیس پہلے پولیس ہوتی ہے، بعد آدمی۔ میں تو یوں بھی شہر میں اجنبی ہوں۔ وہ مجھے روک لیں گے۔ میں کتنی ہی دہائیاں دوں، وہ تفتیش حال کے بغیر مجھے جانے نہیں دیں گے۔ انہیں خانہ پری کی عادت ہوتی ہے، اس کی روزی کھاتے ہیں۔ پھر وہ تھانا، سوال و جواب، حوالات...... میرا دل ڈوبنے لگا۔ میرے گواہ بہت سے ہیں لیکن صفائیاں اور گواہیاں پیش کرنے میں ایک وقت چاہیے۔ سارے گواہ اسی شہر کے ہیں اور یہ استاد میدا کے زور واثر کا علاقہ ہے۔ اس کے آدمیوں کے خلاف گواہی دینے کی جرأت کوئی کس طرح کر سکے گا۔ گلی میں بھی وہ سارے سہمے ہوئے کھڑے تھے اور انہی نے پولیس کو تانگے اور اس کی سمت کی نشان دہی کی ہو گی۔

طرح طرح کے سودے میرے سر میں منڈلا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف گلیاں نکلتی تھیں۔ بس یہی سمجھ میں آتا تھا کہ تانگے سے کسی گلی میں داخل ہو جاؤں۔ ممکن ہے، ابھی ان کی نظر تانگے پر نہ پڑی ہو۔ درمیان میں سواریوں کی نقل وحرکت سے کئی بار وہ بھی میری نظروں سے گم ہو گئے تھے۔ شش و پنج کا وقت نہیں تھا۔ مجھے جلد ہی کچھ طے کرنا تھا۔ میں نے جیب سے کچھ روپے نکال کے اگلی نشست پر بیٹھے کوچوان کی طرف پھینکے۔ اس سے کچھ کہنے سننے میں وقت اور ضائع ہوتا۔ ابھی پولیس دور تھی اور سڑک کے مختصر گھماؤ سے تانگا پولیس سے اوجھل ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ ایک مناسب موقع تھا۔ بیگ سنبھال کے میں تانگے سے کود پڑا اور چند گز دور واقع گلی میں داخل ہو گیا۔

دس بارہ قدم تک میری رفتار تیز تھی۔ مجھے جلد سے جلد خاص سڑک سے دور ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس خیال سے کہ گلی کے راہ گیر میری اس تیزی سے شبہے میں پڑ سکتے ہیں، میں نے رفتار کم کی۔ گلی دور تک سیدھ میں جاتی تھی اور ایک چھوٹے سے چوراہے سے دائیں بائیں گلیاں نکلتی تھیں۔ دائیں طرف کی گلی سے اسپتال کا فاصلہ کم ہونے کا امکان تھا۔ احتیاطاً میں نے مخالف گلی کا رخ کیا۔ ایک اور گلی میں مڑ جانے سے اب میں پولیس کو خاص سڑک سے نکلنے والی سیدھی گلی میں نظر نہیں آ سکتا تھا۔

یہ مسلمانوں کا کوئی قدیم محلہ تھا۔ دونوں اطراف مسلمانوں کی خاص طرزِ تعمیر کے حامل اونچے نیچے، چھوٹے بڑے مکانات بنے ہوئے تھے، بیشتر پرانے۔ جہاں بھی موڑ آتا، میں اسی گلی میں مڑ جاتا۔ اندر پیچ در پیچ گلیاں تھیں، کہیں تنگ، کہیں کشادہ۔ لگتا تھا، ایک دو دن پہلے نالیاں صاف کی گئی ہیں۔ نالیوں سے نکالی ہوئی سیاہ کیچڑ اور کوڑے کے ڈھیر جگہ جگہ پڑے ہوئے تھے اور ہر طرف کوئی بوسی بسی ہوئی تھی، کھانا پکنے اور کوڑے کرکٹ سے اٹھتی ملی جلی بو۔ سرسوں کے تیل کی بو ان میں غالب تھی۔ اقامتی علاقوں کی گلیوں میں عموماً ایک دوسرے سے واقف لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ فقیر اور پھیری والے بھی شناسا ہوتے ہیں۔ گلیوں میں کھیلتے ہوئے بچے، دریچوں اور دروازوں سے جھانکتی عورتیں اور راہ گیر مجھے متجسس نظروں سے دیکھتے تھے۔ یوں منہ اٹھائے گلی گلی گھومنے کا جواز پیدا کرنے کے لیے مجھے کسی جگہ ٹھہر کے کسی کا پتا دریافت کرنا چاہیے تھا۔ مگر کس کا نام لیتا۔

میرے ہوش وحواس ہی ٹھکانے نہیں تھے۔ایک جگہ آگے جا کے گلی بند ہوگئی تھی۔اتفاق سے وہاں نسبتہً سناٹا تھا۔ مجھے سر جھکائے واپس آنا پڑا۔ کسی نے مجھے ٹوکا نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ سے بہت خفت ہوئی۔اندازاً میں خاص سڑک سے خاصی دور آ گیا تھا لیکن اب بھی محفوظ نہیں تھا، متعدد راہ گیروں نے مجھے دیکھا تھا۔ پولیس اس گلی میں آگے جہاں سے داخل ہوا تھا، کسی کو میرا حلیہ بتا کے میری سمت کے بارے میں معلومات کر سکتی تھی۔ مگر مجھے اپنی جیسی کوشش کرتے رہنا چاہیے تھا۔ میں ایک گلی سے دوسری گلی میں چکر کھاتا رہا۔

گلیوں میں لکڑی کی ٹالوں، چونے کے بھٹوں کے علاوہ پرچون فروشوں اور دیگر گھریلو ضروریات کی چھوٹی موٹی دکانیں قائم تھیں۔ مجھے دیکھ کے دکاندار اور خریدار کچھ کہتے نہیں تو چونکتے ضرور تھے اور ان کی تیکھی نگاہیں مجھے اپنے جسم پر کانٹوں کی طرح چبھتی محسوس ہوتی تھیں۔ایک خالی دکان دار نے مجھے آواز دے کے روک لیا۔ میں سنی ان سنی کر کے نکل جانا چاہتا تھا لیکن وہ اور مشکوک ہو جاتا۔وہ پوچھنے لگا کہ مجھے کس کی تلاش ہے اور میں کون ہوں۔ مجھے نام بتانے میں جھجک ہوئی پھر میری زبان پر بے اختیار مولوی صاحب کا نام آیا۔ اس نے حیرانی کا اظہار کیا اور کہنے لگا کہ وہ اس محلے کے ہر مکین سے واقف ہے۔ کسی مولوی محمد شفیق کا نام اس نے آج تک نہیں سنا اور پوچھنے لگا کہ آخر کس نے مجھے اس محلے میں مولوی صاحب کے قیام کے بارے میں رہ نمائی کی ہے۔ میں نے کہا کسی نے بھی نہیں، مجھے تو پٹنا شہر کے بارے میں کسی نے بتایا تھا۔ مجھے ٹھیک پتا نہیں معلوم، سو میں مسلمانوں کے محلوں میں جا بجا انہیں تلاش کر رہا ہوں۔میرے جواب سے اس کی سیری نہیں ہوئی۔ وہ کوئی جزئیات بین، دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے والا شخص تھا، سوال پر سوال کرنے لگا۔میری بے ربطی پر اس نے مجھے خبط الحواس سمجھا یا کچھ اور۔ مجھے سمجھانے لگا کہ بہتر ہے، وقت ضائع کرنے کے بجائے میں کسی اور محلے کا رخ کروں۔گلی میں آگے جانے کے بجائے میں اس کی ہدایت پر عمل کا تاثر دیتا ہوا وہاں سے لوٹ آیا۔

میری ٹانگیں جواب دینے لگی تھیں۔خاصا وقت گزر گیا تھا۔اتنی دیر میں پولیس دور چلی گئی ہوگی۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ پولیس کے ہاتھ پڑ جانے کے بعد اپنی دست و پائی کا مجھے اچھی طرح احساس تھا۔ مجھے خیال آیا، ہوٹل بھی ڈاک خانے سے قریب تھا۔جس مقام سے میں گلی میں داخل ہوا تھا، وہاں سے اور قریب ہونا چاہیے۔ہوٹل کے منیجر اور کاؤنٹر پہ تعینات نوجوان نے مجھ سے بڑی ہمدردی کی تھی۔ شاید وہی اس وقت میری کچھ مدد کریں۔ پولیس ہوٹل کی طرف نہیں جائے گی۔کسی کو نہیں معلوم کہ میں گرانڈ ہوٹل میں ٹھیرا ہوا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں شہدوں، اچکوں نے ہوٹل سے نکلتے ہی میرا پیچھا شروع کر دیا ہو اور ڈاک خانے میں جا لیا ہو لیکن کچھ تو ہوٹل میں جانے کا خطرہ تو مجھے مول لینا چاہیے۔ وہاں سے ضرور کوئی راہ نکلے گی۔ یہ سوچ کے میں نے واپس سڑک پر جانے کا قصد کیا اور واپسی کا راستہ کہیں کھو گیا۔ میں اندازے سے چلتا رہا اور چلتے چلتے ایک کھلی جگہ پر آ گیا۔ سامنے لوہے کے جنگلے کی فصیل کے اندر اونچے اونچے درختوں سے گھرا ہوا ایک بڑا باغیچہ تھا۔ باغیچے کے چاروں طرف بڑے مکانات کا سلسلہ تھا اور ایک جانب مسجد بنی ہوئی تھی۔موذن ظہر کی اذان دے رہا تھا۔گویا ایک بج رہا تھا۔ڈاکٹر رائے کمرے میں آ چکا ہوگا۔نرس سیورین نے بتایا تھا کہ وہ وقت کا بڑا پابند ہے۔ مجھے نہ پا کے جانے اس نے کیا سمجھا ہو۔وہ بٹھل کے بارے میں مجھے کیا بتانا چاہتا ہو۔ میرے تو اب ہاتھ پیر ٹوٹے جاتے تھے۔ بس یہی جی کرتا تھا کہ وہیں ڈھیر

ہو جاؤں، اپنا سر پیٹوں یا منہ نوچوں۔ میں اب کسی طرح بھی وقت پر اسپتال نہیں پہنچ سکتا تھا۔

موذن اذان ختم کر چکا تو میں نے قریب جا کے دیکھا۔اس وقت وہاں کوئی نمازی نہیں تھا۔ دروازے کے پاس، مدرسہ حنفیہ کی بوسیدہ تختی آویزاں تھی۔کوئی طالب علم بھی اندر نظر نہیں آ رہا تھا۔ مسجد سے ملحق موذن یا امام کا حجرہ بھی ہونا چاہیے تھا۔ کیوں نہ میں اس کے پاس جا کے اپنا حال بیان کروں اور اس کے حجرے میں کچھ دیر پناہ لوں۔اس طرح مجھے خود کو بحال کرنے کا کچھ وقت مل جائے گا اور پولیس اگر اس طرف آ گئی تو مسجد میں داخل ہونے سے اجتناب کرے گی۔موذن کو میرے سچ پر یقین آ گیا تو وہ بھی میری اعانت سے دریغ نہیں کرے گا۔ جوتے اتار کے میں نے مسجد کے صحن میں قدم رکھا تو موذن چٹائیاں بچھا رہا تھا۔ وہ اڑی اڑی، بکھری بکھری ڈاڑھی کا ایک پستہ قد، اوسط عمر شخص تھا، کرتا اور تہمد پہنے ہوئے۔ چہرے پر درشتی تھی اور خود سے بیزار معلوم ہوتا تھا۔اس سے کسی نرمی اور مہربانی کی امید بہت کم تھی۔ میں نے پانی طلب کیا تو وہ بے دلی سے کٹورے میں پانی لے آیا۔ ایک سانس میں کٹورا خالی کر کے اور چبوترے کا مختصر زینہ پھلانگ کے میں جلد سے جلد باہر آ گیا۔

مسجد سے وابستہ باغیچے کی شکل بیضوی تھی اور اس کے گھماؤ کے ساتھ کسی قدر چوڑی اینٹوں کی سڑک چلتی رہتی تھی۔سڑک اور باغیچے کے بیچ میں حائل جنگلے کی سلاخیں جگہ جگہ سے اکھڑی یا نکلی ہوئی تھیں جب کہ داخلے کے لیے باقاعدہ دروازے موجود تھے۔ دوسری طرف جانے کے لیے لمبا چکر کاٹنے کے بجائے میں نے مسجد کے نزدیک سلاخوں کے درمیان بنے ہوئے راستے سے باغیچے میں قدم رکھا۔سبزہ برائے نام تھا۔ بچے شاید یہاں کھیلتے ہوں گے اس لیے زمین پر بچھے سبزے کے بیچ بیچ میں مٹی نمایاں ہو گئی تھی اور دھبے پڑے ہوئے لگتے تھے۔اطراف میں کنارے کنارے لکڑی کی ٹوٹی پھوٹی بینچیں نصب تھیں۔اندر خاصا سناٹا تھا۔اب ایک قدم بھی چلنا دشوار ہو رہا تھا کچھ دیر خود کو استوار کرنے کے لیے میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور چند لمحوں بعد ہی اٹھ گیا کہ میں کسی طور اس غفلت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔باغیچے کی دوسری جانب نکلتے ہوئے میں نے خود کو سرزنش کی کہ میں کب تک یوں بے سروپا پھرتا رہوں گا۔ مجھے کوئی پروا کیے بغیر یا تو کسی سے راستہ پوچھ کے اسپتال کا رخ کرنا چاہیے یا پھر پولیس کے سامنے خود کو پیش کر دینا چاہیے اور اس سے بہتر ہے کہ مجھے کلکتے میں جامو کو ایک اور تار دینا چاہیے کہ وہ جلد از جلد یہاں پہنچ جائے۔ پہلے مجھے قریب ترین جگہ، گرانڈ ہوٹل پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مجھے خود تار دینے کا موقع نہ مل سکا تو ہوٹل والے یہ کام کر سکتے ہیں۔یکایک میرے دماغ میں شرارہ سا کوندا۔ کیوں نہ میں کسی راہ گیر سے استاد میدا کے اڈے کا پتا پوچھوں۔ بمبئی میں اس طرح کئی اڈے میرے قبضے میں آ گئے تھے۔میں براہ راست استاد میدا کے پاس جا کے اڈے کی چوکی کا دعوا کرتا ہوں۔ اڈوں کی روایت یہی ہے کہ چاقو اور زور آزمائی سے دعوے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے، فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ اتنا تو مجھے خود پر اعتماد ہے۔بٹھل بھی مجھ پر یہ اعتماد کرتا ہے۔استاد میدا کو اس کے اڈے سے میں نے بے دخل کر دیا تو سب کچھ خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔اڈے سے وابستہ ہر آدمی نئے استاد کے زیرنگیں ہوگا۔وہ تینوں بھی جو ڈاک خانے اور اس سے ملحق گلی میں میرے آڑے آ گئے تھے۔اس وقت اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔استاد میدا کا اڈا یہیں کہیں آس پاس ہوگا۔

میری رفتار غیر ارادی طور پر تیز ہو گئی اور پھر بہت سے دھندلے اندیشوں نے مجھ پر یورش کی۔ اگر نتیجہ مختلف ہوا! ساری چیزیں موافق ہوں تو بھی

بدقسمتی اور ان ہونی کا ایک فی صدا مکان ہمیشہ موجود رہتا ہے اور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہاں کے اڈوں کے طور طریقے الگ بھی ہوسکتے ہیں۔ استاد میدا کوئی بہت کمینہ اور سفلہ شخص بھی ہوسکتا ہے۔ ادھر بٹھل اسپتال میں پڑا ہے۔ مجھے پہلے تو اس کی فکر کرنی ہے۔ اس کے لیے خود کو محفوظ کرنا ہے۔ چاقو کے ساتھ کسی کے مقابل ہونے میں یک سوئی شرط ہے۔ اور ناکامی کی صورت میں کچھ بھی ممکن ہے، ذرا سی چوک ہوگئی تو تلافی کی گنجایش نہیں ہوگی۔

مجھے کچھ اور سوچنے، کسی اور طرف غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ باغیچے کے اس جانب سامنے پڑنے والی پہلی گلی کے پار کوئی بڑی سڑک تھی۔ وہاں راہ گیروں اور سواریوں کی کثرت سے آمدورفت دکھائی دیتی تھی۔ پہلے تو مجھے گمان ہوا، یہ وہ سڑک تو نہیں جہاں سے میں چلا تھا مگر دور، بہت دور پانی نظر آرہا تھا۔ یہ گنگا ندی ہی ہوسکتی تھی۔ باغیچے سے نکل کے میں سامنے والی گلی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ عقب سے بھن بھناتا شور سنائی دیا۔ پیچھے دیکھے بغیر میں ایک جانب ہوگیا پھر ایک درخت کی آڑ سے میں نے دیکھا کہ دوسری جانب، باغیچے کے پار، مسجد سے نزدیک گلی کے دہانے پر کئی سائیکل سوار سپاہی سائیکلیں روک کے ادھر ادھر نظریں گھما رہے ہیں۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ وہ گلیوں کے لوگ ہی ہوں گے۔ تماشا ہونا چاہیے، تماشائیوں کی کمی نہیں۔ مجھے یہی خدشہ تھا، گلیوں میں متعدد لوگوں نے مجھے گھومتے دیکھا تھا۔

میرے اور پولیس کے درمیان باغیچے کا فاصلہ اور باغیچے کے درختوں اور جنگلے پر چڑھی بیلوں کا چھدرا پردہ حائل تھا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ اپنے آپ کو چھپاتا ہوا سامنے والی گلی تک پہنچ جاؤں۔ اس گلی میں بھی مکانات کا سلسلہ تھا۔ روپوش ہونے کی وہیں کوئی بہتر جگہ مل سکتی تھی۔ بھاگنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ باغیچے کے ساتھ گھومتی ہوئی نسبتاً چوڑی سڑک پار کرکے میں تیز قدموں سے گلی میں آگیا اور مجھے سیٹیوں کی گونج سنائی دی۔ انہوں نے مجھے دیکھا یا نہیں، مڑ کے دیکھنے کا مجھے یارا نہیں تھا۔ گلی کے نکڑ ہی پہ کسی چھوٹی حویلی کی طرز کا ایک دومنزلہ پرانا مکان بنا ہوا تھا۔ گلی میں سیدھے چلتے رہنے سے نظر آجانے کا امکان تھا۔ نکڑ والے مکان کی ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اسی میں داخل ہوگیا۔ اندر روشنی کم تھی۔ کسی کمرے کے بہ قدر اس ڈیوڑھی میں تین دروازے تھے، ایک سامنے اور دو دائیں اور بائیں۔ دائیں ہاتھ کا دروازہ نزدیک تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے لپک کے بائیں طرف کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور احتیاطاً جیب سے چاقو نکال لیا۔ کسی مردانہ آواز نے اندر سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

میں نے پہلے اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کی اور دبی زبان سے کہا۔ ''دروازہ کھولیے۔''

''کون......کون ہو میاں؟'' اندر سے وہی بھاری بھرکم آواز آئی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''ذرا باہر آیئے۔ آپ کے لیے ایک پیغام ہے۔''

میری بات پوری سننے سے پہلے ہی اس شخص نے دروازہ کھول دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونک پڑا اور مضطرب نظروں سے دیکھا کیا۔ کمرا اونچائی پر تھا۔ ایک قدم کی سیڑھی پر پاؤں رکھ کر ہی اوپر جانا ممکن تھا۔ مجھے اسے کوئی وقت نہیں دینا تھا۔ صورت حال سمجھنے اور کوئی نتیجہ اخذ کرنے کا۔ یوں بھی آنے والے لمحے اس کے تصور سے بعید ہوں گے۔ منظر کی اس اچانک تبدیلی سے متوازن آدمی بھی بے توازن ہوجاتا ہے۔ آنکھ جتنی جلد دیکھ لیتی ہے، ذہن اتنی جلد قبول نہیں کرتا۔ میں نے ایک پیر سیڑھی پر رکھا،

دوسرے لمحے اسے پیچھے دھکیلتا ہوا میں کمرے کے اندر تھا۔ میں نے چاقو کھول لیا۔

وہ ترشی ہوئی داڑھی، سرخ وسپید رنگت، طویل قامت، بھاری بھرکم جثے، تیکھے خال وخط، ململ کے مکلف کرتے اور پاجامے میں ملبوس پچاس سے پچپن کی عمر کا ایک وجیہہ شخص تھا۔ بشرے سے کوئی نواب لگتا تھا۔ کمرے میں خاصی روشنی تھی۔ میں نے طائرانہ نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔ فرش کے وسط میں قالین بچھا ہوا تھا۔ اردگرد کرسیاں رکھی اور دیواروں سے پیوستہ شیشے کی الماریوں میں کتابیں سجی ہوئی تھی۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان پہ پردے لٹکے ہوئے تھے۔ چوکی پر موجود افراد میں ایک کم عمر لڑکا تھا، بھیگتی مسوں کا۔ دونو جوان لڑکیاں تھیں اور ایک سن رسیدہ عورت تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی چیخیں نکل گئیں پھر بدحواسی سے عورتوں نے دوپٹوں سے چہرے چھپالیے اور چوکی کے پاس گھر کے اندرونی حصے میں کھلنے والے دروازے سے بھاگنا چاہا۔ میری دھمکتی آواز نے انہیں ساکت کردیا۔ ''کوئی نہیں، کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ سب اسی کمرے میں رہیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔''

دروازہ کھولنے والا شخص میرے چاقو کی زد پر تھا اور بری طرح بوکھلا گیا تھا ''کون، کون ہو تم؟ کیا......کیا چاہتے ہو؟'' وہ ہکلاتی آواز میں بولا۔

میرا چاقو اس کی گردن کے نزدیک تھا اور میں نے اس کا دایاں بازو اپنے بازو میں جکڑ لیا تھا۔ سامنے چوکی پر بیٹھے گھر کے افراد کے آگے دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کھانا رکھا تھا۔ میرا وجود ان کے لیے کسی بھیانک خواب کے مانند ہوگا۔ گو میری حالت بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ میں اندر ہی اندر ہانپ سا رہا تھا۔ انہیں میری کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے خود کو مجتمع رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور بہ ظاہر دھمکتی آواز میں پوچھا۔ ''گھر میں اندر اور کون کون ہے؟''

''کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں، صرف ایک ملازمہ ہے۔'' مرد نے بہ مشکل کہا۔ ''اور......اور......''

''اور کون؟'' میں نے اپنے لہجے میں سفاکی قائم رکھنے کی ڈھٹائی کی۔

''اور میری بیمار والدہ۔'' اس نے بہ عجلت جواب دیا۔ ''وہ......وہ چل پھر نہیں سکتیں۔''

''ملازمہ کو اندر بلاؤ۔'' میں نے سردمہری سے کہا۔

اس نے پھٹی ہوئی آواز میں چوکی پر بیٹھے ہوئے نوخیز لڑکے کو مخاطب کیا۔ ''زینی، زینی! جاؤ، جا کے رابعہ سے کہو، وہ فوراً یہاں آجائے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے تیز اور شستہ انگیریزی میں زینی کو واپس نہ آنے اور پڑوسیوں کو مطلع کرنے کی ہدایت کی۔

زینی کے دیدے باہر نکلے ہوئے تھے اور سکتے کا سا عالم طاری تھا۔ اس کے پہلو سے چپکی ہوئی دہشت زدہ ادھیڑ عورت کے کہنی مارنے پر وہ ہڑبڑا گیا۔ وہ چوکی سے اٹھ پڑا تھا کہ میری آواز پر اس کا سراپا متلاطم ہوا اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

''تم کہیں نہیں جاؤ گے، اپنی جگہ سیدھے بیٹھے رہو گے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''ملازمہ کو یہیں سے آواز دو۔'' میں بھی اسے انگریزی میں حکم دے سکتا تھا لیکن میں نے دانستہ اجتناب کیا۔

زینی کے بجائے ادھیڑ عورت نے خفقانی انداز میں ''رابعہ رابعہ'' کی گردان شروع کردی۔

''میں نے کہا نا تم سے، میری والدہ بیمار ہیں۔'' مرد نے سراسیمگی سے کہا۔ ''ملازمہ انھی کے پاس ہوگی۔ وہاں تک شاید آواز......''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مزید کیا کروں، کون سا حکم دوں۔ میں نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ کھلی کھڑکیوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔ چوکی کے برابر گھر میں داخلے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا

اور کھلا ہوا تھا۔ دونوں نوجوان لڑکیاں، ادھیڑ عورت، غالباً اپنی ماں سے چمٹی ہوئی تھیں۔ انہوں نے دوپٹوں سے چہرے ڈھانپ لیے تھے اور ان کے بدن کانپ رہے تھے۔ کھلے دروازے سے ملازمہ کسی بھی وقت اندر آسکتی تھی اور کوئی اور بھی...... بہ ظاہر گھر میں کسی اور افراد کی موجودی کا امکان نہیں تھا ورنہ کھانے کے وقت سبھی اس کمرے میں جمع ہوتے۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ کوئی اور آ بھی جائے تو کیا ہے۔ اسے بھی روکا جاسکتا ہے۔ جب تک میری گرفت میں گھر کا کوئی ایک فرد ہے، مجھے خاطر جمع رکھنی چاہیے۔ یہ سارا پڑھا لکھا، آسودہ حال گھرانا معلوم ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور آسودہ حال نسبتہً ہوش مند ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے اندیشے وسوسے ان کے ذہنوں میں نمو پاتے رہتے ہیں۔ جتنی دیر ان پر میری ہیبت رہے گی، یہ کسی نادانی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ اور میرا مقصد کسی کو زک پہنچانا بھی نہیں ہے۔ مجھ سے تو ان کی یہ حالت بھی دیکھی نہیں جاتی۔ میرے لیے اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ ہے تو انہیں بھی ایسی ناگہانی سے کہاں واسطہ پڑا ہوگا۔ تاہم مجھے اپنی شقاوت کا تاثر انہیں دیتے رہنا چاہیے۔

چند منٹ کا وقفہ قبرستان کی سی خاموشی کا گزر گیا۔ میری نظریں کمرے میں چاروں طرف بھٹکتی رہیں۔ مجھے احساس تھا کہ سکوت کے یہ لمحے ان پر عذاب کے مانند گزر رہے ہوں گے۔ اس طرح گھر میں داخل ہونے والا شاید ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا ہو، میری آمد کا مقصد اور میرے اگلے اقدام کے بارے میں جاننے کے لیے یہ بہت متوحش ہوں گے۔ سکوت کا یہ عرصہ میرے لیے بھی نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ ان میں جرات عود کرسکتی ہے۔ یہ مجھے کوئی پاگل دیوانہ نہ سمجھ رہے ہوں۔ یوں مجھے مذبذب و متردد دیکھ کے یہ میرے بارے میں اپنی رائے نہ بدل دیں۔ مجھے کوئی نہ کوئی حرکت کرتے رہنا چاہیے لیکن اور کیا؟ میں اور کیا کرسکتا ہوں؟ مناسب یہی ہے کہ مجھے سب کچھ صاف صاف انہیں بتادینا چاہیے۔ سب پر ایک عالم ہیجان واضطراب طاری ہے۔ زندگی بھر کے لیے اس وقت کی دہشت ان پر نقش ہوسکتی ہے۔ آیندہ کوئی کسی نفسی پیچیدگی کا شکار بھی ہوسکتا ہے۔ ایسا کچھ ہوا تو کیا میں خود کو معاف کرسکوں گا۔ لڑکیوں کا حال تو سب سے خراب ہے۔ ان کے چہروں پر بہت سادگی، شایستگی اور معصومیت ہے۔ یہ کیسی سزا، کس جرم کی سزا وہ بھگت رہی ہیں۔ کوئی بھی اوسان کھوسکتی ہے۔ ان کی استطاعت سے سوا مجھے ان کا امتحان نہیں لینا چاہیے۔ کسی اور طرح بھی میں ان سے پیش آسکتا ہوں۔ چاقو تو بہرحال میرے ہاتھ میں ہے اور یہی سب کچھ ہے۔ میری ساری توانائی میرا بالشت بھر ہتھیار ہے۔ ایک ہتھیار بدست کے آگے سو آدمی بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ مجھ پر یقین کریں یا نہ کریں۔ مجھے جتنا وقت مطلوب ہے، وہ تو مل ہی جائے گا۔

میں نے عواقب پر غور کرنے کے بعد مرد کا جکڑا ہوا بازو آزاد کردیا۔ وہ پلکیں جھپکانے لگا اور اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ ''آپ کرسی پر بیٹھ جائیں۔'' میں نے ظاہری رعونت سے کہا۔ ''اور خیال رہے، میرا ہاتھ خالی نہیں ہے اور نشانہ بھی برا نہیں۔ آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ بہتر ہے، جیسا میں کہتا ہوں، سردست اس پر عمل کیجیے۔''

کرسی پر بیٹھ جانے کی رعایت پر اسے مزید حیرت ہوئی۔ اس نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں غصہ بھی تھا، تجسس اور خوف بھی۔ وہ فوراً ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور جھکتے ہوئے کرتے کی آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ میں اس کے قریب ہی رہا۔

''آپ، آپ کیا چاہتے ہیں میاں؟'' اس نے شکست خوردہ آواز میں بہ دقت لب کشائی کی۔

”کچھ نہیں۔“ میرے منہ سے نکل گیا اور میں نے چاقو اچھال کے دوبارہ ہاتھ میں اچک لیا۔ اپنے اس اضطرار اور مشاقی کے بے اختیار اظہار پر مجھے خود سے بیزاری ہوئی۔ ”میری بات دھیان سے سنیے اور اپنے ہوش وحواس قائم رکھیے۔“ کچھ تامل کے بعد میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”میں چوری ڈکیتی کے ارادے سے آپ کے گھر میں داخل نہیں ہوا ہوں۔ مجھے یہاں سے کچھ نہیں چاہیے، صرف تھوڑا سا وقت...... مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ناحق ایسی بدترین آزمائش سے دوچار کیا ہے۔ یہ جبر، یہ دیدہ دلیری ایک ناقابل معافی جرم ہے بلکہ یہ تو کوئی گناہ ہے لیکن میری کچھ مجبوری ہے جو مجھے آپ کے ہاں اس طور سے پناہ لینی پڑی۔ میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ لوگ خاموشی سے یہ مختصر اور مشکل وقت گزار دیں تو...... تو میں......“ لفظ ذہن میں منتشر ہوگئے۔ ممنونیت اور احسان کے لفظ بہت ہیچ تھے۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہ کہا جا سکا۔

”کیا، کیا بات ہے؟“ مرد کی آواز میں پہلی مرتبہ ٹھیراؤ آیا۔

میرے نرم اور ندامت زدہ لہجے سے چوکی پر بیٹھی خواتین اور زینی نامی لڑکے کی بھی یقیناً کچھ تشفی ہوئی ہوگی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ”میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔“ میں نے اپنی بکھری ہوئی آواز استوار کرنے کی کوشش کی۔ ”کل رات ہی میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ پٹنے آیا ہوں۔ ہماری منزل بردوان تھی۔ ہم فیض آباد سے ریل میں بیٹھے تھے کہ اکبر پور جنکشن پر انجن میں خرابی پیدا ہوگئی۔ ساری گاڑی یکا یک جھٹکے کھانے لگی۔ رات کا وقت تھا اور مسافر ایسے بیدار نہیں تھے۔ کئی مر گئے، بہت سے زخمی ہوئے۔ کسی شدید جھٹکے سے میرے سوئے ہوئے بھائی کا سر بھی ڈبے کی دیوار سے ٹکرا گیا تھا لیکن اس وقت ایسی کوئی فکر کی بات نہیں معلوم ہوتی تھی۔ آگے راستے میں بھائی کے سر کی تکلیف بڑھتی گئی اور سفر ملتوی کر کے ہم پٹنا اتر گئے۔ گرانڈ ہوٹل میں کمرا لے کے اور سامان رکھ کے ہم نے پٹنا میڈیکل کالج اسپتال کا رخ کیا۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر مرض کی نوعیت نہ سمجھ پائے۔ وہ اسپتال کے بڑے ڈاکٹر، ڈاکٹر رائے کو ناوقت زحمت دینے سے ہچکچا رہے تھے۔ بڑی منتوں کے بعد آمادہ ہوئے۔ ڈاکٹر رائے نے مہربانی کی، اپنے اصول توڑ کے وہ اسپتال آ گیا۔ بھائی کا توجہ سے معائنہ کیا مگر اندرونی چوٹ کی وجہ سے وہ بھی حتمی طور پر کچھ بتانے سے قاصر رہا۔ بہر حال اس نے کچھ دوائیں تجویز کیں۔ اس کی ہدایت پر ہمیں ایک الگ کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔“

”رات بھر بھائی پر غفلت طاری رہی۔ صبح ان کے کئی ایکس رے لیے گئے۔ ڈاکٹر رائے دوپہر ایک بجے دوسری بار معائنے کے لیے کمرے میں آنے والا تھا۔ دوپہر تک میرے پاس خاصا وقت تھا لیکن وہاں سے ہٹنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ کمرے میں تعینات مہربان اور مستعد نرس کی مستقل نگہ داشت اور اس کی یقین دہانی پر کہ میں ہوٹل جا کے ڈاکٹر رائے کی آمد سے پہلے واپس آ سکتا ہوں، میں اسپتال سے نکل آیا۔ تانگے والے نے میری توقع سے کم وقت میں مجھے ہوٹل پہنچا دیا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، ہوٹل کا عملہ ہمارے بارے میں فکر مند تھا۔ گزشتہ رات سامان رکھ کے ہم وہاں سے چلے گئے تھے اور اسپتال میں ٹھیرے جانے کی وجہ سے واپسی ممکن نہ ہو سکی تھی۔ ہوٹل میں لباس تبدیل کرنے اور منیجر کو ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد اتنا وقت تھا کہ میں ڈاک خانے بھی ہو آؤں۔ تانگا مجھے ڈاک خانے لے گیا۔ دو ضروری تار دے کے میں وہاں سے نکلا ہی چاہتا تھا کہ ایک نوجوان دیوار بن کے سامنے کھڑا ہو گیا اور تار فارم پر کسی عزیز کے

نام اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع لکھوانے کے لیے عاجزی کرنے لگا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور صاف انکار بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ ایک اور نوجوان سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی تار فارم تھا۔ پہلے والے کی طرح وہ بھی میرے پیچھے پڑ گیا۔ وہ تو مجھ سے چمٹ ہی گیا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ دونوں ساتھی ہیں اور تار فارم پر پیغام نویسی کے لیے اتنی منت گزاری ایک حیلہ ہے، مقصد ان دونوں کا کچھ اور ہے۔ ان سے گلو خلاصی کی کش مکش کے دوران بعد کو آنے اور مجھ سے چمٹ جانے والا نوجوان میری جیب سے بٹوا نکال چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صفائی نہیں تھی یا گھبراہٹ میں ہاتھ اوچھا پڑ گیا تھا کہ دوسرے لمحے مجھے اس دست درازی کا احساس ہو گیا۔ میرا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتا کہ ادھر پہلے والے نوجوان کی عاجزی میں شدت آ گئی۔ اس نے میرا بازو جکڑ لیا تھا۔ اس سے بازو چھڑانے میں کچھ دیر لگی۔ اس اثنا میں جیب کترا نوجوان ڈاک خانے سے بھاگ نکلنے میں کام یاب ہو گیا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ بھاگتا ہوا ڈاک خانے سے ملحق گلی میں داخل ہو گیا۔ غالباً یہ جان کے کہ میں اس کے تعاقب سے باز آنے والا نہیں ہوں، گلی میں کچھ اندر جا کے وہ ایک جگہ ٹھیر گیا اور اس نے چاقو نکال لیا۔

”کاش میں وہاں سے لوٹ آتا۔ اس کے ہاتھ میں کھلے چاقو اور مشتعل تیوروں نے مجھے بھی اندھا کر دیا۔ اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ چاقو کے معاملے میں مجھے بھی کوئی شد بد ہو سکتی ہے۔ میں نے اسے جلد ہی پس پا کر دیا۔ اپنا بٹوا لے کے میں نے گلی سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ کچھ فاصلہ طے کر لیا تھا کہ نوجوان کے دو اور ساتھی چاقو گھماتے ہوئے ڈاک خانے کی سڑک سے گلی میں آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے میرے باہر نکلنے کا راستہ بند کر دیا۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ مجھے اپنے بیمار بھائی کے پاس اسپتال پہنچنے کی جلدی ہے۔ انہوں نے ایک نہیں سنی، مجھے دھتکار دیا۔ میں نے بٹوا واپس کرنے کی بھی پیش کش کی لیکن وہ تو کچھ طے کر کے آئے تھے اور جانے کس گمان میں تھے، بار بار میدا نامی اپنے کسی استاد کا حوالہ دیتے تھے۔ ان میں ایک نسبتہً مشاق چاقو باز معلوم ہوتا تھا۔ دونوں نے مجھے گھیر لیا۔ قریب ہی اپنے بے سدھ پڑے ساتھی کی شکستہ حالت نے انہیں اور غضب پر آمادہ کیا۔ میرے پاس ان سے نمٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ گلی میں کھڑے لوگوں نے کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ وہ تماشا دیکھتے رہے۔ میرے پاس بھی چاقو تھا۔ بات بڑھ جانے کے خیال سے میں نے جیب ہی میں رہنے دیا۔ تفصیل سے کچھ حاصل نہیں، مختصر یہ کہ میں نے پختہ کار آدمی کو کسی طرح زیر کر لیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں چاقو برقرار رکھ سکا نہ توازن، نہ خود پر اپنا اختیار۔ اس غیر متوقع صورت سے اس کا نوجوان نو آموز ساتھی بے قابو ہو گیا اور چاقو کھولے کسی پاگل کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس پر تو جیسے خون سوار ہو گیا تھا۔ اپنی جھوک میں وہ اتنی تیزی سے بڑھا تھا کہ میرے لیے خود کو اور اپنے قبضے میں آئے اس کے بے حال ساتھی کو بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے، پہلے مجھے اپنے آپ کو محفوظ کرنا تھا۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا کہ اس کا ساتھی بھی زد پر آ سکتا ہے، کیوں کہ وہ میری گرفت میں ہے اور خود کو بچانے کے لیے میں اسے سامنے کر سکتا ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کی دیوانگی سے میرے ساتھ اس کا ساتھی بھی محفوظ رہ سکے۔ میری کوشش بس اسی حد تک کارگر رہی کہ چاقو پیٹ میں کھبنے کے بجائے پسلی میں پیوست ہوا۔ نوجوان اپنی نادانی کے اس انجام سے حواس کھو بیٹھا۔ اسے قابو میں کرنا پھر میرے لیے دشوار نہیں رہا۔ چند ضربوں میں وہ چکرا کے زمین پر گر گیا۔ اس سانحے کے بعد کچھ وہ

خودبھی بے خبر ہو جانا چاہتا ہوگا۔"

"دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کے میں نے دوبارہ واپسی کا ارادہ کیا، پھر کوئی میرے راستے میں مزاحم ہوا نہ میں نے پلٹ کے دیکھا۔"

"تانگا ڈاک خانے کے باہر میرا منتظر تھا۔ پندرہ بیس منٹ کا فاصلہ تانگے نے طے کیا ہوگا کہ پولیس کی سیٹیاں سنائی دیں۔ لوگوں نے مجھے تانگے میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ انھی نے تانگے کی سمت کا بھی اشارہ کیا ہوگا۔ کوئی اور وقت ہوتا اور کوئی جگہ ہوتی تو میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا لیکن پولیس کے طریق کار کا مجھے تھوڑا بہت علم ہے۔ وہ ایسے، میری روداد سن کے اور میرا بیان لے کے مجھے واپس جانے نہیں دیتے۔ ان کے نرغے میں آجانے کے بعد میں وقت پر کسی طرح اسپتال نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہاں میرا کوئی واقف کار نہیں۔ اگرچہ گلی کے مکین اور راہ گیر سارے واقعے کے شاہد ہیں لیکن صاف نظر آرہا تھا، ان پر بھی استاد میدا کے زور واثر کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے مداخلت نہیں کی۔ سڑک کے دونوں اطراف گلیاں نکلتی تھیں۔ بس یہی اس وقت دماغ میں آیا کہ تانگے سے اتر کے کسی گلی میں خود کو روپوش کردوں۔ پولیس ابھی کچھ دور تھی، سڑک کے ایک موڑ پر میں تانگے سے کود پڑا اور چند گز دور دائیں جانب کی پہلی گلی میں داخل ہوگیا۔ ان گلیوں کے طول و عرض کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن ایسی بھول بھلیاں گلیاں ہر بڑے اور پرانے شہر میں ہوتی ہیں۔ میرا خیال تھا، ان پیچ در پیچ گلیوں میں پولیس کی دست رس سے نسبتہً محفوظ رہوں گا اور کہیں، کسی جگہ اسپتال کی طرف جانے والا راستہ مل جائے گا۔ میں ایک گلی سے دوسری، دوسری سے تیسری میں بھٹکتا رہا اور آپ کے گھر کے قریب مسجد اور باغیچے تک چلا آیا۔ میں نے باغیچہ تقریباً عبور کرلیا تھا کہ دوسری جانب سے سائکلوں پر سوار پولیس اور لوگوں کا شور مچاتا ہجوم دکھائی دیا۔ میرے اور ان کے درمیان باغیچے کا فاصلہ اور باغیچے کے درختوں اور جنگلے پر چڑھی بیلوں کا چھدرا پردہ حائل تھا۔ ان کی نظروں سے بچتا بچاتا باغیچے سے پیوستہ چوڑی سڑک عبور کر کے میں آپ کے گھر والی گلی میں آگیا۔ گلی سیدھ میں ہے، آگے جانے میں دکھائی دیے جانے کا اندیشہ تھا۔ ناچار میں نے گلی کے نکڑ پر اس پہلے مکان، آپ کے مکان پر دستک دے دی۔"

میرا گلا بری طرح خشک ہو رہا تھا۔ میں نے ان سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ اب باقی ان پر تھا کہ وہ کیا اخذ کریں۔ شاید یہی کچھ جاننے کی غیر شعوری جستجو میں، میں نے ٹھیر کے چوکی پر بیٹھی خواتین اور لڑکے زینی کو ایک نگاہ دیکھا۔ وہ سب میری طرف متوجہ تھے۔ مجھ سے نگاہیں ملیں تو وہ اپنی اپنی جگہوں پر ڈگمگا سے گئے۔ لڑکیوں نے مضطربانہ سر جھکا لیے اور دوپٹے سروں پر اور کھینچ لیے۔ اب وہ باہم ایسی سکڑی سمٹی ہوئی نہیں تھیں۔ زینی کی آنکھیں بھی حیرتی انداز میں کھلی ہوئی تھیں اور اس کا جسم بھی تنا ہوا تھا۔ میرے مخاطب، کرسی پر بیٹھے گھر کے نگراں مرد کے چہرے پر چھائی زردی کے بجائے سرخی واپس آگئی تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ گھر نہ ہوتا تو کوئی اور گھر ہوتا اور کچھ اور لوگ ہوتے۔ میرے پاس انتخاب کا وقت نہیں تھا۔ میرے لیے ہر جگہ ایک جیسی تھی۔ مجھے تو ایک پناہ گاہ چاہیے تھی۔ دوسرا کوئی گھر ہوتا تو وہاں بھی مجھے کچھ اسی ناروا، نازیبا سلوک کا مرتکب ہونا پڑتا۔ میں آپ کو بتاؤں، یہ — میرے لیے اتنا ہی جبر ہے جتنا آپ کے لیے۔"

میں نے دوبارہ معافی چاہی۔ "میری وجہ سے پردہ نشین خواتین کی بے پردگی ہوئی۔ آپ لوگ کھانے میں مصروف تھے اور کھانے کے بعد جانے آپ کے کیا معمولات ہوں، میں نے آکے سب درہم برہم کردیا۔ اطمینان رکھیے، کچھ دیر میں، مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔ امکان یہی ہے، پولیس اس علاقے سے ناکام ہو کے کسی اور طرف نکل گئی ہوگی۔ مجھے بہر حال پولیس کے ہاتھ نہیں آنا، اسپتال پہنچنا ہے۔ ڈاکٹر کے بارے میں نرس نے بتایا تھا، وہ وقت کا بڑا پابند ہے۔ وہ آکے کب کا چلا گیا ہوگا۔ کمرے میں میری ناموجودی پر اس نے جانے کیا سمجھا ہو۔ گزشتہ رات میں نے اس سے بڑی حجت کی تھی، سارا اسپتال سر پہ اٹھا لیا تھا۔ وہی شخص جو کل رات اور آج صبح اپنے مریض کے لیے اتنا بے قرار تھا، وہی شخص......" میری آواز بھرا گئی۔ "ڈاکٹر کیا کہتا ہوگا اور معلوم نہیں...... ان کا، بٹھل بھائی کا کیا حال ہو۔ ساری غلطی میری ہے۔ میں نرس کے کہنے میں آکے اسپتال سے نکلتا نہ یہ سب کچھ پیش آتا۔"

"اب تو وقت گزر ہی چکا ہے۔" بہت دیر بعد کرسی پر بیٹھے مرد نے زبان کھولی۔ "مناسب سمجھیں تو آپ بھی بیٹھ جائیں میاں۔"

مجھے اپنے کانوں پر شبہ ہوا مگر یہ اسی کی آواز تھی، نرم اور مشفقانہ۔ مجھے ٹھنڈی ہوا کے کسی جھونکے کا احساس ہوا۔ یعنی میری صراحتیں رائگاں نہیں گئیں۔ مبہم و موہوم سہی مگر مجھے توقع تھی، ان کا جواب یہی ہونا چاہیے۔ اپنا احوال سنا کے میری گراں باری کسی قدر کم ہوئی تھی، اب مجھے اپنی گرہیں کچھ اور کھلتی محسوس ہوئیں۔ تاہم اسی لمحے کوئی تند و تپیدہ لہر میرے وجود میں در آئی کہ یہ تو میں جانتا ہوں، میرا سچ، کسی سچ کے طور پر کارگر ہونا چاہیے مگر یہ تو اس پر منحصر ہے کہ اپنے گھر میں میری غاصبانہ آمد اور میرے شروع کے سفاکانہ رویے سے یہ کتنا منغض اور متنفر ہو چکا ہے۔ سچ کے پودے کی تخم ریزی کے لیے بھی نرم و نم زمین چاہیے، اور شاید کچھ ایسا ہے کہ آدمی سچ پر اتنا قادر نہیں جتنا جھوٹ پر ہے۔ سچ بہت نایاب ہے، اس لیے اس کی دست یابی پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ اور سماعت آلودہ ہو تو سچ بھی دھندلا جاتا ہے، نارسا رہتا اور نامعتبر ٹھیرتا ہے۔ اس نے کسی اور تاثر، میری بابت کسی منفی تاثر میں وہ سب کچھ سنا ہے، جو میں نے کہا ہے تو زہر کی طرح اس کے کانوں میں سرایت ہونا چاہیے۔ مجھے صلہ دینے کا ہر جواز اس کے پاس ہے۔

آدمی تو آدمی ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں جتنی تیزی سے آگ بھڑکتی ہے، اتنی تیزی سے بجھتی نہیں۔ مجھے اس کی افتاد طبع اور شخصی پیچیدگیوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ آدمی چہرے مہرے، قامت و رنگ میں کتنے ہی مشابہ ہوں، ان کے باطنی خصائل بہت جدا جدا ہوتے ہیں۔ سو لمحے بھر کی بدگمانی نے مجھے منتشر کیے رکھا کہ اس کی خوش خلقی میں بدخوئی کا کوئی پہلو تو مضمر نہیں۔ میں نے ایک اچٹتی نظر سے بہ ہر زاویہ اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس کی حالت اب پہلے جیسی نہیں تھی، وہ اب خاصا پر اعتماد لگ رہا تھا۔ اس اعتماد کا سبب بھی میں تھا۔ کرسی پر بیٹھ جانے کی اس کی خواہش کی تعمیل میں مجھے ایک ذرا تردد ہوا تھا اور میں نے خود کو سرزنش کی کہ میرا اعتماد کیوں متزلزل ہے۔ یوں بھی مجھے کتنی دیر یہاں ٹھیرنا ہے اور ہتھیار تو اب بھی میری تحویل میں ہے۔ میں اس کے پہلو کی کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے چاقو کھلا رکھنا بھی ناگوار گزرا۔ میں نے اسے بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

اس نے جھرجھری سی لی اور گہری سانس بھر کے کرسی کے سرہانے سے سر ٹکا دیا۔ یقیناً اتنی کشاکش کے بعد دل و دماغ کی یک جائی کے لیے اسے کچھ مہلت درکار ہوگی۔ چند ثانیے اس کی یہی کیفیت رہی پھر چونک کے بولا۔ "آپ نے شروع ہی میں یہ سارا کچھ بتا دیا ہوتا تو شاید......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ "بہر حال......" اس نے پھر آنکھیں میچ لیں۔

''کاش کہ یہی ہوتا مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ میں آپ کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اتنی جلدی نہ میں اپنا مدعا بیان کرسکتا تھا نہ آپ کو یقین آسکتا تھا۔ پولیس بہت قریب تھی۔ بس یہی ایک صورت مجھے سجھائی دی۔''

''غالباً پولیس اس طرف نہیں آئی ورنہ سڑک کا شور یہاں ضرور سنائی دیتا۔ یا تو وہ لوٹ گئی یا کسی اور طرف جانکلی۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں قیاس آرائی کی۔

میں خاموش رہا۔

اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ ''مجھے اکبر علی خاں کہتے ہیں۔'' اس نے متانت سے کہا۔ ''میں ایک وکیل ہوں لیکن اب وکالت نہیں کرتا، لاء کالج میں پڑھاتا ہوں۔''

''میرا نام بابر زماں ہے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''آپ مجھے تعلیم یافتہ نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔''

''تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا آتا ہے۔''

اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں اور وہ کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلانے لگا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے کوئی بات کہنے میں دشواری پیش آرہی ہے اور شاید اسے لفظ مل گئے یا سرا مل گیا، ادھر ادھر نظریں گھماتے اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''یہ، یہ خود کو آزاد سمجھیں؟'' اس نے چوکی پر موجود، اپنے آپ میں بندھی جکڑی خواتین کی طرف اشارہ کیا۔ ''میرا مطلب ہے۔'' اس نے بہ عجلت وضاحت کی۔ ''اجازت ہو تو انہیں اندر جانے دیا جائے۔''

میں بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ میں نے اس مرحلے کے بارے میں غور ہی نہیں کیا تھا۔ گھر کے افراد کے اندر چلے جانے سے مراد ہے، آنے والے لمحوں میں کوئی بھی ان ہونی صورت پزیر ہوسکتی ہے اور ادھر میرے انکار سے بھی یہ مثبت اور موافق صورت حال قائم نہ رہے گی۔ مجھ میں اب انکار کی جرات نہیں تھی۔ میں نے اسے خود گنوادیا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا شاید کوئی اور جواب ہی نہ تھا۔ ''جی، جی ہاں۔'' میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اجازت لے کے آپ مجھے اور شرم سار کررہے ہیں۔''

''نہیں نہیں، بخدا نہیں۔'' وہ ہاتھ بلند کرکے بے تابی سے بولا۔ ''میرا مقصد یہ ہے کہ اب ان کی یہاں کیا ضرورت ہے۔ یہ گھر کے اپنے کام کاج دیکھیں۔''

''میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا ہی چاہیے۔'' میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔

''اطمینان رکھیے۔ میں انہیں کوئی اور ہدایت نہیں دے رہا۔'' اس نے میری دھند دور کرنیکی کوشش کی۔ ''یہ خود بھی سمجھ بوجھ رکھتی ہیں اور انہوں نے بھی میری طرح سب کچھ دیکھا اور سنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، آپ کو اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر کا وقت تو نکل ہی چکا ہے۔ سوچتے ہیں، آپ کس طرح بہ حفاظت اسپتال پہنچ سکتے ہیں۔''

''آپ بہت مہربان آدمی ہیں۔'' میرے اظہار ممنونیت میں تصنع کی آمیزش تھی مگر شاید اسے محسوس نہ ہوئی ہو۔

''یہ بتائیے، آپ کیا پئیں گے؟ صبح سے آپ نے کہاں کب کچھ کھایا پیا ہوگا۔''

''مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔''

''ہاں، ایسی صورت میں بھوک پیاس کا کہ احساس ہوسکتا ہے۔''

''آپ، آپ لوگوں کے کھانے میں میری آمد سے رخنہ پڑگیا تھا۔ اچھا یہی ہوگا کہ میں اب چلوں آپ اپنے معمولات جاری رکھیں۔''

''ہمارے معمولات کو جانے دیجیے۔ اب نہیں تو کچھ دیر بعد جاری ہوجائیں گے۔ صبح وشام کا چکر تو چلتا رہے گا۔ اس وقت تو آپ کا مسئلہ اہم ہے۔'' اس کے لہجے میں غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ ''دیکھیے، میں آپ کے کسی کام آسکا تو مجھے خوشی ہوگی، ہم سب کو خوشی ہوگی۔'' اس نے خواتین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ارے بھئی! تم لوگ اندر جاکے مہمان کی کچھ تواضع وغیرہ کا بندوبست کرو اور ہاں، نہ کوئی باہر جائے نہ آس پڑوس سے واسطہ رکھے۔ درمیان میں کوئی گھر آئے تو اسے یہاں، ہماری طرف نہ آنے دیا جائے۔''

ادھیڑ عورت اور دونوں لڑکیاں سٹ پٹاتی ہوئی چوکی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے جیسے تیسے دوپٹوں سے اپنے بدن اور چہرے چھپا لیے اور ایک دوسرے کے پیچھے اندر جانے کے لیے دروازے کی طرف لپک پڑیں۔ زینی بھی اٹھ گیا۔ اکبر علی خاں نے اسے روک لیا اور حکمیہ انداز میں کہا۔ ''ذرا باہر جاکے دیکھو، ادھر کہیں آس پاس پولیس تو نہیں ہے۔ اور وہاں، کسی سے کچھ پوچھو گے نہ باہر کسی سے بات کروگے۔ اور جلدی واپس آنا ہے۔ سمجھے۔''

زینی تیزی سے باہر چلا گیا۔

کمرے میں ہم دونوں رہ گئے۔ میں خود کو تھپکیاں دیتا رہا۔ امکان تو نہیں ہے لیکن خوش گمانیوں میں احتیاط عین ہوش ہے۔ دروازہ چند قدم کے فاصلے پر تھا اور چاقو جیب میں محفوظ تھا اور میرے اختیار میں کچھ نہیں رہا تھا۔ سب کچھ جیسے میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں تو دیکھتا اور سنتا رہ گیا۔

زینی کے جاتے ہی اکبر علی خاں نے خوش اطواری سے پوچھا۔ ''کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔ ہاں، کیا مشاغل ہیں آپ کے؟''

''کیا بتاؤں۔'' میں نے چہ مراتی آواز میں کہا۔

''کچھ بتائیے نا۔ ملازمت تو آپ نہیں کرتے اور تجارت۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔ ''یقیناً وہ بھی نہیں۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔''

''پھر وقت کیسے گزرتا ہے؟''

''سیر وسفر میں۔''

''سیر وسفر میں؟ پھر تو ضرور گھر کے نواب ہوں گے، زمینیں جاگیریں ہوں گی۔'' اس کی مسکراہٹ میں شائستگی تھی۔

''تھوڑی بہت زمینیں ہیں۔'' میں نے اس کے بے موقع سوالوں سے بچنے کے لیے اقرار کیا۔

''فیض آباد میں؟''

''جی ہاں، وہیں۔'' میں نے سر جھکا کے کہا۔

''مریض آپ کے سگے بھائی ہیں؟''

''جی'' میرے لہجے میں ترشی آگئی۔ ''وہ سگے ہیں، نہ سوتیلے۔ کوئی خونی رشتہ نہیں ہے میرا ان سے۔ کچھ رشتے بے نام ہوتے ہیں اور کبھی سارے رشتوں سے بلند ہوتے ہیں۔''

اس کی آنکھیں سکڑتی پھیلتی رہیں اور وہ سر ہلاتا رہا۔ ''کیا اسم شریف ہے ان کا؟ یاد آتا ہے، کوئی نام لیا تو تھا آپ نے۔''

''بٹھل۔''

''بٹھل!'' اس نے تعجب سے دہرایا۔ ''صرف یہی نام؟''

''سب انہیں اسی نام سے جانتے ہیں۔ اب تو شاید خود انہیں بھی اپنا اصل نام یاد نہ ہوں۔''

اچ چھا۔ اچ چھا۔'' اس نے مفاہمانہ لہجے میں کہا۔ وہ ایک نہایت ذہین اور حساس آدمی تھا، کہنے لگا۔ ''ہوسکتا ہے، آپ میرے ان پے در پے سوالوں سے مکدر ہورہے ہوں۔ اصل میں میرا مقصد یہی نہیں کہ مجھے آپ کے بارے میں کچھ جاننے کی جستجو ہے، ایک قسم کی فطری جستجو۔ میری یہ بھی خواہش تھی اور ہے کہ کچھ اس طرح آپ کی توجہ بٹے لیکن لگتا ہے، آپ کے دماغ پر بہت بوجھ ہے یا آپ، آپ اپنے مخاطب کو اعتبار کے قابل نہیں

سمجھتے۔''

''نہیں نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ میرے محسن ہیں۔'' میں نے لجاجت سے کہا۔'' کچھ ناگوار خاطر ہوا ہو تو مجھے معاف کر دیجیے۔''

''میں آپ سے پھر کہوں گا، ذرا تحمل کیجیے، دیکھیں، جلد بازی میں خدانخواستہ اور رکاوٹیں نہ کھڑی ہو جائیں۔ آپ نے استاد میدا کا نام لیا تھا نا؟ میں اسے جانتا ہوں۔''

''آپ جانتے ہیں اسے؟'' میں نے بے کلی سے پوچھا۔

''وکالت کے دوران کئی بار اسے کچہری میں دیکھا ہے۔ شہر میں تقریباً سبھی اسے جانتے ہیں۔ وہ ایک شورہ پشت، پرلے درجے کا شیطان آدمی ہے، ایک نمبر کا غنڈا، بہت کٹ کھنا اور خوں خوار۔ بڑے بڑے سرکاری افسر اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کتراتے ہیں۔ اس کے گرگے، ایک سے ایک منہ مار، ہتھ چھٹ شہر بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں، بس اس کے سر پہ تاج نہیں ہے۔ من مانی، دھاندلی، ہٹ دھرمی۔ شہر میں بیش تر جرائم کے پیچھے وہ ہوتا ہے یا اس کے حاشیہ بردار ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی اس کے آڑے نہیں آتا یا اسے نہیں چھیڑتا تو وہ بھی اس شخص پر ہاتھ نہیں ڈالتا، گویا یا تو اس سے کوئی سروکار نہ رکھیے یا اس کے سائے میں آجائیے، پھر عافیت ہے۔ شہر میں عزت آبرو سے زندگی گزارنے کی یہی ایک بہتر تدبیر ہے۔ اور لوگ عموماً اسی پر عمل پیرا ہیں اور لطف یہ کہ بعض ستم ظریف اس سرکش کی تائید بھی خوب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، شہر میں ہونے والے جرائم کہیں زیادہ ہوں اگر استاد میدا موجود نہ ہوا۔ مراد یہ ہے کہ شہر کا ایک طبقہ اسے اپنا محافظ بھی سمجھتا ہے۔ طرح طرح کے قصے کہانیاں اس کے بارے میں مشہور ہیں۔ اور سنا ہے، اپنے دربار سے وابستہ لوگوں کا وہ بہت خیال رکھتا ہے۔ رکھنا بھی چاہیے کہ یہی تو اس کے دست و بازو ہیں، انہی کی وجہ سے اس کی سرکار قائم ہے۔ ڈاک خانے کی گلی میں زخمی ہو جانے والا نوجوان میدا کا آدمی تھا تو......'' اکبر علی خاں کے ماتھے پر لکیریں ابھر آئیں اور وہ کوئی شدید بات کہنے سے رک گیا۔

''تو کیا؟'' میں نے تلخی سے پوچھا۔

''تو کچھ بھی ممکن ہے۔'' وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔'' یہ بتائیے، جس آدمی کے چاقو پیوست ہوا تھا، اس کی حالت کیسی تھی؟''

''یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ زخم گہرا ہے اور جلدی ہی مرہم پٹی نہ ہوئی اور خون زیادہ نکل گیا تو کچھ بھی ممکن ہے۔''

''یعنی وہ اپنی جان سے بھی جا سکتا ہے؟'' اکبر علی خاں نے بے ربطی سے پوچھا۔

''یہ بھی ممکن ہے۔'' میں نے کسی جھجک کے بغیر کہا'' اس کا چاقو بردار ساتھی کوئی اچھا چاقو باز نہیں تھا۔ اسی نومشقی کی وجہ سے اس کا وار کاری بھی ہو سکتا ہے۔ اچھے چاقو باز ہاتھ کھینچ کے رکھتے ہیں، چاقو کو لگام دے کے، اور وہ تو...... میں نے آپ کو بتایا نا، وہ تو مجھے چاقو مارنا چاہتا تھا۔''

''لیکن کون گواہی دے گا؟''

''میں جانتا ہوں، کوئی بھی نہیں دے گا لیکن استاد میدا کو تو اصل بات سے آگاہی ہونی چاہیے۔ گلی کے لوگ اسے سچ کیوں نہیں بتائیں گے؟''

''آپ کا یہ نکتہ اہمیت رکھتا ہے۔'' اکبر علی خاں نے چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہنے لگا۔''استاد میدا کو اپنے طور پر بھی واقعے کی نوعیت جاننے کی کوشش کرنی چاہیے اور واقعی گلی کے لوگ اس سے سچ کیوں چھپائیں گے۔''

''گلی سے نکلے ہوئے مجھے دیر نہیں ہوئی تھی کہ پولیس نے میرا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ اتنی جلدی استاد میدا کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔ یقیناً گلی کے لوگوں نے پولیس کی توجہ میری جانب مبذول کرائی

ہو گی مگر اب وقت خاصا گزر گیا ہے۔ اتنی دیر میں استاد میدا کو سب کچھ معلوم ہو جانا چاہیے۔''

''اور معلوم ہو جانے کے بعد اس کا ردعمل کیا ہوا ہو گا، کیا ہونا چاہیے؟'' اکبر علی خاں نے جیسے خود سے پوچھا۔

''وہ اڈے کا کوئی مستند استاد ہے تو اپنے آدمیوں کی نادانی اور اوچھے پن پر بہت برگشتہ ہو گا اور جیسا کہ آپ بتاتے ہیں، وہ کوئی خودسر، بدخود غلط اور طبعاً کمینہ آدمی ہے تو اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''اسے شہر میں اپنی دھاک، اپنے بھرم کی فکر ہو سکتی ہے۔ وہ خاموش ہو جاتا ہے تو اس شرافت میں اس کی سبکی کا پہلو نکلتا ہے۔ شہر میں کوئی اجنبی اس کے تین آدمیوں پر حاوی آجائے، یہ حقیقت اس کا چین سکون غارت کر سکتی ہے۔ ایسے لوگ اتنے اصول پسند نہیں ہوتے۔ اسے آپ کی تلاش ہونی چاہیے۔ پولیس بھی اسی کا ساتھ دے گی۔ ظاہر ہے، پولیس کے کتنے لوگ، اوپر سے نیچے تک اس کے پروردہ ہوں گے۔'' اکبر علی خاں نے وکیلوں کی طرح نکتہ طرازی کی اور مایوسی سے بولا۔'' استاد میدا جیسے آدمی سے کسی بہتری کی توقع نہیں۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میری آواز کی تپش اسے اپنے کانوں میں محسوس ہوئی ہو گی۔

''میں امکانات کی بات کر رہا ہوں۔'' پہلی بار اس کے لہجے میں برہمی سی شامل تھی۔

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے سلگتی آواز میں پوچھا۔'' میرے پاس کون سا راستہ ہے۔ میں استاد میدا کے رحم و کرم پر رہوں اور ہاتھ پیر باندھے نظارا کرتا رہوں؟''

''مجبوری ہے۔ سامنے کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں، پیشہ ور مجرم ہے۔ یہی دیکھنا ہے کہ سردست کون سا راستہ آپ کے لیے مناسب ہے اور اس کے لیے آپ کو صبر و ضبط کرنا پڑے گا۔ ذرا سی کوتاہی سنگین رخ اختیار کر سکتی ہے۔'' اکبر علی خاں کے نتھنے پھول گئے تھے اور ہونٹ پھڑک رہے تھے۔'' آپ کہہ رہے تھے کہ گلی میں بعد کو آنے والے آدمیوں کو آپ نے بتایا تھا۔ آپ ان سے الجھنا نہیں چاہتے کیوں کہ آپ کا ایک عزیز اسپتال میں ہے اور آپ کو جلدی ہے۔ آپ نے انہیں بٹوا واپس کرنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ کیا آپ نے اسپتال کا نام بھی لیا تھا؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔''

''یہ اچھا ہوا لیکن وہ شہر کے ہر اسپتال میں آپ کو تلاش کریں گے اور ان کے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے۔ میدا کے پاس بدمعاشوں کی ایک فوج ہے۔''

''انہی اندیشوں کی وجہ سے مجھے یہاں، آپ کے گھر میں پناہ لینی پڑی اور آپ سب کو......''

اس نے مجھے بات پوری کرنے نہیں دی۔

''ہماری بات جانے دیجیے، جو وقت گزر گیا، گزر گیا۔ اس پر گفتگو کا موقع بعد کو بھی آ سکتا ہے۔ بعد میں ذکر کریں گے اس کا۔'' اس نے ایک آہ سی بھری اور مدھم آواز میں بولا۔'' اور خدشے تو اب بھی موجود ہیں جناب!''

''مجھے بہرحال اسپتال پہنچنا ہے اور جلد سے جلد۔'' میرے مصمم لہجے میں سرگشتگی نمایاں تھی۔''میں بٹھل بھائی کو اس حالت میں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔''

''مگر برادرم کس طرح؟''

''کسی بھی صورت۔''

''وہی تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔''

''میں نکل کے دیکھتا ہوں۔''

''اور راستے میں ان لوگوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ آپ سوچیں، یہ قطعی ممکن ہے۔ راستے میں آپ کو کسی نے پہچان لیا یا آپ پولیس کے ہاتھ لگ گئے؟''

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ٹھیک ہی

کہہ رہا تھا۔ راستے میں کہیں بھی کوئی پتھر بن سکتا ہے۔ وہ پولیس ہو یا میدا کے آدمی۔ دونوں صورتوں میں اسپتال پہنچنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ باہر آہٹ ہوئی تو بہ یک لمحہ ہم دونوں کی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں۔ وہ زینی تھا۔ وہ پھرتی سے اندر آیا تھا۔ ''کیا خبر لائے؟'' اکبر علی خاں نے ہڑک کے پوچھا۔

''اس طرف کوئی نہیں۔'' زینی کی آواز بھی اس کی عمر کی طرح کچی تھی۔

''تم نے کسی سے بات کی؟''

''آپ نے منع جو کیا تھا۔'' زینی نے دبی زبان سے جواب دیا۔

''ہاں ہاں۔'' اکبر علی خاں کچھ خفیف ہوا۔ ''تم نے ٹھیک کیا، اور سنو! تم گھر ہی میں رہو گے۔ ٹیوشن کے لیے ماسٹر ضیاالدین آئیں تو آج کے لیے منع کر دو گے۔'' زینی سر جھکائے واپسی کے لیے مڑ گیا تھا کہ اکبر علی خاں الجھ کے بولا۔ ''یہ لوگ اندر کیا کر رہی ہیں؟ ان سے کچھ کہا تھا میں نے...... جاؤ، اندر جا کے دیکھو۔''

زینی کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ ''شکر ہے، پولیس اس علاقے میں موجود نہیں ہے۔''

میں سر ہلا کے رہ گیا۔

''دیکھیے۔'' اس نے ہمکتی آواز میں کہا۔ ''ایک تو یہ صورت ہے کہ آپ خود کو......'' اس نے جلدی سے توضیح کی۔ ''یہ ایک مفروضہ ہے۔ فرض کیجیے، آپ خود کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں تو، تو کیا ہوگا؟ کل صبح یا اس سے اگلے دن وہ آپ کو عدالت میں پیش کر دیں گے اور کوئی آپ کی ضمانت لے لے گا۔ فرض کیجیے، یہ ضمانت میں لے لیتا ہوں۔ پھر آپ کسی حد تک محفوظ ہو جائیں گیا ورنہ آپ کو اس وقت تک تھانے کچہری کی گردش میں رہنا پڑے گا جب تک معاملہ کسی کروٹ نہ بیٹھ جائے۔ اگر زخمی شخص خدانخواستہ زندگی ہار بیٹھتا ہے تو ضمانت بھی مشکل ہو جائے گی۔ اور یوں عدالت میں آپ کی بے گناہی ثابت کرنے، ثبوت و شواہد جمع کرنے اور چشم دید گواہوں کو حق گوئی پر آمادہ کرنے میں ایک مدت صرف ہو سکتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کیوں نہ آپ اپنے بیمار بھائی کی دیکھ بھال کے لیے اپنی کسی عزیز کو یہاں بلا لیں۔ تار کے ذریعے یہ اطلاع میں انہیں دے سکتا ہوں۔ فیض آباد سے دوسرے دن کوئی بھی یہاں پہنچ جائے گا اور آپ کو تسلی ہو جائے گی۔ جب تک کوئی فیض آباد سے نہیں آتا، میں اسپتال جا کے آپ کے عزیز کی نگہ داشت کر سکتا ہوں۔ اسپتال والوں سے بھی آپ کی غیر حاضری کا کوئی معقول عذر کیا جا سکتا ہے۔ اس دوران آپ کسی قسم کا تردد کیے بغیر یہاں، اس گھر، میرے غریب خانے میں میرے مہربان کی حیثیت سے ٹھہر سکتے ہیں۔ مجھ پر کوئی بوجھ نہ ہوگا بلکہ مجھے خوشی ہوگی۔ ہمارا خاندان مختصر ہے اور گھر ماشاءاللہ بڑا ہے۔ اوپری منزل تقریباً خالی رہتی ہے۔ یہاں آپ کے قیام کے دورانیے میں کسی طرح چپ چپاتے آپ کی بہ عافیت فیض آباد واپسی کی تدبیر کی جا سکتی ہے۔ آپ شہر میں نہیں رہیں گے تو یہ سب کچھ خود بہ خود دب جائے گا۔ یعنی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی بھی حالت میں آپ کا فی الحال اسپتال جانا ممکن نہیں ہے۔ چوں کہ ابھی معاملہ گرم ہے۔ ہو سکتا ہے، جلد ہی ٹھنڈ پڑ جائے۔ خدا کرے، ایسا ہی ہو۔'' وہ پرامید انداز میں بولا۔ امید سے زیادہ اس کے لہجے پر حسرت کا غلبہ تھا۔

مجھے حیرت ہوئی۔ اور پہلوؤں پر اس جزرس کی نگاہ کیوں نہیں گئی۔ میں سنتا رہا اور میں نے اس سے نہیں کہا کہ ڈاک خانے سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے، میں نے کون کون سے مقامات پر تار دیے تھے۔ جس تانگے پر میں ڈاک خانے آیا تھا، اسے ڈھونڈ لینا ان کے لیے کیا دشوار ہوگا۔ تانگے والے سے انہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ میں کون سے

اسپتال سے سوار ہوا تھا اور درمیان میں کہاں ٹھیرا تھا۔ اس تفتیش میں ہوٹل میں ہماری اقامت اور پتے کی معلومات ہو سکتی ہیں۔ تار کے فارم پر میں نے پٹنا شہر میں اپنے پتے کے طور پر گرانڈ ہوٹل کا نام لکھا ہے۔ ہوٹل کے رجسٹر میں اپنی مستقل سکونت کے خانے میں فیض آباد کا پتا لکھوایا ہے۔ سرا پکڑتے پکڑتے وہ بٹھل تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں کچھ دیر بعد اپنے آپ کو چھپاتا ہوا اسپتال پہنچنے میں کام یاب بھی ہو جاؤں تو بھی شام کو یا رات گویا کل کسی وقت وہ اسپتال میں میرے سر پر آدھمک سکتے ہیں۔ اس طرح بٹھل کے میں کیا کام آ سکتا ہوں۔ اکبر علی خاں کا یہ مشورہ ہی صائب معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے تار دے کے جامو کو بلا لیا جائے۔ تار میں یہ تاکید بھی ہو کہ وہ اکیلا نہ آئے، جامو، استاد میدا سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ کہیں سے کسی کو بھی طلب کر سکتا ہے۔ کلکتے میں زورا اور جمرو بھی موجود ہیں۔ جامو کے ساتھ وہ بھی یہاں آجائیں تو اور اچھا ہو۔ مگر تار پہنچنے اور کسی کے آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ تار کب پہنچے۔ ادھر بٹھل کے لیے سوچ سوچ کے تو میرے اوسان خطا ہو رہے ہیں۔ کچھ خبر نہیں، ڈاکٹر رائے نے کیا تشخیص کی ہے، وہ کس نتیجے پر پہنچا ہے، ایکس ریز میں کیا آتا ہے۔ یہ اکبر علی خاں، ایک شریف النفس اجنبی، بٹھل کی خبر گیری کرنے کی نوازش پر آمادہ ہے تو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اسپتال میں بٹھل کو تنہا چھوڑ دینے سے بہتر ہے، کوئی اجنبی ہی سہی، اس کی پرسش حال کے لیے کوئی تو سرہانے موجود رہے۔ اکبر علی خاں ڈاکٹروں سے عمدگی سے بات کر سکتا ہے۔ میں اپنے پاس محفوظ ساری رقم اس کے حوالے کر دوں گا کہ اسپتال کے اخراجات میں اس کا ہاتھ کھلا رہے لیکن یہ متبادل تجویز کس حد تک قابل عمل ہے، اکبر علی خاں نے اس طرف غور نہیں کیا۔ اگر میدا کے آدمی کھوج لگاتے لگاتے بٹھل تک پہنچ گئے اور انہیں اسپتال کے کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا کہ بٹھل کو اسپتال لانے اور اس سے برادرانہ قرابت کا دعویٰ کرنے والا کوئی اور، یعنی میں تھا، اور میں ڈاک خانے سے ملحق گلی میں ہونے والے واقعے کے بعد اسپتال واپس نہیں آیا ہوں تو لازماً ان کی توجہ بٹھل کے تیماردار اکبر علی خاں پر مرکوز ہو جائے گی۔ اس کا گھر ان کا ہدف بن جائے گا جہاں منہ چھپائے واقعتہً میں موجود ہوں گا۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ ایک نہایت خلیق، اعلیٰ ظرف شخص، اپنے محسن کو کسی مصیبت سے دوچار کر دیا جائے۔ اکبر علی خاں کو تو اسی شہر میں رہنا ہے۔ اسے استاد میدا کے آدمیوں کی نظر میں نہیں آنا چاہیے۔

میرا سر پھٹا جا رہا تھا جتنا میں سوچتا، جدھر دیکھتا، اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا۔ اسپتال کے بستر پہ بے سدھ پڑے بٹھل کی تصویر میرے سینے، میری آنکھوں، میرے وجود میں سمائی ہوئی تھی۔ بار بار ہڑک سی اٹھتی تھی کہ بس اکبر علی خاں سے رسمی اجازت لے کے اس گھر سے نکل پڑوں۔ آگے جو ہوگا، دیکھا جائے گا، اور اسی لمحے یہ اندیشہ جسم جکڑ لیتا تھا کہ راستے بہت طویل نہ ہو جائے۔ راستوں کی طوالت، فاصلوں سے نہیں، راستوں کی نوعیت سے طے ہوتی رہے۔ راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو گئی تو اس کی بلندی کی انتہا کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ پھر اسی صلاح پر بات تمام ہو جاتی ہے کہ مجھے اکبر علی خاں سے گزارش کرنی چاہیے، وہ فی الفور ڈاک خانے جا کے کلکتے میں جامو کو تار دینے کی زحمت کرے۔ جب تک جامو وغیرہ یہاں آ نہ جائیں، مجھے اکبر علی خاں کے دولت کدے میں زندانی بن کے وقت کاٹنا ہے اور دیواروں سے سر پھوڑتے رہنا ہے۔ ادھر بٹھل کا کچھ بھی حال ہو، مگر میری حالت بھی اس سے کیا جدا ہے۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر ہے، میں بہ قائم ہوش و حواس یہاں بے دست و پا پڑا رہوں گا۔

''کیا سوچ رہے ہیں جناب!'' مجھے چپ دیکھ کے اکبر علی خاں نے تیکھے لہجے میں ٹوکا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں، میری مانیے تو مجھے پتا دیجیے۔ میں ڈاک خانے جا کے تار بھیج دیتا ہوں۔ جتنا تامل وتذبذب کیجیے گا۔ اتنی دیر ہوتی جائے گی۔ آج کل ان تاروں کا بھی کوئی بھروسا نہیں ہے۔ احتیاطاً میں ارجنٹ تار دوں گا اور وقفے وقفے سے دو مرتبہ۔ باہر نکلنے پر کچھ ادھر ادھر کی سن گن لینے کا بھی موقع ملے گا۔ دیکھتا ہوں، شہر میں اس واقعے کی کتنی گونج ہے اور زخمی ہو جانے والا آدمی کس حال میں ہے۔ بہت کچھ اس کی حالت پر بھی منحصر ہے۔ ہوسکتا ہے، ہم کچھ زیادہ ہی قیاس کر رہے ہوں اور باہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو۔ کاش کہ......''

دروازے سے برتنوں کے کھڑکنے کی آواز پر وہ رک گیا۔ سادہ ساڑی میں ملبوس، بوٹے قد، سانولی رنگت کی ایک نوجوان لڑکی ہاتھوں میں تشت اٹھائے، پلو سے آدھا گھونگھٹ کاڑھے ہوئے درّانا اندر آئی۔ گھبراہٹ میں پلو سر سے سرک گیا، وہ اور گھبرا گئی۔ دونوں ہاتھوں میں تشت تھا اور وہ پلو درست نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ملازمہ رابعہ ہی ہو سکتی تھی۔ ابھی وہ اندر داخل ہوئی تھی کہ ایک اور عورت نے کمرے میں قدم رکھا۔ میں اسے فوراً نہ پہچان سکا مگر وہ تو وہی ادھیڑ عورت تھی جو کچھ دیر پہلے دو لڑکیوں اور لڑکے زینی کے ساتھ چوکی پر بے حال بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور لگتا تھا جیسے اپنا سراپا ہی تبدیل کر لیا ہے۔ بادامی رنگت، متوازن قامت اور متوازن بدن، اطوار میں تمکنت، رفتار میں وقار، ناک میں لونگ، کانوں میں چھوٹے بندے، گلے میں چمپاکلی، کلائیاں سنہری چوڑیوں سے آراستہ تھیں۔ میں کرسی پر سیدھا ہو گیا۔ اس نے مجھے آداب کیا تو میرا جسم بل کھا گیا۔ ''یہ بیگم ہیں، نزہت خانم۔'' اکبر علی نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ یہاں کالج میں انگریزی ادب پڑھاتی ہیں اور علی گڑھ کی سند یافتہ ہیں۔''

میں نے کرسی سے اٹھ کے تعظیم دی۔ اس سے نگاہیں ملانے کی جرات نہیں ہو رہی تھی لیکن مجھے کچھ تو کہنا چاہیے تھا اور میں بہ مشکل کہہ سکا۔ ''میں بہت نادم ہوں، مجھے معاف کر دیجیے۔''

''نہیں نہیں، ایسا نہ کہیے۔'' نزہت خانم نے کھنکتی آواز میں شائستگی سے کہا۔ ''جو بیت گیا، اس کا کیا ملال اور اس کی کیا خوشی۔ وہ تو ماضی ہوا۔ اسے دہرانے سے کیا حاصل، اور خصوصاً جب کہ وہ ناخوش گوار بھی ہو۔'' اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

''ہاں ہاں، وہ تو کسی خواب کے مانند تھا۔'' اکبر علی خاں شگفتگی سے بولا۔ ''لیکن اس کی تعبیر بالکل مختلف ہے۔''

نزہت خانم کے چہرے پر آگ سی بھڑکی اور غالباً موضوع بدلنے کے لیے تشت کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے وہ زیرلبی سے بولی۔ ''آپ کچھ لیجیے نا۔''

''یہ آپ نے کیا تکلف کر لیا۔'' میں نے بوجھل آواز میں کہا۔

''کچھ نہیں ہے، سب ہلکا پھلکا ہے۔''

''یقین کیجیے۔'' میں نے عاجزی سے کہا ''بھوک ہی نہیں ہے۔'' میں نے اس سے سچ کہا تھا۔ میرا تو جی ہی لوٹ رہا تھا۔

''کوئی اصرار نہیں۔'' اکبر علی خاں نے میری مشکل حل کی۔ ''مگر یہ مشروب خاص۔ بیگم یہ ایک خاص شربت بناتی ہیں۔ آسانی کے لیے اسے لسی کہہ لیجیے، پوربی لسی یا بہاری لسی لیکن یہ لسی ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو بہت سے اجزا کا مجموعہ ہے۔ شاید آپ کو

پسند آئے۔" اس نے گلاس اٹھا کے میری جانب بڑھا دیا۔
انکار اب بدتمیزی کے زمرے میں آتا۔ میں نے گلاس لے لیا۔ ممکن ہے، جیسا کہ اکبر علی خاں دعویٰ کر رہا تھا، مشروب واقعی خوش ذائقہ ہو۔ ذائقے بھی طلب سے مشروط ہیں اور طلب جسم و جاں کی یک سوئی، بے حالی سے۔ میرا جسم جیسے کسی شکنجے میں کسا ہوا تھا، جیسے اندر سے کوئی نوچتا ہو۔ مجھ میں ذائقہ شناسی کی حس ہی نہیں رہی تھی۔ پہلا گھونٹ ہی حلق کا کانٹا ہوا گزرا۔ مزید چند گھونٹ زہر مار کر کے میں نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ "کیسا ہے؟" اکبر علی خاں نے حسرتی انداز میں پوچھا۔ "کچھ مرغوب ہوا؟"
"بہت عمدہ ہے۔" شاید مجھے یہی کہنا چاہیے تھا اور وہ دونوں یہی سننا چاہتے تھے۔ داد و ستائش کے طلب گار کو داد و ستائش ہی مطمئن کرتی ہے۔
"نزہت اس کی ماہر ہیں۔ ذرا وقت تو لگتا ہے لیکن یہ اسے تمام اہتمام سے بناتی ہیں۔ یہ ان کا اپنا وضع کیا ہوا عطر مجموعی یا مشروب بے شمار آتشہ ہے۔" وہ ہنس کے بولا اور اسے خیال آیا۔ اس نے مچلتے ہوئے اپنی بیگم سے پوچھا۔ "یہ اپنی جوہی اور یکتا کہاں رہ گئیں۔ ٹھیک تو ہیں وہ؟"
"آرام کر رہی ہیں۔ انہیں ابھی اندر ہی رہنے دیجیے۔" نزہت خانم نے دھیمے لہجے میں کہا۔
"کیوں، کیوں، کیا بات ہے؟"
"کچھ نہیں، کوئی خاص نہیں۔" نزہت خانم ایک نظر مجھے دیکھ کے جھجکتے ہوئے بولی۔ "بچیاں ہیں، ایڈجسٹ منٹ کے لیے کچھ وقت تو چاہیے۔"
"اوہ!" اکبر علی خاں کی پلکیں پھڑ پھڑانے لگیں۔ "اسی لیے تو میں انہیں یہاں بلانا چاہتا تھا۔"
"دیکھیے، کچھ دیر میں سہی۔" نزہت خانم نے یاسیت سے کہا۔

یہ سن کے مجھے جھٹکا سا لگا اور میرا سر جھک گیا۔ نزہت خانم کے لہجے میں شکایت نہاں تھی۔ واقعی دونوں لڑکیوں کی عمریں اتنی پختہ نہیں تھیں۔ میں اسی بات سے ڈر رہا تھا۔ اب میرا یہاں سے چلے جانا ہی مناسب تھا۔ اس گھر میں میرا وجود انہیں مضطرب کیے رکھے گا۔ کہتے ہیں، پہلا تاثر ہی آخری تاثر ہوتا ہے۔ بعض داغ مٹائے نہیں مٹتے۔ بعض لمحے نقش ہو جاتے ہیں، پتھروں پر کندہ لکیروں کی طرح۔
"یہ ہمارا گھر ہم دو میاں بیوی، دو بیٹیوں اور ایک بیٹے پر مشتمل ہے۔" اکبر علی خاں نے لہکتی آواز میں کہا۔ "شاید یہ آپ کو عام گھروں سے الگ نظر آئے، اور ہے بھی یہی سچ۔ ہم اپنی طرح سوچتے اور اپنے انداز کی زندگی گزارتے ہیں اور کسی دوسرے پر زور نہیں دیتے کہ ہماری روش ہی بہتر ہے۔ میں نے قانون کی تعلیم کے سلسلے میں تین سال انگلستان میں گزارے ہیں۔ نزہت بھی دو سال وہاں رہ کے آئی ہیں۔ انگلستان کے علاوہ ہم نے یورپ کے دوسرے ملک بھی دیکھے ہیں اور قریب سے۔ جیسا یہاں سمجھا جاتا ہے، وہاں ویسا بالکل نہیں ہے۔ یہاں کے لوگوں کو وہاں کے قمار خانے، مے خانے اور عشرت کدے ہی نظر آتے ہیں۔ وہاں علمی ادارے، کتب خانے اور تحقیقی مراکز بھی کثرت سے ہیں۔ وہاں کے علم و فضل، نظم و ضبط سے یہ لوگ قطعی بے خبر ہیں۔ شائستگی اور اخلاق، کاروبار میں دیانت، معاملات میں صاف اور کھرے، وقت کے پابند، وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ہم تو کہیں گم ہو گئے یا راستہ بھٹک گئے ہیں۔ انہوں نے خود کو دریافت کر لیا ہے اور ان کا یہ عمل جاری ہے۔ ہم ماضی میں زندہ رہتے ہیں، انہیں مستقبل کی فکر رہتی ہے۔ وہ گھٹے ہوئے نہیں رہتے، زندگی ڈھونڈتے ہیں۔ روایت پر اصرار، سہل پسندی ہے۔ یہاں ہمارے آس پاس کی بود و باش بڑی روایتی ہے۔ سو یہ لوگ ہم سے قریب

ہونے میں کتراتے ہیں حالاں کہ ہمیں معلوم ہے، انہیں بھی ہمارے طور طریقے پسند ہیں۔ معلوم نہیں، آپ کے کیا خیالات ہیں۔ آپ ہماری یہ روایت شکنی کس طرح دیکھیں مگر ایک گمان ہے۔ آپ بھی بہ قول آپ کے، جگہ جگہ گھومتے رہتے ہیں۔ سفر کرنے والے روایتوں کے معاملے میں اتنے شدید نہیں ہوتے۔ تعلق تو ہمارا بھی روایتی خاندانوں سے ہے لیکن ہم نئی لہروں، نئی چیزوں کو مشکوک نظروں سے نہیں دیکھتے۔ جو اچھا ہے، اس کے لیے دل کشادہ، جو غیر ضروری ہے، اسے ترک کر دینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔"
اکبر علی خاں اپنی رو میں مغرب کی اوصاف بیانی میں رطب اللسان رہا۔ اسے کچھ خیال نہیں تھا کہ میں کتنا سن رہا ہوں اور مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ کسی نے بھی کہا تھا کہ وکیل ہونے کی پہلی شرط شوق کلام ہے۔ نزہت خانم بھی بے آرام سی لگتی تھی۔ ہر چند اسے اپنے شوہر کی خوش گفتاری کا عادی ہونا چاہیے تھا۔ اسی نے قطع کلامی کی اور اندر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔
"ارے ہاں۔" اکبر علی خاں کی جیسے کسی نے چٹکی بھر لی ہو، وہ چونک پڑا اور اس نے مجھ سے معذرت کی۔ "کچھ احساس ہی نہیں رہا کہ بے موقع گفتگو، محض فضول گوئی ہے لیکن...... لیکن شاید ایک جواز بھی تھا۔ آپ یہاں قیام کریں تو آپ کو اس گھر اور گھر کے مکینوں سے تھوڑی بہت شناسائی ہو جائے، مابین کوئی اجنبیت نہ رہے۔" اس نے منتظر نزہت خانم سے کہا۔ "بابر میاں آج یہاں ہمارے گھر مہمان رہیں گے۔ اوپر کی منزل پر انتظام کرا دیجیے۔ ان حالات میں ان کا باہر نکلنا کسی صورت موزوں نہیں ہے۔ مجھے کچھ دیر کے لیے باہر جانا ہے، جلد واپسی ہو جائے گی۔ زینی سے کہیے کہ وہ مہمان کا خیال رکھے۔"
نزہت خانم نے متجسس آنکھوں سے یہ ہدایتیں

سنیں اور نپی تلی آواز میں بولی۔ "مناسب ہے، کوشش یہی ہو گی کہ مہمان کو کوئی شکایت نہ ہو۔" پھر اس نے میری طرف نگاہ کی۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو تکلف نہ کیجیے گا۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز قدموں سے دروازے کی طرف لوٹ گئی۔
"آپ یہاں بیٹھیے، زینی کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ میں بھی ذرا حلیہ ٹھیک کرنے کے لیے اندر جاتا ہوں۔" بیگم کے اوجھل ہو جانے کی دیر ہوئی کہ اکبر علی خاں ایک گوشے میں رکھی ہوئی میز پر گیا اور کاغذ قلم اٹھا کے میرے پاس لے آیا۔ "تار کے لیے آپ پیغام کا متن اور پتا لکھ دیجیے۔ میں تیار ہو کے ابھی آتا ہوں۔" اس چستی و مستعدی سے وہ اپنی طول کلامی کی تلافی کرنا چاہتا ہو گا۔
"یہ، یہ میدا استاد کا ٹھکانا کہاں ہے؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔ وہ دروازے کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ "کیوں، کیوں صاحب؟"
"آپ جانتے ہیں؟"
"جی، جی ہاں، میں کیا، سارا شہر جانتا ہے مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں میاں؟"
"یہاں سے کتنی دور ہے؟"
"زیادہ، زیادہ دور نہیں۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بیس پچیس منٹ پیدل کا راستہ ہو گا۔"
"میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔" میں نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا۔
"کیا، کیا، کہاں جائیں گے آپ؟ کیا آیا ہے آپ کے دماغ میں؟" اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ "میدا استاد کے ٹھکانے پر؟"
"جی ہاں۔"
"میدا استاد کے سامنے! آپ ہوش میں تو ہیں میاں؟ میں نے آپ کو بتایا ہے، وہ کیسا جنگلی آدمی ہے۔ وہاں، بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں آپ؟"

"میں آپ سے بالکل متفق نہیں، وہ بہت برے لوگ ہیں، بدترین لوگ۔ ان سے کسی بھلائی کی توقع فضول ہے۔"

"دیکھتے ہیں، ورنہ تو ویسے بھی......"

"ویسے بھی کیا؟" اس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ "یہ گھر آپ کے لیے بالکل محفوظ ہے۔ تار ملتے ہی آپ کے بھائی کی دیکھ بھال کے لیے کوئی نہ کوئی ضرور آجائے گا۔ ایک رات اور دن بھر کی بات ہے۔ حوصلہ رکھیے میاں! پٹنا میڈیکل کالج کا اسپتال علاج معالجے میں دور دور شہرت رکھتا ہے۔ وہ اپنی جانب سے کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر وہ وقت...... یہ ایک رات اور کل کا دن......" میری آواز ڈوبنے لگی اور میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مجھے اس کے پاس جانا ہی ہوگا۔"

"معاف کیجیے، آپ بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ وہاں جاکے ان بے دادگروں کے سامنے آپ دادفریاد کریں گے کیا؟ ان لوگوں کے آگے جو رحم وکرم نام کی کسی شے سے واقف نہیں۔"

"مگر وہ بھی آدمی ہیں۔"

"مگر کیسے آدمی، کیسے آدمی۔" وہ بھڑکتی آواز میں بولا۔ "ان کے آدمی نے آپ کا بٹوا چھریا۔ چاقو نکال کے وہی آپ پر حملہ آور ہوئے۔ انہی کے ایک آدمی کی غلطی یا نادانی کی وجہ سے ان کا دوسرا آدمی زخمی ہوا، اور ستم یہ کہ پولیس آپ ہی کی تلاش میں ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں۔"

"یہی کچھ اسے باور کرانا ہوگا۔"

"کسے؟ استاد میدا کو؟" اکبر علی خاں کے لہجے میں درشتی آ گئی۔ "اور آپ کے خیال میں وہ مان جائے گا؟ اچھا ٹھیک ہے۔ اگر وہ نہیں مانا؟ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

"مجھے راستہ بتائیے۔" میں کرسی سے اٹھ گیا۔

"کیا، کیا آپ واقعی؟ نہیں نہیں میاں۔"

"مجھے جانے دیجیے۔ آپ کا بہت احسان ہے، آپ اور آپ کے گھر والوں نے جس اعلیٰ ظرفی کا سلوک کیا ہے، میں اسے کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ موقع ملا تو ایک بار ضرور آپ کے پاس، آپ سب سے دست بستہ معافی مانگنے آؤں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میں آپ کو باہر جانے نہیں دوں گا۔" اس نے عزم سے کہا۔

"ازراہِ کرم مجھے اب مت روکیے۔"

"کیسے جانے دوں، میں آپ کو آگ کے حوالے کر دوں؟"

میں نے اپنا بیگ اٹھالیا اور باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ منع کرتا اور منتیں کرتا رہا۔ انکار کی شرمندگی سے بچنے کے لیے مجھے جلد از جلد باہر نکل جانا چاہیے تھا۔ میں نے لپک کے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے تقریباً جھپٹتا ہوا آیا اور ڈیوڑھی میں میرا بازو پکڑ لیا۔ "یہ آپ کے سر میں کیا سودا سمایا ہے؟ ایک تو وہاں تک آپ کا پہنچنا ہی مشکل ہے۔ راستے میں پولیس کی نظروں میں آ گئے یا اس بدبخت کے آدمیوں کی......"

"وہ مجھے نہیں روکیں گے۔" میں نے وثوق سے کہا۔ "میں انہیں بتاؤں گا کہ میں میدا استاد کے پاس جا رہا ہوں تو وہ مجھے نہیں روکیں گے بلکہ میدا تک پہنچانے میں میری مدد کریں گے۔ ان کی نظروں میں، میں میدا کا مجرم ہوں۔ وہ تو اس عجوبے پر خوشی کا اظہار کریں گے کہ میں خود کو میدا کی عدالت میں پیش کر رہا ہوں۔ میدا کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے مجھے اس کے روبہ رو کر دینے کی انہیں بے چینی ہوگی۔"

"گویا آپ نے طے کر لیا ہے۔" اس کے شانے لٹک گئے، آواز بھی۔

"میرا اسپتال جانا ضروری ہے۔ میں ا[illegible]

بھائی کو ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے، اس طرح آپ کو اسپتال میں داخلے کی اجازت مل جائے گی؟ میں نے آپ سے کہا ہے میاں کہ میں آپ کے بھائی کی پرسش کے لیے اسپتال چلا جاتا ہوں۔"

"کاش یہ ممکن ہوگا۔"

"یہ ممکن کیوں نہیں ہے؟"

"حیرت ہے، آپ کی نگاہ امکانی نتائج پر کیوں نہیں گئی؟ بٹھل بھائی کے پاس آپ کے چلے جانے سے مراد ہے، اپنے گھر کی نشان دہی کرنا۔ وہ آسانی سے پھر آپ کے گھر پہنچ سکتے ہیں، جہاں میں روپوش ہوں گا۔"

"یہ کیسے؟ مجھے سمجھائیے۔" وہ جز بز ہونے لگا اور میری کسی تشریح سے پہلے ہاتھ بلند کر کے ہیجانی انداز میں بولا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ ممکن ہے، قطعی ممکن ہے۔ واقعی یہ پہلو میری نظر سے دور رہا مگر...... مگر اس کے باوجود میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا کہ آپ استاد میدا کے ٹھکانے کا رخ کریں۔"

"میں نے ارادہ کر لیا ہے۔" اپنے لہجے کی مغائرت نے خود مجھے آزردہ کیا۔

وہ میری شکل دیکھا کیا اور مایوسی سے بولا۔ "ٹھیک ہے میاں۔ آپ پر میرا کوئی حکم تو نہیں چلتا۔"

"ایسا مت کہیے۔ میں نے آپ جیسے دردمند اور صاحب دل کم دیکھے ہیں۔"

"پھر بھی آپ میری بات نہیں مان رہے۔"

"مجھ سے اب کچھ مت کہیے۔ میری گزارش ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ اکڑی ہوئی آواز میں بولا۔ "پھر ٹھہریے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

"آپ! آپ میرے ساتھ چلیں گے؟" میرا سارا وجود سٹ پٹا گیا۔ "نہیں نہیں۔" میں نے شدت سے انکار کر دیا۔

"کیوں نہیں، میں آپ کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں؟"

"وہاں آپ کا جانا مناسب نہیں ہے۔"

"جو میرے لیے مناسب نہیں ہے، آپ کے لیے بھی نہیں ہو سکتا لیکن آپ نے ٹھان ہی لی ہے تو مجھے بھی ساتھ رکھیے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے اندر چلیے۔ میں جوتے پہن کر آتا ہوں۔"

"میری خاطر آپ کیوں جوکھم میں پڑتے ہیں۔ آپ کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ آپ کو ان لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔"

"مجھے نہیں آنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں لیکن جب آپ ہمت کر سکتے ہیں تو میں بھی کچھ حوصلہ کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں۔ چلیے، اندر چلیے، میں تیار ہو کے آتا ہوں۔"

مزید حجت، تکرار، وضع ومروت کے منافی تھی۔ مروت بڑی زنجیر ہے۔ بادل نخواستہ مجھے دوبارہ اندر آنا پڑا۔ وہ عجب قماش کے آدمی تھے۔ ان کا اصرار میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ آدمیوں کی بھی ہزار قسمیں ہوتی ہیں۔ مجھے کرسی پر بٹھا کے وہ فوراً ہی اندر چلے گئے۔ میرے پاس وقت تھا کہ میں چپکے سے نکل کھڑا ہوں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اس طرح بھاگ جانا مجھے اچھا نہیں لگا اور وہ میری توقع سے کم وقت میں واپس آ گئے۔ ایسے طرح دار، صاحب وضع، ایسے بانکے شخص کی قدر منزلت مجھ پر کیا، کسی پر بھی واجب ہو جاتی۔

انہوں نے سلیٹی رنگ کی شیروانی پہن لی تھی۔ مستزاد سلیم شاہی جوتی۔ سر پہ دوپلی ٹوپی تھی۔ اس وضع قطع میں وہ بالکل مختلف نظر آ رہے تھے۔ جیسے کسی تقریب میں شرکت کے لیے جا رہے ہوں۔ ممکن ہے، باہر جاتے وقت ان کا یہی حلیہ ہوتا ہو۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس اہتمام کے معنی بھی

کسی قدر سمجھ میں آرہے تھے۔ بہر حال وہ ایک جامہ زیب شخص تھے اور اس لباس میں تو ان کی شخصیت اور پر وقار ہوگئی تھی۔ ''چلیے صاحب!'' ان کی آواز میں مضبوطی تھی، ایسی استواری جو ہر قسم کے ایثار پر آمادگی کے بعد ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

ہم ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے گلی میں آ گئے۔ ڈیوڑھی سے باہر آ کے وہ ٹھہر گئے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ کیوں نہ میں اپنا بیگ گھر میں چھوڑ دوں، اور مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے میری کمر پہ ہاتھ رکھا اور آگے چل پڑے۔ گلی نسبتۂ چوڑی تھی۔ راہ گیروں کی تعداد بھی کم تھی۔ جس سمت سے میں یہاں آیا تھا، اکبر علی خاں اس کی مخالف سمت جا رہے تھے۔ ان کی رفتار تیز تھی نہ دھیمی۔ گلی میں ملنے والے اکا دکا راہ گیروں نے انہیں سلام کیا۔ وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے ہوئے بڑھتے رہے۔ ان کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے مجھے اپنی حیثیت کسی معمول کی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ یوں بھی شناسا راستوں میں راہ گیر کا تیور ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ لمبی گلی پار کر کے ہم ایک کشادہ سڑک پر آ گئے۔ سڑک کے کنارے قطار سے چند تانگے خالی کھڑے تھے۔ کچھ کہے سنے بغیر وہ پہلے تانگے پر بیٹھ گئے۔

استاد میدا کا پتا بتانے پر خستہ حال، عمر رسیدہ کوچوان کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے لیکن وہ بڑبڑا کے رہ گیا اور چابک بلند کر کے اونگھتا ہوا گھوڑا بیدار کیا۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے دونوں اطراف مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس طرف بھیڑ بھی زیادہ تھی۔ اکبر علی خاں نے دیر تک مجھ سے کلام نہیں کیا۔ میں بھی چپ رہا۔ خاصا راستہ خیریت سے گزر گیا لیکن کچھ اور آگے جا کے بائیں جانب جیسے ہی تانگا ایک دوسری سڑک میں داخل ہوا، اس کی رفتار پہلے جیسی نہ رہی۔ تانگے والا چڑچڑانے لگا۔ اکبر علی خاں کے استفسار پر اس نے بتایا کہ دوپہر سے پولیس کسی مجرم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اکبر علی خاں نے بھی کرید نہیں کی۔ ہم دونوں پچھلی نشست پر بیٹھے تھے اس لیے صرف گزرتا ہوا راستہ ہی نظر آتا تھا۔ تانگے نے کچھ اور فاصلہ طے کیا تھا کہ اسے رک جانا پڑا۔ میں نے اچک کے دیکھا اور ایک لمحے میں سارا منظر عیاں ہو گیا۔ آگے مختلف سواریوں کے پار پولیس تھی۔ وہ ہر سواری اور پیدل راہ گیر کا جائزہ لے کے آگے جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ اکبر علی خاں کی معنی خیز نظریں مجھ پر منڈلانے لگیں اور میرے سکوت و سکون سے وہ مطمئن ہو گئے۔ ہم تانگے سے اتر کے پیدل واپس ہو سکتے تھے لیکن نہ انہوں نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر کیا نہ میں نے۔ آنے والے وقت سے نبرد آزمائی کے لیے میری طرح انہوں نے بھی خود کو جکڑ کے رکھا ہوگا۔ تانگا تقریباً کھسکتا ہوا پولیس کے قریب پہنچ گیا۔

دھوپ میں سہ پہر کی زردی شامل ہو چکی تھی۔ پولیس کے کئی اہل کار وہاں موجود تھے۔ انہوں نے معاندانہ انداز میں ہم دونوں کو نگاہوں میں تولا اور کوئی سوال جواب کیے بغیر ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے اپنا بیگ نشست کے نچلے حصے میں ڈال دیا تھا۔ تانگے کا یہ حصہ مختصر پردے سے ڈھکا ہوا تھا۔ بیگ بھی میری ایک نشانی تھا۔ اکبر علی خاں کے گھر میں پناہ حاصل کرنے سے پہلے ارد گرد کی گلیوں میں گھومتے ہوئے بہت سے راہ گیروں نے مجھے بیگ کے ساتھ دیکھا تھا۔ پولیس اہل کار تھک گئے تھے یا ان کی توجہ اکبر علی خاں کی سحر انگیز شخصیت ہی پر مرکوز رہی یا انہیں میری شکل اور ہونے والے واقعے میں کوئی نسبت دکھائی نہیں دی۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے، تانگا اس مرحلے سے بہ خیر و خوبی گزر گیا۔

کچھ دور بعد تانگا ایک گنجان علاقے میں داخل ہو گیا۔ قریب ہی چوراہا تھا۔ وہاں چاروں طرف دو

تین منزلہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ فرشی منزلیں تمام کی تمام چھوٹی بڑی دکانوں، چائے خانوں، اشیائے خورد و نوش، بساطیوں اور پان بیڑی کی دکانوں پر مشتمل تھیں۔ وہیں کسی نے مجھے پہچان لیا۔ وہ ڈاک خانے کی گلی کا کوئی عینی شاہد ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے دوسرے، دوسرے نے تیسرے کو اشارہ کیا۔ دیکھتے دیکھتے ان کی وحشت فزوں ہوتی گئی اور شور مچنے لگا۔ ان کے اشاروں کنایوں اور غل غپاڑے سے اکبر علی خاں کو بھی اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ میں پہچان لیا گیا ہوں اور بات کتنی آگے جا چکی ہے۔ حیرت انگیز طور پر ان کا سراپا کھنچا اور تنا ہوا رہا۔ تانگے والا خاصا سراسیمہ ہو چکا تھا، بار بار پیچھے مڑ کے دیکھتا، کبھی انہیں، کبھی ہمیں۔ چوراہے سے چند قدم کی دوری پر تانگے کے پیچھے پیدل اور سائکل سواروں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ ہمیں نگاہوں میں رکھے تانگے کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور شور مچاتے رہے۔ ان میں سے کوئی بھی قریب یا سامنے آنے اور ہم سے باز پرس کرنے کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا۔ ہمارے سکون نے شاید انہیں باندھے رکھا تھا۔ میں نے اپنے ہوش و حواس متوازن رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ایک اور موڑ پر آ کے تانگا رک گیا۔ پختہ گندمی رنگت اور نیم پختہ عمر کے ایک پستہ قد، گراں ڈیل شخص نے اچانک سامنے آ کے دائیں جانب سے تانگے کا بم پکڑ لیا۔ وہ بم سے تقریباً جھول گیا تھا۔ موڑ کاٹنے کی وجہ سے تانگے کی رفتار بے حد سست تھی۔ تانگے نے کئی جھٹکے کھائے، گھوڑا ہنہنانے، کوچوان چیخنے لگا۔ ''کدھر جئی ہو؟'' تانگے کو روکنے والے شخص نے دہاڑتے ہوئے پوچھا۔

کوچوان اور میرے بجائے اکبر علی خاں نے جلدی سے جواب دیا۔ ''استاد میدا کے پاس۔ ہمیں ان سے ملنا ہے۔'' ان کی آواز سنسنا رہی تھی۔

''ای ہی ہیں او، بیرو بھیا!'' تانگے کے پیچھے بڑھتے ہوئے ہجوم میں سے کسی نے ہانک لگائی۔

''ہم بھی سمجھ لیت ہیں۔'' گینڈے جیسے جسم والے بیرو نامی شخص نے نخوت سے کہا۔ ''اچھا ہو یو، جو خود ہی ادھر آ گیو۔''

یہ سنتے ہی تانگے سے چھلانگ لگا کے میں سڑک پر آ گیا۔

''ہاں یہ میں ہی ہوں۔'' میں نے بلند آواز سے کہا تو مجمع پر سناٹا چھا گیا اور لمحے بھر میں بھن بھناہٹ میں بدل دیا گیا۔ اس دم اکبر علی خاں نے تانگے سے اتر کے زور سے میرا بازو تھام لیا۔

''یہ میں ہی ہوں، اچھی طرح دیکھ لو۔'' میں نے اپنی آواز قابو میں کی اور سرد لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے استاد، پٹنا شہر کے راجا استاد میدا کو دیکھنے آیا ہوں۔''

''استاد میدا کو وو......؟'' بیرو خالص پوربی لہجے میں 'کو' کو کھینچ کے اور بپھر کے بولا۔

''ہاں اسی کو۔ اسے میری تلاش ہے نا۔ تو میں خود اس کے پاس آ گیا ہوں۔ اسی سے تھوڑی بات کرنی ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو یا اسے ادھر لے آؤ۔ فیصلہ کہیں بھی ہو سکتا ہے۔''

اکبر علی خاں نے مجھے جھنجوڑا۔ ''میاں، میاں۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولے۔ ''یہ آپ کیا پاگل پنا کر رہے ہیں۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھال کے، دیکھتے نہیں، ہم کہاں ہیں۔''

میں نے آنکھیں بھینچ کے انہیں خاموش رہنے کی تاکید کی۔ بیرو نامی شخص کی آنکھیں ابل پڑی تھیں، چہرے پر آگ سی بھڑکنے لگی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ مجھ پر جھپٹ پڑتا لیکن وہ ٹھہرا رہا اور پھنکارتی آواز میں بولا۔ ''فیصلہ کرنا ہے؟ پہلے تو ہم تمرے آگے کھڑے ہیں۔''

''تم سے کیا بات کریں۔ تم سے اپنا کوئی بیر نہیں ہے اور تم ایسا چاہتے ہو تو تسلی رکھو۔ تمہاری حسرت بھی نکال دیں گے۔ ادھر ڈاک خانے کی گلی

میں استاد کے تین آدمی دیکھے ہیں، تم کو بھی دیکھ لیں گے۔ پہلے اپنے استاد سے پوچھ کے آؤ۔ بعد کو اسے کوئی شکایت نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

میں نے اچھی طرح بیرو کی قسم کا تخمینہ کرلیا تھا۔ وہ اڈے ہی سے متعلق آدمی تھا لیکن کچھ لوگوں کی اڈے سے وابستگی اپنے تن وتوش، استاد کی خدمت، مخبری کے کام وغیرہ سے بھی گہری ہوتی ہے۔ بیرو انھی لوگوں میں سے کوئی ایک تھا۔ چاقو بازی میں، ہوسکتا ہے، کبھی کوئی درک رکھتا ہو لیکن اس کا بھاری جثہ اب چاقو بازی کے لیے لازم مستعدی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اتنی دیر میں تین اور آدمی سامنے گلی کے اندرونی حصے سے لپکتے بلکہ بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ وہ صاف اڈے کے آدمی تھے۔ انہوں نے قریب آکے ہمارا تانگا، تانگے کے پیچھے ازدحام اور اپنے ساتھی بیرو کا غضب آلودہ چہرہ دیکھا تو حیران وپریشان ہوئے۔ بیرو بری طرح بھنایا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے گالیاں اُمڈ پڑیں اور گالیوں کے دوران اس نے ان تینوں کو میرے بارے میں بتایا۔ تینوں کو پہلے یقین ہی نہیں آیا۔ پھر ان کی آنکھیں انگارا ہونے لگیں لیکن انہوں نے بیرو کے شانے تھپ تھپا کے اسے پرسکون رہنے کا درس دیا۔ بیرو پیر پٹخنے لگا۔ ان میں سے ایک، زیادہ عمر کے آدمی نے بیرو کا واویلا نظرانداز کرکے حقارت سے مجھے مخاطب کیا ''تو تم ہواو؟''

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

''کا تم اپنے استاد سے ملیو؟''

''ہاں۔'' میں نے تندی سے کہا۔ ''اسی لیے ادھر آیا ہوں۔''

''کاہے کو؟'' اس نے حاکمانہ لہجے میں پوچھا۔

''اسی سے بات کرنی ہے۔''

''ہم کو نا بولیو؟''

''تم اڈے کے مالک ہو کیا؟''

''اور استاد نا ہی مانن تو......؟''

''مان لیں گے۔'' میں نے یقین ظاہر کیا۔ ''مان لیں گے۔ وہ اڈے کی چوکی پر بیٹھے ہیں، اور نہیں مانیں تو ہمیں آکے جواب دو۔ پھر ہم دیکھیں گے۔''

''کا؟ کا دیکھیو؟'' وہ برہمی سے بولا۔

''تمہیں کیا بتائیں۔ اچھا ہے، تم جاکے استاد کو بتاؤ اور وقت برباد مت کرو۔'' میں نے بے اعتنائی سے کہا۔

مجھے اندازہ تھا کہ اڈے سے استفسار کے لیے آنے والے کسی بھی شخص کو صورت حال سمجھنے، اپنے ساتھیوں اور شور مچانے والے لوگوں پر اپنا بھرم قائم رکھنے، مجھے پرکھنے اور خود اپنی تشفی کے لیے کچھ ہی نوعیت کی حجت کرنی چاہیے گا۔ وہ اڈے کا کوئی معتبر، معتمد آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اسے بھی بہرحال اپنے استاد کی خدمت میں مجھے پیش کرنے کی بے قراری ہوگی اور مجھ سے بات زیادہ بڑھ جانے کی صورت میں استاد کی ناراضی کا خدشہ الگ ہوگا لیکن یوں مجھے اچانک سامنے دیکھ کے اور میرا مطالبہ سن کے اسے فوراً ہامی بھی نہیں بھر لینی چاہیے تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں ساتھی دخل اندازی کے لیے پھڑک رہے تھے۔ بیرو بھی پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ کسی وجہ سے وہ خود پر جبر کیے ہوئے تھے اور وجہ ایک ہی ہوسکتی تھی کہ اپنے نسبتہً معمر ساتھی کا پاس خاطر مانع تھا۔ معمر ساتھی، استاد میدا کا کوئی مقرب خاص ہوگا یا کوئی مشاق، زور آور اور صاحب الرائے آدمی۔ اس میں کسی حد تک سنجیدگی تھی۔ سنجیدگی اور بردباری کی بھی اپنی ایک فضلیت ہے۔ میں نے استاد میدا کے سوا کسی اور سے بات کرنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ میرا عزم، میرے لہجے کی پختگی سے عیاں تھا۔ اس نے مزید تکرار سے اجتناب کیا، ہنکاری بھر کے جلی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ جاکے مالک کو بولت ہیں۔ لگے ہے، تمرے کو سامنے دیکھ کے اوکو خوشی ہووے گی۔''

میں نے اپنی زبان بند رکھی۔ اکبر علی خاں کے چہرے پر رنگ آرہے، رنگ جارہے تھے۔ میرے اشارے پر وہ بدحواسی سے تانگے پر سوار ہوگئے، پھر میں بھی۔ اگلی نشست پر ان میں سے دو آدمی کوچوان کے برابر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی تانگے نے حرکت کی، پیچھے ہجوم کا شور بڑھ گیا۔ وہ جو کہتے ہیں، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ گلی میں کچھ دور جاکے مکانوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور گنجانی بھی کم ہوگئی۔ گلی کا یہ حصہ کچھ چوڑا تھا۔ دونوں اطراف ونچے نیچے، کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے اور ن کے دروازوں، چھتوں اور کھڑکیوں پر لوگ جمع وچکے تھے۔ ہمیں بہت آگے جانا نہیں پڑا۔ ادھر دھر پھیلی ہوئی چھوٹی لال اینٹوں سے چنی ہوئی یوار کے بیچ میں بنے لکڑی کے ایک بلند اور وسیع باٹک کے سامنے تانگا ٹھیر گیا۔ پھاٹک کے دونوں رف کی دیواروں میں درمیانے سائز کی کھڑکیاں ہوئی تھیں۔ دیوار سے ملحق کمروں کی کھڑکیاں ہی سکتی تھیں۔ کھڑکیوں کے اوپر روشن دان تھے۔ ٹوں کی بوسیدہ اونچی دیوار، قدیم طرز کی کھڑکیوں رچھت کی منڈیروں کے نیچے روشن دانوں سے ی جیل کا گمان ہوتا تھا۔ پھاٹک کے دائیں بائیں بوار کے ساتھ کوئی سات آٹھ گز لمبے، گز، سوا گز ڑے چبوتروں پر اڈے کے آدمی مضطربانہ ہماری ف دیکھ رہے تھے۔ ہمارے تانگے کی آمد پر وہ تروں سے کود پڑے اور انہوں نے تانگا گھیر لیا۔ دہ عمر کا آدمی تیزی سے تانگے سے اتر کے کسی، کچھ کلام کیے بغیر سیدھا پھاٹک کے کھلے بغلی ازے میں داخل ہوگیا۔ ہجوم کچھ فاصلے پر آکے رگیا تھا اور اس کا شور بھی کم ہوگیا تھا۔ پھاٹک باہر موجود اڈے کے آدمی اصل معاملہ جاننے لیے وحشت زدہ ہوں گے۔ تانگے میں بیٹھا راآدمی بھی اتر گیا اور اس نے سرگوشیانہ انداز میں انہیں کچھ بتایا تو سب کی نگاہیں ہمی پر مرکوز ہوگئیں۔

اکبر علی خاں اور میں تانگے میں بیٹھے رہے۔ یہ وقت مجھ پر تو جیسا گزر رہا تھا، گزر ہی رہا تھا۔ اکبر علی خاں شاید پچھتا رہے ہوں کہ انہوں نے میری ہم رکابی پر کیوں اصرار کیا تھا۔ ہر طرف لوگ ہمی کو گھور رہے تھے۔ یہ نگاہوں کا شکنجہ یا آنکھوں کا حصار بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ اڈے کے آدمیوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہم پر ٹوٹ پڑیں۔

یہ شبہ اب محض شبہ نہیں رہا تھا کہ زخمی ہوجانے والے آدمی کی حالت یا تو زیادہ خراب ہے یا وہ ختم ہوگیا ہے۔ کوئی معمولی قسم کا زخم ہوتا تو ہجوم کی کیفیت ایسی اضطراری نہ ہوتی۔ معمر آدمی کو واپسی میں دیر لگ گئی۔ یہ تاخیر میرے لیے تشویش کا باعث ہونی چاہیئے تھی۔ اکبر علی خاں بھی بے دم سے بیٹھے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ معمر آدمی کے ساتھ میں بھی تانگے سے اتر کے اس کے پیچھے چل پڑتا۔ اس نے مجھ سے انتظار کرنے کو کہا بھی نہیں تھا، نہ اپنے ساتھ اندر چلنے کا کوئی عندیہ دیا تھا۔ میں خود ہی ٹھیر گیا تھا۔ اندر یا تو میدا سے اس کی ملاقات فوراً نہ ہوسکی یا وہ میرے بارے میں اپنا رویہ معین کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے باہم مشورت میں مصروف ہوں گے۔ انتظار کرانے کی یہ حکمت دانستہ بھی ہوسکتی تھی، اپنا اثر وتسلط قائم کرنے کی ایک کوشش، منتظر شخص کے اعصاب اور حواس کی آزمائش اور یوں اسے نفسی طور پر پس پا کرنے کی تدبیر۔ تانگے سے اتر کے پھاٹک کے بغلی دروازے سے سیدھے اندر چلے جانے کی جسارت اب قرین عقل نہیں تھی۔ جلد یا بدیر کسی کو بہرحال اندر سے آنا تھا اور مجھے انتظار کرتے رہنا تھا۔

پندرہ منٹ گزرے ہوں گے یا بیس۔ میرے لیے تو یہ وقت بہت طویل تھا۔ اندر سے وہی شخص

نمودار ہو اور اس نے قریب آنے کے بجائے پھاٹک کا دروازے پر کھڑے کھڑے جھڑکتے انداز میں ہاتھ ہلا کے مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ دعوت کیا، حکم دیا۔ میں نے اکبر علی خاں کو سوال طلب نظروں سے دیکھا کہ وہ میرے ساتھ اندر چلنے کے لیے آمادہ ہیں یا تانگے میں ٹھیرے رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی، وہ میرے ساتھ ہی تانگے سے اتر پڑے۔ میرے اندر چلے جانے کے بعد ان کا باہر ٹھیرے رہنا مناسب بھی نہیں تھا۔ اتنے لوگوں کی موجودی میں تنہائی اور کشاکش ان پر بڑی گراں گزرتی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ پھاٹک کے اندر قدم رکھا۔

پھاٹک کا اندرونی حصہ کسی ڈیوڑھی کے مانند تھا۔ اندر یہ ڈیوڑھی پھاٹک کے طول و عرض سے کہیں زیادہ کشادہ تھی۔ دائیں بائیں دو کمروں کے مساوی چھت سے ڈھکی ہوئی جگہ بھی اس میں شامل ہوگئی تھی۔ یہاں چارپائیاں بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں گھڑونچی پر گھڑے رکھے ہوئے تھے اور پانی پینے کے لیے کلھڑ یا مٹی کے آب خورے۔ دیواروں میں جابجا بنی طاقوں میں طرح طرح کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ فرش صاف ستھرا تھا۔ پھاٹک کے سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا اور خاصی دور تک کچی زمین دکھائی دیتی تھی اور کہیں کہیں سبزہ بھی اگا ہوا تھا۔ تیز قدموں سے ہم نے معمر آدمی کی پے روی میں پھاٹک کا اندرونی حصہ عبور کیا اور اینٹوں سے استوار گزرگاہ پر آ گئے۔ گزرگاہ دائیں طرف مڑ جاتی تھی اور بیس پچیس گز کے فاصلے پر قدیم طرز کی ایک چوکور عمارت پر تمام ہو جاتی تھی۔

جیسا کہ میرا قیاس تھا، اندر، گلی کے ساتھ اٹھی ہوئی دیوار سے پیوست کوٹھیوں جیسے کمرے تعمیر کیے گئے تھے۔ عمارت اور ان کمروں کے سامنے کھلی جگہ وافر تھی۔ اسے چھوٹا میدان بھی کہا جا سکتا ہے۔ میدان کے ایک گوشے میں روایتی اکھاڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ارد گرد مگدر، ڈمبلز، وزن اٹھانے، بل کرنے، الٹا لٹکنے اور بازو بنانے کے ساز و سامان کچھ زمین میں نصب، کچھ ادھر ادھر پڑا ہوا تھا۔ گلی کی دیوار کے سوا چار دیواری کی۔۔۔ باقی تین اطراف کی دیواروں سے آگے قریب قریب بلند اور گنجان درخت ایستادہ تھے۔ یہ درخت بھی کسی فصیل کی طرح تھے۔ پھاٹک کے دائیں جانب واقع عمارت، چار دیواری کے رقبے کے اعتبار سے چھوٹی لیکن یوں بہت بڑی تھی۔ رنگ روغن پرانا ہو چکا تھا۔ چھت کے کنگورے آدھے سالم، آدھے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ ساری عمارت اونچے اور موٹے موٹے ستونوں پر ٹکی ہوئی تھی اور کسی قدر اونچائی پر تھی۔ اندر تہ خانہ ضرور ہوگا۔ ممکن ہے، کبھی کسی صاحب ثروت، کشادہ دل کی حویلی رہی ہو اور اس نے اڈے کے کسی استاد کے کارنامے پر خوش ہو کے دان کر دی ہو اور اڈے کے آدمی بعد میں اپنی ضرورت کے مطابق اکھاڑ پچھاڑ کرتے رہے ہوں۔ میں نے اڈے کی کوئی ایسی عمارت کبھی نہیں دیکھی تھی۔

گزرگاہ ختم ہونے پر چند قدم کا زینہ طے کر کے عمارت کا منقش، سال خوردہ چوبی دروازہ تھا۔ دروازے پر لوہے کے کڑے نصب تھے اور ڈھلی ہوئی نوکیں۔ شاید عرصے سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ لکڑی خاک دھول میں اٹی، فرش میں دھنسی ہوئی تھی۔ دروازہ ایک چوڑی اور روشن راہ داری میں کھلتا تھا۔ ایک نظر میں سارا نقشہ سمجھ میں آ گیا۔ آمنے سامنے اور دائیں بائیں چلتی ہوئی راہ داری چار حصوں میں عمارت تقسیم کر دیتی تھی۔ چاروں طرف بھی اسی طرح کے دروازے ہوں گے۔ عمارت کے دوسرے سرے پر سامنے کا دروازہ تو نظر آ ہی رہا تھا۔ وہ بھی چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ کچھ دور بعد راہ داری، ایک بڑے صحن میں ختم ہو کے، صحن کے اسی سیدھ میں دوبارہ شروع ہو جاتی تھی اور مقا

دروازے تک جاتی تھی۔ صحن میں پیلی دھوپ کی روشنی افراط سے تھی۔ اس کے اطراف محراب دار دالانوں کا سلسلہ تھا۔ ان کے پیچھے کمرے تھے۔ ستونوں اور محرابوں سے بیلیں لپٹی ہوئی تھیں، انہیں تراشا نہیں جاتا تھا اس لیے خود پر بار لگتی تھیں اور چھت پر چڑھ گئی تھیں۔ عمارت اندر سے اتنی شکستہ نہیں تھی جتنی باہر سے دکھائی دیتی تھی۔ اندر زندگی رواں دواں تھی۔ اڈے کے کئی آدمیوں سے پہلے تو گزرگاہ ہی میں سامنا ہوا تھا، پھر راہ داری میں بہت سے بے تابانہ ہمارے منتظر تھے۔ ہمیں اندر کی جانب بڑھتا دیکھ کے سمٹنے لگے۔ گلی سے بھی کچھ لوگ ہمارے ساتھ پھاٹک میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے اور اکبر علی خاں نے پیچھے مڑ کے ان کی تعداد جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی چاپوں اور سرگوشیوں سے ایک اندازہ ہی کیا جاسکتا تھا۔

راہ داری سے گزرتے ہوئے لگ رہا تھا جیسے ہم اڈے کے استاد کے سامنے نہیں، کسی سردار کے دربار میں جارہے ہوں۔ راہ داری سے صحن اور صحن کے پار سیدھے ہاتھ کی جانب دالان کے پاس آ کے معمر آدمی پلٹ گیا اور اس نے ہاتھ اٹھا کے عقب میں آنے والے آدمیوں کو روکا اور قریباً سہ گزی چوڑے دالان سے گزر کے پہلے پڑنے والے کمرے میں داخل ہوگیا۔

عمارت کتنی ہی مختلف ہو مگر یہ جگہ کسی اڈے کی بیٹھک ہی تھی، کسی وسیع ہال کے مانند وسیع و عریض کمرا۔ ہر طرف رنگ برنگے شیشوں کی کھڑکیاں، دیواریں گل بوٹوں سے مرصع۔ نقاشی و مینا کاری زوال آمادہ ہوں تو دید باز کا جسم اینٹھنے لگتا ہے۔ دیواروں پہ کندہ گل بوٹوں کو بھی ایک آب یا دی چاہیے۔ کسی وقت یہ کمرا شیش محل جیسا کوئی دیوان خانہ ہوگا۔ ستاروں کی طرح چھت اور دیواروں پر جڑے بیش تر آئینہ پارے اپنی جگہیں ترک کرچکے تھے۔ درمیان کی کشادہ جگہ کے بعد، دروازے کے عین مقابل، دیوار کے وسط میں ایک کم قامت مگر بڑی چوکی پر چند آدمیوں کے ساتھ گاؤ تکیے سے کمر ٹکائے جو شخص سب سے نمایاں نظر آرہا تھا، وہی استاد میدا ہوسکتا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو اطراف بھی دیواروں سے پیوست، چوڑائی میں مختصر چوکیوں اور درمیانی فرش کے کھلے حصے پر پہلے سے بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت سے ہمارے ساتھ آئے تھے۔ سب کی نگاہیں ہم دونوں پر مرکوز تھیں۔ ان کے چہروں پر چھایا اضطراب درون خانہ کیفیات کا غماز تھا۔ سرگوشیوں کی ایک گونج کمرے میں منڈلا رہی تھی۔ ہمیں بڑھتا دیکھ کے فرش پر بیٹھے لوگ ادھر ادھر سمٹتے گئے۔ سامنے کی بڑی چوکی سے کوئی دو گز کے فاصلے پر ہم ٹھیر گئے۔

درمیان میں بیٹھے ہوئے آدمی نے ہمارے اتنے قریب آجانے اور ٹھیر جانے پر پہلو بدل کے حقے کی نے منہ سے لگائی۔ ایک اضطراری نظر آس پاس موجود لوگوں پر ڈالی اور خاموش رہا۔ اس کا قد متوازن، جسم ٹھکا اور گٹھا ہوا تھا، تانبے جیسی رنگت، گول چہرہ، نقش و نگار بھرے ہوئے، سر کے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی کی آمیزش، گھنے اور گھنگھریالے، روغن آلود اور سلیقے سے پیچھے کی طرف کڑھے ہوئے، تنگ پیشانی، اتنی تنگ بھی نہیں۔ مٹیالی رنگت کے باریک سلکی کرتے اور چھوٹی مہری کے سفید پاجامے میں ملبوس۔ باریک کرتے سے اندر پہنی سفید بنڈی جھلک رہی تھی۔ گلے میں تسبیح کے دانوں سے مشابہ نیلے پتھروں کی مالا، دائیں کلائی میں چاندی کی مختصر دریا، چہرے پر سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں، گہری، کسی قدر اندر دھنسی ہوئیں اور بے حد چمک دار۔ دیدے متحرک تھے۔ خوب چاق چوبند، چالیس پینتالیس عمر ہوگی۔ اپنی ظاہری وضع قطع سے وہ اڈے کے دادا کے بجائے کوئی مستعد، اپنے گاہک دور سے بھانپ لینے والا دکان دار معلوم ہوتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ یا اس کا کوئی حاشیہ بردار کسی سرگشتگی کی ابتدا کرے، میں نے ہاتھ اٹھا کے اس کی طرف انگلی اٹھا کے کہا۔ ''تمہی استاد میدا ہو؟ ادھر کے دادا؟''

اس کے جسم میں تموج سا نمودار ہوا اور چمکیلی آنکھوں سے مجھے سر تا پا دیکھا گیا اور چپ رہا۔ اس کے پہلو نشیں ایک پختہ کار آدمی نے زبان کھولی۔ ''ایسی کا بات ہے؟''

''تم استاد میدا ہو؟'' میں نے ناگواری سے پوچھا۔

مجھ سے مخاطب آدمی کسمسا گیا، پیشانی پر شکنوں کا جال پڑ گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ بے اختیار اس کی نظریں بیچ میں بیٹھے شخص پر اٹھ گئیں۔ ''ہمیں صرف استاد میدا سے بات کرنا ہے۔'' میں نے اپنی آواز تھامے رکھی اور حتمی انداز میں کہا۔

''ایسی......کا بات ہے؟ ہم کو بولو بھیا۔'' عمر رسیدہ آدمی مصنوعی نخوت سے بولا۔

''تم کو بولا نا، اپنے کو صرف استاد میدا سے بات کرنا ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ چوکی پر سب سے نمایاں شخص ہی استاد میدا تھا۔ اکبر علی خاں، استاد میدا کو پہچانتے تھے۔ وہ بھی مجھے اشارہ کرسکتے تھے، اچھا ہی ہوا، انہوں نے دخل نہیں دیا۔ ان کے لیے یہ جگہ بڑی اجنبی ہوگی۔ اپنے حواس کی بحالی کے لیے لازماً انہیں کچھ وقت چاہیے تھا یا انہوں نے مصلحتہً خاموشی شعار کی۔

استاد میدا کے آزمودہ کار ساتھی کے چہرے پر برہمی ہویدا ہوچکی تھی۔ وہ اشتعال میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ استاد میدا نے اسے روک دیا اور بھنچی ہوئی مسکراہٹ سے بولا۔ ''ہم میدا ہیں۔''

''تمہی ادھر کے استاد ہو؟'' میرے لہجے میں تجسس شامل تھا، طنز بھی۔ ''پٹنا شہر کے راجا؟''

''کام کی بات بولو۔'' میدا اکھڑی ہوئی آواز میں بولا اور گاؤ تکیے پر کمر سیدھی کرلی۔

''کام کی بات ہی بولتے ہیں اور تسلی رکھو، ہم کو زیادہ بات بھی نہیں کرنا۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ''میدا استاد، ادھر اڈے پر بیٹھے نئے تو نہیں لگتے۔ تھوڑا بہت تم کو اڈے کا ریتی رواج بھی معلوم ہوگا۔''

اس کا منہ بن گیا اور بے چینی سے بولا۔ ''گھمائی پھرائی کے کاہی بات کرت ہو؟ صاف صاف بولو۔''

''ہم ادھر پٹنا شہر میں آگئے ہیں۔ تمہارا وقت اب ختم ہوچکا ہے۔ اڈے کی ریت ہے، اڈا اس کے پاس رہتا ہے جو اس کا بل رکھتا ہو۔ تم یہ ریت بھول گئے ہو تو ادھر بہت سے تمہارے پالتو تم کو یاد دلادیں گے۔ اڈا راج پاٹ نہیں ہوتا، راجا مرے تو راج کمار تخت پر بیٹھ جائے۔''

میدا کی دھنسی ہوئی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اردگرد بیٹھے لوگوں کے چہرے بھڑکنے لگے۔ معمر ساتھی کچھ زیادہ ہی نمک خوار، وفا شعار تھا کہ اس کا جسم بل کھانے لگا۔ اوروں کا بھی یہی حال ہونا چاہیے تھا۔ اسی لمحے اکبر علی خاں نے آہستہ سے مجھے کہنی ماری اور ایک آن کے لیے سہی، زیر و زبر کردیا۔ یہ موقع انہیں سرزنش کرنے کا نہیں تھا۔ میں تو انہیں ساتھ آنے سے منع کررہا تھا۔ اب یہاں سے ان کے واپس چلے جانے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے اور جو کچھ ہے، مجھے اپنے آپ نمٹنے اور بھگتنے کی درخواست کرنے کا وقت بھی گزر چکا تھا۔ یہ خدشہ ہر لمحہ موجود تھا کہ کہیں وہ کوئی الٹی سیدھی بات، منت گزاری وغیرہ نہ کرنے لگیں۔ مجھی سے غلطی ہوئی۔ انہیں ساتھ رکھنے کی کوئی تک نہ تھی۔ وہ کتنا ہی مصر ہوتے، مجھے صاف انکار کردینا چاہیے تھا۔

چند لمحے توقف کے بعد میدا کی ٹھیری ہوئی آواز گونجی۔ ''جانت ہیں، اپنے کو سب پتا ہے مہا

راج! سارے ریتی رواج کا، جونہیں جانے ہیں، ان کوجتوانے تم ادھر آہی گیو ہو۔"

مجھے حیرت ہوئی، اس نے خلاف توقع خود کو قابو میں رکھا تھا۔ بٹھل کہتا تھا، اڈے کے استاد کا یہ تحمل دو ہی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یا تو وہ صورت حال کی نزاکت بھانپ گیا ہے، اپنے مقابل کی بے باکی اور طنطنہ آمیز تیور کا اسیر ہو گیا ہے یا اسے خود پر حد درجے اعتماد ہے۔ سوا گلا قدم اٹھانے سے پہلے استاد کے سیاہ وسفید کا تعین، اس کی پیمایش کر لینا بہتر رہتا ہے مگر شاید کسی نظر ثانی کا مرحلہ تمام ہو چکا تھا۔

"چاقو نکالو استاد! تم کو بولا نا، اپنے پاس وقت کم ہے۔" میں نے جھڑکتے لہجے میں کہا اور اسی دم جیب سے چاقو نکال کے تیزی سے کھولا اور خاصی بلندی پر اچھال کے چابک دستی سے دوبارہ ہاتھ میں اچک لیا۔ اتنی بلندی پر چاقو اچھال کے دوبارہ گرفت میں لینے کے لیے نگاہ جمائے رکھنی پڑتی ہے۔ بٹھل کے بہ قول، منتظر ہاتھ کو نگاہ کا پابند کر دینا چاہیے۔ اس توازن سے کسی پچھتاوے کا امکان کم سے کم رہ جاتا ہے۔ میں نے بہر حال ہر ممکن احتیاط کی تھی۔ میرے چاقو نکالنے پر سبھی بے قرار ہو گئے تھے، جو بیٹھے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ساتھ بہت سے چاقو کھلنے کی آواز آئی۔ وہ میدا کے اشارے کے منتظر تھے۔ میدا کا سکون سکوت دیکھ کے شاید انہیں مایوسی ہوئی۔ ایک اور وجہ بھی ان کے ٹھٹھر جانے کی ہو سکتی ہے۔ میں نے چاقو واپس اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"تم اپنے کو یہاں سے باہر کر دینا چاہت ہو؟" میدا نے بہ ظاہر فکر مندی سے کہا۔ "ٹھیک ہے ساب بہادر! لگت ہے، تمہرے پاس سے بہت ہمتی ہے پر ابھی تمری عمریا ہی کتنی ہے؟"

"ہماری جانے دو استاد، اپنے لیے سوچو۔" میں نے درشتی سے کہا "تمہاری کتنی رہ گئی ہے، تمہارے دن ضرور پورے ہو گئے ہیں۔"

اس نے سر جھکایا اور لمحے بھر بعد اٹھایا تو اس کی آنکھیں مچی ہوئی تھیں، پھر اسے جھرجھری سی آئی حقے کا ایک کش لے کے مضحکہ آمیز انداز میں بولا۔ "پر ایک بات پوچھت ہیں بوا ساب...... ہم کو ادھر راج سنگھاسن سے ہٹاوے کے پیچھے کیوں پڑت ہو۔" یہ کہتے کہتے اس کا لہجہ فہمایشی ہو گیا "کیوں اپنی جان کے بیری بنو ہو۔ الٹ گیو تو سارا...... تم خود ہی بولت ہو، ہم بھی کسی بوتے پر ادھر راج گدی سنبھالے بیٹھت ہیں۔"

"جانتے ہیں اچھی طرح...... ایسے ہی کسی نے تھالی میں رکھ کے اڈے کی گدی تمہارے آگے نہیں کر دی ہو گی۔ بل کا توڑ بل ہی ہوتا ہے۔ دوسرے میں دم ہے تو پہلے کو جانا پڑتا ہے۔ اڈوں پر یہی الٹ پھیر رہتا ہے۔ ایک جاتا تو دوسرا آ جاتا ہے۔" میں نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "اپنے کو تم سے بیر نہیں پر اپنے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تم نے۔"

"ہائیں! ہم ایسا کا کیت ہیں؟" اس نے تمسخرانہ لہجے پر کمرے میں موجود ہجوم کی ہنسی چھوٹ گئی۔ میدا نے انہیں ڈانٹا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "تہاری ماں نے تو کوئی سکایت نہیں لگائی ہمری؟"

"ہمیں تم سے زیادہ بولنا آتا ہے استاد۔" میں نے ضبط کیا اور تھمی ہوئی آواز میں کہا۔ "اچھا ہے، زبان کھینچ کے رکھو۔ ہاتھ پاؤں اور چاقو کا بل ہی نہیں، اڈے کے استاد کے اور بھی بل ہوتے ہیں۔ وہ تم کو بعد میں بتلا دیں گے۔ پہلے تو چاقو نکالو! دیر کرو گے تو تمہارے یہ پٹھو، تمہاری طرف دیکھنے والے کیا سوچیں گے۔"

دھیرج رکھو بلما! یہ اپنے کو آگے پیچھے سے پورا جانت ہیں۔" میدا سر جھٹک کے بولا۔ "تھوڑی جو کمی رہ گئی ہے، او آج جان جاویں گے۔"

میدا کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ گردن گھما کے اس نے چوکی پر بیٹھے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور کسی قدر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "تمرا کھیال آوت ہے، آدمی دیکھ کے ہی ہم چاکو کھولت ہیں۔ ادھر بہت سے تہاری جوڑی کے ہیں۔ پہلے ان کو بھگت لیاو، بعد کو ہم، سامنے آ جاویں گے...... جرورت پڑی تب......"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جھڑکتی آواز میں کہا۔ ٹھیک ہے، ایسا نہیں نہیں ہوتا۔ پر تم سامنے آنے سے گھبراتے ہو یا تمہاری کمر میں موچ آ گئی ہے تو اپنے کسی سورما کو آگے کر دو جس پر تم کو اپنے سے زیادہ بھروسا ہو...... اور ایک بات جان لو! استاد خود سامنے آئے یا بدلے میں اپنے کسی رستم کو آگے کر دے۔ رستم کے الٹا ہو جانے پر چوکی سے پھر استاد ہی کو نیچے آنا پڑتا ہے۔"

"جانت ہیں، جانت ہیں۔" میدا کی آواز بگڑنے لگی۔ "پر اتنا آگے کا کیوں سوچت ہو۔"

"آگے کا ہم کو معلوم ہے۔ اس لیے ایسا بولتے ہیں۔" اس یقینی لہجے سے اس پر اپنے اعتماد کا اظہار مقصود تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اور بھڑکتا، میں نے کہا۔ "اور ایک بات بولیں استاد!"

وہ پلکیں پٹ پٹانے لگا۔ اس کے نتھنے پھول گئے۔

"اچھا ہو گا، تم خود ہی چوکی سے ہٹ جاؤ۔ ایسے استاد کو چوکی چھوڑ دینا چاہیے جسے اپنے بل پر بھروسا ہی نہ رہا ہو۔ تمہارے اترنے کے بعد تمہارے کسی ہڈحرام کو لاج آئی، کوئی بھی اپنی جان کا دشمن اٹھا تو فیصلہ ہمارے بیچ ہو جائے گا، ایک ایک کر کے آخری آدمی تک اڈے کے استاد کے سر پہ تلوار لٹکی رہتی ہے۔ باہر کا نہیں، اڈے کے اندر بھی تمہارے کسی سرپھرے کو مستی سوجھ سکتی ہے۔ یہ تمہارے آمنے سامنے بیٹھے، تمہاری مالا جپنے والا میں کسی کا بھی سر کسی وقت لوٹ سکتا ہے، سمجھتے ہو ہماری بات؟"

اتنی دیر یہ لن ترانیاں سن کے اڈے کے استاد کا کوئی بھی شیدائی بے لگام ہو سکتا تھا۔ کلکتے کے اڈے پر بٹھل کے سامنے کوئی اس طرح دعوا زنی کرتا تو ایک نہیں، بٹھل کے کئی پروردہ بے قابو ہو جاتے۔

اکبر علی خاں نے کہنی مار کے ایک بار پھر مجھے منتشر کیا۔ ان کی موجودی کسی بوجھ کی طرح مجھ پر مسلط تھی۔ انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ان کا چہرہ میرے سامنے نہیں تھا لیکن ان کی دگرگوں حالت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

میرے ساتھ آنے پر اب شاید انہیں پچھتاوا ہو رہا ہو۔

بے شک ہم چاروں طرف سے اڈے کے سرکش اور مشتعل آدمیوں کے نرغے میں تھے۔ اب تک نہیں تو کچھ بعید نہ تھا کہ دوسرے لمحے استاد میدا کے کسی بہت دیوانے کے دماغ میں اپنے استاد کے سامنے کچھ کر گزرجانے کا سودا سما جائے۔ اڈے پر موجود ہر شخص اس سرخ روئی کے لیے بے تاب ہو گا۔ اکبر علی خاں ایک ذہین، پختہ کار، معاملہ فہم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ ولایت میں وکالت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک دنیا دیکھی تھی۔ جلد یا بدیر انہیں یہ نتیجہ اخز کر لینا چاہیے تھا کہ میری یاوہ گوئی بے محل ہے کہ بے سبب۔ چاقو پر میری دست رس کا انہیں علم نہ تھا لیکن شناسائی کی اس مختصر مدت میں انہیں اچھی طرح میرے ہوش وحواس کی درستی کا اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔

اصل تو یہی ہوش وحواس کا توازن، ان کی درستی ہے۔ کسی غیر ارادی، ناگہاں لغزش کا امکان تو ہر وقت رہتا ہے۔ یہ اڈا، یہاں کے لوگ، سبھی کچھ میرے لیے اجنبی تھا۔ میدا اور اس کے آدمیوں کی تحمینگی سے میرا ارادہ، آیندہ اقدام مشروط تھا اور ایک نہیں، بیک وقت کئی سمتوں اور پہلوؤں پر نظر رکھنی لازم تھی۔ اڈے کے استاد اور اس کے حاشیہ برداروں کو اڈے کی وضع اور طور طریقوں کی تلقین،

ان پر مسلسل اثر اندازی، ایسی دلیلوں کی یورش جو ساختہ اور بے وزن نہ ہوں اور حاصل یہ کہ کسی تاخیر کے بغیر اپنے مقصد کا حصول۔ بٹھل کہتا تھا کہ دلیل کی کاٹ چاقو سے تیز ہوتی ہے اور محض حجت پر مبنی ہو تو کند چھلکے کا کام بھی نہیں کر پاتی۔ وہ کہتا تھا، دلیل کو دہائی نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ان کا وار ایسا شدید ہو کہ مخاطب بدحواس ہو جائے یا ہو جائیں، عقل و ہوش سے عاری۔

میدا بہ ظاہر اتنا مضطرب نہیں لگ رہا تھا جتنا اس صورت حال میں اور میری لاف زنی سے ہونا چاہیے تھا۔ اس کا حال کچھ عجیب تھا۔ کبھی چہرہ تمتما جاتا، آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور کبھی ایسا لگتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور سنا ہے تو اعتبار کے لائق نہیں سمجھا۔ بیش تر وہ مطمئن اور مستعد نظر آتا رہا تھا۔ یقیناً زور کے علاوہ اپنے دوسرے اوصاف کی وجہ سے وہ اتنے بہت سے لوگوں اور پٹنا ایسے خاصے بڑے شہر میں ممتاز ہوا ہوگا۔ کسی قدر توقف کے بعد وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ''پوری طرح سمجھ میں آوت ہے ساب! ساتھ تہار مان بھی دیکھت ہیں۔''

''نہیں ہوتا تو اس طرح منہ اٹھائے، سینہ پھلائے سامنے نہیں آجاتے۔''

''اچھا ہی ہوا، تم آپ ادھر چلے آئے۔ ہم بھی تہار کو دیکھن چاہت تھے، پر تم اتنی دیر کیوں لگا دیو بھیا ساب، کدھر چھپ گیو تھے؟'' میدا چلبلے پن سے بولا۔

''سمجھو جتنی دیر تم کو ادھر گدی پر راج کرنا تھا، اتنی دیر ہم کو بھی لگنی تھی۔ ابھی تم کو بولا نا، تم نے یہی ایک راستہ کھلا چھوڑا تھا، نکلتے دوسرے بھی تھے لیکن اپنے پاس وقت نہیں ہے۔''

''ایس بھی کا جلدی؟ تم تو ادھر چوکی پر راجا بنن واسطے آیو ہو۔''

''اپنا کوئی ارادہ نہیں تھا ادھر آنے کا، تمہاری چوکی، راج گدی سے اپنا کیا بیر، پر اور راستے اسی طرح کھلیں گے۔'' میں نے ایک ثانیے سانس لی اور تند لہجے میں کہا۔ ''اور ویسے بھی ٹھیک ہی ہوا۔ تم جیسے استاد کو شہر کے اڈے کی چوکی پر نہیں ہونا چاہیے۔ اڈوں کے لوگ چورا چکے، اٹھائی گیرے نہیں ہوتے۔ گلی کے کتوں کی طرح انہیں بھونکنے کاٹنے کے لیے چھوڑ نہیں دیا جاتا، گلوں میں پٹا ڈالا جاتا ہے۔ اپنا بھی تھوڑا بہت اڈا گیروں سے ساتھ رہا ہے۔''

''دوسری جگہیہ پہ کا ہووے ہے؟'' میدا نے آنکھیں پھاڑ کے پوچھا۔ میری تلخ کلامی کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

''دوسری جگہوں پر ایسا اندھیر نہیں ہوتا۔''

''رستہ کھلا رکھتے پھر تہرے لیے؟ ہاں بھیا جدھر تمرا من کرے، کل پڑیو۔ تم ادھر دن کے اجالے میں اپنے تین آدمی پر ہاتھ اٹھایو، دو کو آدھا کر دیو، تیسرے کو ٹھکانے لگائے دیو۔ ہا آں۔''

''اور اب چوتھے کی باری ہے۔'' میں نے دہکتی آواز میں کہا۔

میدا کا ٹھیراؤ مصنوعی تھا۔ اس کے جسم میں لہریں اٹھیں۔ قریب بیٹھے ساتھی بھی اپنی جگہوں پر سمٹے اور بندھے نہ رہ سکے۔

''میں...... میں...... مجھے کچھ بولنے کی اجازت ہے؟'' یکا یک اکبر علی خاں نے ایک قدم آگے آ کے جھجکتے ہوئے کہا۔ سبھی چونک پڑے۔ اکبر علی خاں کا لہجہ مفاہمانہ اور ہاتھ احتجاجی اور کسی قدر فریادی انداز میں اٹھا ہوا تھا۔

اکبر علی خاں نے میدا کو مخاطب کیا تھا۔ میدا کی آنکھوں میں چمک ہویدا ہوئی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے سختی سے اکبر علی خاں کو متنبہ کیا۔ ''آپ کچھ نہیں بولیں گے۔''

''بولو وکیل ساب!'' میدا فیاضانہ تیور سے بولا۔ ''کا، کا بات ہے؟''

''نہیں جناب، آپ اس بدقماش سے کوئی کلام نہ کریں۔ یہ اس لائق ہی نہیں۔'' میں نے اکبر علی خاں کو دوبارہ منع کیا۔

''بولو وکیل ساب! بولو۔'' میدا بے چینی سے بولا۔

اکبر علی خاں کی حالت اضطراری ہو گئی، بے چارگی سے میری طرف دیکھا کیے، کبھی میدا کی طرف۔

''یہ عدالت نہیں ہے جناب، ان لوگوں کو آپ کی زبان نہیں آتی۔ آپ اپنا کہا ضائع کریں گے۔'' میں نے تلقینی لہجے میں کہا۔

''میں صرف، صرف حقائق بتانا چاہتا ہوں۔'' اکبر علی خاں گھٹی گھٹی آواز میں بولے۔

''مگر کس سے؟ یہ شخص اندھا بہرا ہے کیا؟ گلی میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ انہوں نے اسے آنکھوں دیکھا نہیں بتایا ہوگا کیا؟''

اکبر علی خاں کا جسم بل کھانے لگا۔

میدا غور سے سن رہا تھا۔ ''آپ کا اس اونچا سر والے ببوا ساب سے کوئی رشتہ ناتا لاگت ہے کا، وکیل ساب؟''

''نہیں میدا بھائی، ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اکبر علی خاں نے نپا تلا جواب دیا۔

''اوہی تو ہم بھی سوچیں ہیں، آپ ان کے ہات کیسے چڑھ گیو۔ ای اک نمبری چاکو باج، پل بھر میں جمین آسمان تل پٹ کر دیویں۔ آپ کچہری عدالت کے بندھو، کھاندانی بھلے مانس، سہر میں آپ کے نام کا ڈنکا بجت ہے۔'' میدا کا طنز مضحکہ آمیز تھا اور کچھ ایسا کاری نہیں تھا۔ اس نے بہ ظاہر حیرانی سے پوچھا۔ ''پھر کا ہے؟''

اکبر علی خاں کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے میدا سے کہا۔ ''سارا رشتہ ناتا ابھی صاف کر دیں گے۔ پہلے چاقو نکالو استاد!''

میدا نے میری برہمی پر توجہ نہیں دی اور اکبر علی خاں سے بولا۔ ''ہاں وکیل ساب، ہم آپ سے کچھ پوچھت ہیں۔ کب سے جانت ہو آپ اپنے سیر ببر کو؟''

''زیادہ دیر سے نہیں۔'' اکبر علی خاں نے متانت سے جواب دیا۔ ''ابھی دوپہر سے۔''

''ابھی اسی دوپہر یا سے ے ے......'' میدا پلکیں جھپکانے لگا۔ ''ادھر گلی میں آپ بھی تھے کا؟''

''نہیں صاحب، میں وہاں نہیں تھا۔'' اکبر علی خاں نے مضطربانہ سر ہلایا۔

''پھر آپ...... آپ؟'' میدا کے چہرے پر کش مکش نمودار ہوئی اور چمکارتی آواز میں بولا۔ ''بولا نا وکیل ساب! ہم کا سب، سب کھل بتا دو۔''

''بہتر ہے آپ یہاں سے چلے جائیں۔'' میں نے برگشتگی سے کہا۔ ''اور طمینان رکھیں، میں اس منہ زور، اس بن مانس کو دیکھ لوں گا۔ یقین کیجیے، اس کا وقت آگیا ہے۔ اس کے سامنے کسی وضاحت اور دلیل و حجت سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ دوسری طرح کا آدمی ہے۔''

''خدا کے لیے مجھے کچھ بات کرنے دیجیے۔'' اکبر علی خاں نے شکستہ لہجے میں مجھ سے منت کی۔ ان کی عاجزی اور رنجیدگی پہ ناراضی غالب تھی۔ مجھے میری بدکلامی اور تلخ نوائی سے باز رکھنے کے لیے بس ان کا ہاتھ جوڑنا ہی رہ گیا تھا۔ کسی آخر کوشش کے طور پر انہوں نے حتمی انداز میں سرگوشی کی ''بعد کو آپ کو اختیار ہے۔ آپ کہتے ہیں تو چلا بھی جاؤں گا میں۔''

''کا، کا ہے؟ ہم سے بولو وکیل ساب، بے پھکر ہوئی کے ہم کا بولو۔'' میدا بے قراری سے بولا۔

میرے لیے اب خاموش ہو جانا ہی مناسب تھا۔

''میراان صاحب، اس نوجوان سے کوئی تعلق نہیں ہے میدا بھائی۔'' اکبر علی خاں نے میری خاموشی پر گہری سانس بھری اور دو ٹوک لہجے میں

کہا۔ ”میں آپ کو بتاتا ہوں، میں اور بیوی بچے گھر میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ انہوں نے دروازے پر دستک دی اور بتایا کہ یہ اس شہر میں اجنبی ہیں اور بہت پریشانی میں ہیں۔ پیچھے پولیس ہے۔ ساری بات بتائی کے پٹنا شہر میں آنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ تو آگے جا رہے تھے کہ سفر میں کل رات ان کے بڑے بھائی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ جلد علاج کے لیے انہیں آگے کا سفر ملتوی کر کے پٹنا شہر رکنا پڑا اور انہوں نے پٹنا میڈیکل کالج اسپتال کا رخ کیا۔ رات بھر بھائی کے سرھانے اسپتال میں رہے۔ آج صبح بڑا ڈاکٹر مریض دیکھ کے جا چکا تھا۔ انہوں نے نرس سے اجازت لی اور رشتے داروں کو بھائی کی حالت کے بارے میں تار دینے کے لیے یہ بڑے ڈاک خانے گئے تھے کہ ان کا بٹوا کسی نے چھین لیا۔ انہوں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ آدمی بھاگتا ہوا ڈاک خانے کی بازو والی گلی میں داخل ہو گیا اور اس نے ایک جگہ ان کے بالکل سر پہ آ جانے پر چاقو تان لیا۔ انہوں نے اسے قابو میں کر لیا اور اپنا بٹوا حاصل کر لیا تھا کہ ایک دوسرے آدمی نے ان کا راستہ روک لیا، دوسرا، پھر تیسرا۔

دونوں کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے۔ وہ اپنے پہلے ساتھی کی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے ان پر وار کرنا چاہتے تھے، انہوں نے اپنا چاقو نہیں نکالا تھا۔ ان کا کہنا ہے، انہوں نے بہت کچھ کہا، کہا کہ انہیں کہیں جلد ہی پہنچنا ہے۔ شاید اسپتال کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ یہ اپنا بٹوا دینے پر بھی تیار ہو گئے تھے۔ وہ دونوں بہت غصے میں تھے۔ انہیں ہر حال میں اپنا بچاؤ کرنا تھا۔ ایک آدمی کو انہوں نے بس میں کر لیا تھا کہ دوسرے نے کچھ نہ دیکھا۔ اس کی ذرا سی چوک سے ان کی پکڑ میں آئے اس کے ساتھی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کچھ یہی ہوا، وہ آدمی دیوانہ ہو چکا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ کہتے ہیں، انہوں نے اس کے وار سے خود بچنے اور اس کے ساتھی کو بچانے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح بڑھ چکا تھا۔ اس کا چاقو اپنے ہی ساتھی کی پسلی میں اتر گیا۔ اپنی نادانی، جلد بازی کا یہ انجام دیکھ کے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب وہی ایک آدمی ان کے سامنے رہ گیا تھا اور اس کی حالت خراب تھی۔ تین چار ہاتھوں میں اسے بھی انہوں نے ادھ موا کر دیا۔ اس کے بعد ان کا راستہ صاف تھا۔ کوئی چوتھا پھر ان کے آگے نہیں آیا۔

یہ گلی سے نکل آئے اور اسپتال واپس جانے کے لیے تانگے میں بیٹھ گئے۔ کچھ راستہ طے کر لیا تھا کہ دیکھا، پولیس اور بہت سے آدمی ان تک پہنچنے کے لیے بھاگ رہے ہیں۔ سڑک کے کسی موڑ پر وہ لوگ پل بھر کے لیے اوجھل ہو گئے تھے کہ یہ تانگے سے کود کے قریبی گلی میں گھس گئے اور گلی گلی گھومتے، چھپتے پھرے اور مجبوراً انہیں ہمارے گھر کے دروازے پر دستک دینی پڑی۔ انہیں بھائی کے پاس جلد اسپتال پہنچنے کی فکر تھی۔ پولیس کے ہاتھ آ جانے اور کسی بڑے جھگڑے میں پڑنے سے وقت اور نکل جاتا۔ ان کی زبانی سارا واقعہ سن کے مجھے ہم دردی ہوئی۔ میں نے مشورہ دیا کہ تین چار دن میں حالات دب جانے یا ٹھیک ہو جانے تک، بہتر ہوگا، یہ میرے گھر ٹھیرے رہیں۔ میں اسپتال جا کے ان کے بھائی کی دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔ ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ جس تانگے میں انہوں نے اسپتال سے بڑے ڈاک خانے تک سفر کیا تھا، اسی تانگے سے اسپتال واپس جا رہے تھے۔ استاد میدا اور اس کے آدمیوں کے لیے تانگے والے کو ڈھونڈ نکالنا مشکل نہ ہوگا۔ وہ اسپتال پہنچ گئے تو وہاں ان کے بھائی کے پاس مجھے دیکھ کے ان کا شک میرے گھر پہ جا سکتا ہے۔ اس طرح میں خواہ مخواہ کسی پریشانی سے دوچار ہو سکتا ہوں۔ مجھے تو اسی شہر میں رہنا ہے۔ استاد میدا کے سینے میں میری پھانس چبھ سکتی ہے۔ میں نے کہا، پھر یہ ایسا کریں

کہ مجھے اپنے گھر کا پتا بتائیں، میں ان کے رشتے داروں کو پٹنا آنے کے لیے تار دے دیتا ہوں۔ وہ کل یا پرسوں تک آجائیں گے۔ اس وقت تک یہ میرے گھر چھپے رہیں۔ پھر کسی دن، کسی مناسب وقت، اندھیرا ہوجانے کے بعد رات کو کسی وقت چپکے سے یہ پٹنا شہر سے نکل جائیں۔ انہوں نے میرا ہر مشورہ مسترد کردیا۔

"یہ نوجوان آدمی ہیں۔ اچانک انہوں نے فیصلہ کیا انہیں خود استاد میدا کے پاس جانا چاہیے۔ میں انہیں منع کرتا رہا۔ یہ نہیں مانے۔ مجھے نہیں معلوم یہاں آنے کا ان کا فیصلہ کس قدر جذباتی ہے یا استاد میدا کو اس کی پرانی جگہ سے بے دخل کردینے کا بھروسا کس حد تک درست ہے۔ میں نے احتیاطاً ان کے ساتھ رہنا مناسب سمجھا، شاید میرے ساتھ ہونے سے بات اتنی نہ بڑھ پائے۔ جو کچھ میرے علم میں ہے، میں نے آپ کو بتادیا ہے میدا بھائی۔ میں انہیں بالکل نہیں جانتا، آج ہی آمنا سامنا ہوا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے، اپنے بھائی کے پاس جانے کے لیے یہ بہت بے چین تھے۔ بھائی کے لیے یہ کچھ بھی کرگزر سکتے ہیں۔"

اکبر علی خاں کو موقع کی نزاکت کا شدت سے احساس تھا۔ انہوں نے خوش وضعی سے جیسے ایک ایک لفظ چن چن کے، آواز کے کسی زیروبم کے بغیر، بڑی حد تک غیر جانب داری سے ساری روداد گوش گزار کی۔ مدعا کی ترسیل کے لیے سماعت اور گویائی کا توازن لازم ہے۔ انہوں نے اپنے بیان میں مخاطبین کی سماعت کی استطاعات کا خیال رکھا اور عدالتی طرز بیان سے اجتناب کیا۔ عدالتی بیان میں دلیلیں مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکبر علی خاں نے سادگی شعار کی تھی، سادگی اور اختصار، جزئیات اور صراحتوں سے پڑھنے اور سننے والے کا تجسس واشتیاق متاثر ہوتا ہے۔ سطور کم، بین السطور زیادہ، یہی بلاغت کا قرینہ ہے۔ نہ کہتے ہوئے بھی انہوں نے سبھی کچھ کہہ دیا تھا۔ وکیل وہ کتنے ہی بڑے ہوں، ان کا بیان ان کی طبعی ذہانت کی آئینہ داری کررہا تھا۔ ہر فضیلت کی پہلی شرط ذہانت ہے۔ انہوں نے ہر غیر ضروری ذکر سے پرہیز کیا تھا۔ ہوٹل میں ہمارے قیام، چاقو لہراتے ہوئے ان کے گھر میں میری آمد کی ناگہانی، پردہ دار خواتین کی بے پردگی اور انہیں ہیبت میں رکھنے کے جرم کی گفتنی ناگفتنی سے انہوں نے پہلوتہی کی تھی۔

سارے ہال میں خاموشی چھا گئی۔ میدا کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے دخل دیا نہ میں نے۔ اکبر علی خاں کے چپ ہوجانے پر لمحے گزر گئے، میدا بے حرکت بیٹھا رہا پھر اس نے پہلو بدل کے حقے کا لمبا کش لیا، اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور ایک پل کے لیے آنکھیں میچ لیں۔ اس کی پیشانی پر شکنیں گہری ہوگئی تھیں۔

میری خاموشی کا اب کوئی جواز نہ تھا۔ میدا کے منفی، مثبت تاثر کا انتظار کرنا اب بے محل اور بے مصلحت تھا۔ میں نے اونچی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ "وکیل صاحب کو جو بولنا تھا، بول چکے میدا استاد! سمجھو، وکیل صاحب نے تم سے کچھ بولا اور نہ تم نے کچھ سنا۔ ان کے جھوٹ سچ پر دھیان مت دو اور اپنا میرا وقت اور برباد مت کرو۔" میں نے پھرتی سے چاقو کھول لیا۔ "اپنا فیصلہ اسی پر ہونا چاہیے۔ تم کو یہی زبان آتی ہے نا۔"

اکبر علی خاں نے مایوسی سے میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

میدا نے میرا کہا درگزر کیا اور ہاتھ اٹھا کے اکبر علی خاں سے پوچھا۔ "او تو سب ٹھیک ہے۔ جو آپ بولے، ہم پورے دھیان سے سن لیے، پر آپ کا سمجھت ہیں، ہمرا مطلب ہے، آپ کتنا جانت ہیں، ای سارا سیدھا ہی بولت ہیں کا؟"

"میں نے جو دیکھا اور سنا ہے، وہی آپ کو بتایا ہے۔" اکبر علی خاں الجھی ہوئی آواز میں بولے۔

"ایک بات صاف کردوں میدا بھائی، میں ان کا وکیل بن کے یہاں نہیں آیا، میں نے آپ سے ان کی کوئی سفارش بھی نہیں کی ہے لیکن کچھ...... کچھ باتیں۔" کہتے کہتے اکبر علی خاں رک گئے۔ ان کے ہونٹ بھینچ گئے، لحظہ بھر تامل کیا اور مایوسی سے بولے۔ "جانے دیجیے، بہتر ہوگا، آپ دونوں خود ہی نمٹ لیجیے۔"

"او کا...... کا بات؟" میدا مچل کے بولا۔ "او تو آپ جیسا بولت ہو، بعد کو ہم دیکھ ہی لیں گے۔ ہم کو ہی سارا دیکھنا ہے، پر آپ بولو، آپ کا...... کا کہنا چاہت تھے؟"

"کچھ نہیں میدا بھائی۔" اکبر علی خاں کی آواز بھاری ہوگئی۔ "یہ ہمارے گھر اپنی مرضی سے آئے تھے، ہماری دعوت پر، ہماری خوشی سے نہیں، اور انہوں نے ہمیں کچھ سوچنے سمجھنے، کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔"

میدا اچھل پڑا۔ اس نے اکبر علی خاں کو بات پوری کرنے نہیں دی۔ "جرور چاکو نکالا ہوئے گا۔ چاقو سے کھیلن کا ان کا بہت چاؤ لاگت ہے۔ ای ہی نا؟"

اکبر علی خاں نے تائید کی، نہ تردید۔ بردباری سے بولے۔ "شروع میں انہوں نے زور ڈالا تھا، ڈالنا ہی چاہیے تھا لیکن جلد ہی ہماری ساری حیرت دور کردی، دکھ بھی اور خوف بھی۔ انہوں نے گھر کے کسی فرد کو تنگ نہیں کیا، کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اپنے آنے کی وجہ بتائی اور گھر میں اس طرح داخل ہونے کی معافی چاہی۔ کچھ دیر گھر میں رہنے کی اجازت چاہی۔ اس کے سوا کچھ نہیں...... میں نے بہت کرید کی اور ان کے جواب پر کسی اور طرف دیکھنے سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ انہوں نے اسپتال اور ڈاکٹر کا نام بھی بتایا۔ میں نے آپ کو ابھی بتایا ہے کہ یہ دو تین دن ہمارے گھر ٹھیرے رہنے کے مشورے پر راضی نہیں ہوئے۔"

اکبر علی خاں کے لہجے میں پہلے سے کہیں زیادہ اعتماد تھا۔ کہنے لگے۔ "اتنی عمر میں ہم نے بھی کچھ دیکھا بھالا ہے میدا بھائی، اپنا کام ہی ایسا رہا ہے بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے، ایک سے ایک بڑھ کے۔ تھوڑی بہت آدمی کی پہچان ہونی چاہیے۔ آپ کے آدمی اور پولیس والے ان کے پیچھے نہ ہوتے تو یہ ہمارے گھر میں کیوں داخل ہوتے۔ کوئی اور بات، کوئی اور ارادہ ہوتا ان کا تو یہ ہم سے کسی اور طرح پیش آتے۔ میں نے دیکھا ہے، ان میں حوصلے کی کمی نہیں۔ یہ پولیس کے سامنے بھی آجاتے اگر انہیں کسی جگہ پہنچنے کی بے کلی نہ ہوتی۔"

میدا کی بھویں چڑھ گئیں اور نتھنے پھڑکنے لگے۔ نخوتی لہجے میں بولا۔ "پولیس کو تو ہم ابھی ادھر ہی بلوا سکت ہیں۔ آپ کو پتا ہے وکیل ساب۔" اس کی آواز تڑخنے لگی۔ "اپنا ایک آدمی چلا گیو، بہت پرانا ساتھ تھا اپنا۔ کا چاکو کھماوت تھا، بجلی لپکت تھی اس کے انگ انگ میں۔ اس حرام جادے کا اتنا کھون نکل گیو کہ اسپتال کے رستے میں دم توڑ گیو۔ تمرے اس سکتی وان، سری مان کے کارن اس کی ہتیا ہوگیو۔ ایسو میں کوئی دکھ لاگت ہے وکیل ساب، ہم سے جیادہ آپ جانت ہو۔ ای ہم سے چاکو کی بات کرت ہیں۔ پہلے ہمرے آدمی کا حساب چکتا کردیں۔ اسارے کا دیر ہووے گی، پولیس ادھر آجاوے گی۔"

"اشارہ کرونا، بلاؤ پولیس کو، سوچتے کیا ہو پھر؟" میں نے پھنکارتی آواز میں کہا۔ "پر ہم کو معلوم ہے استاد، تم ایسا نہیں کروگے، اپنے ان پٹھوؤں کو کیا جواب دوگے، کس منہ سے سامنا کروگے ان کا، کیا سوچیں گے یہ ایسے استاد کے لیے جو چوکی پر بیٹھا اینڈتا رہا، چوکی سے چپٹے رہنے کے لیے استاد کے پاس پولیس کی آڑ رہ گئی تھی۔ تم خوب جانتے ہوگے، ایسے راجا کو پرجا کب تک سہن کرے گی، کب تک پلکوں پہ بٹھائے گی اسے۔"

میدا کا چہرہ سلگ رہا تھا، حقے کی نے اس کی انگلیوں میں لرزاں تھی۔ اس کے ساتھیوں کے پیچ وتاب کا بھی کچھ یہی عالم تھا۔

''ہم تو خود ادھر آئے ہیں حساب صاف کرنے۔'' میں نے دانستہ اپنی آواز کسی قدر مدھم کی۔'' اپنے پرانے آدمی کے بچھڑ جانے پہ تمہارا خون بہت کھولتا ہے۔ بڑا چاقو گھماتا تھا وہ، بڑی بجلی تھی رگ رگ میں۔ اس کو تو پورا دیکھنا بھی نہیں آتا تھا استاد! چاقو کے کھیل میں ہاتھ، آنکھیں اور دماغ باندھ کے رکھنا پڑتا ہے۔ یہ تال میل نہ ہو تو وہی ہوتا ہے جو اس کے ساتھ ہوا۔ اسے تو کب کا ڈھیر ہو جانا چاہیے تھا۔ لگتا ہے، کبھی کوئی اصیل نہیں پڑا تھا اس کے سامنے۔ تم اپنی بات کرتے ہو۔ ہمارے راستے بند کر کے ہمیں کتنا دکھ پہنچایا تم نے، اسے تم کیا جانو گے اور پولیس کی بات کرتے ہو، چوکی سے اتر کے پہلے ہمارے سامنے آؤ۔ اپنا وعدہ سمجھو اسے۔ اتنے لوگوں کے بیچ بولتے ہیں، پولیس کے سامنے ہم خود آ جائیں گے۔''

''میری بات سنیے۔'' اکبر علی خاں نے دونوں ہاتھ اٹھا کے بہ شدت تمام رخنہ اندازی کی۔''میری بات سنیے میدا بھائی۔ آپ کے آدمی کو انہوں نے نہیں مارا۔''

''نہیں مارا......'' استاد میدا بھڑک اٹھا۔ ''آپ مرگیو سرا۔ کا بولت ہو۔'' وہ بھن بھناتی آواز میں بولا۔

''میری بات سنیے میدا بھائی۔ لگتا ہے جو کچھ میں نے پہلے کہا ہے، آپ نے اس پر پورا دھیان نہیں دیا۔'' اکبر علی خاں نے ٹھیر ٹھیر کے کہا۔''سمجھیے، جیسا یہ کہتے ہیں، ایسا ہی ہوا اگر......تو آپ ان کا راستہ کھوٹا کرنے کے سوا کچھ نہ کر پائیں گے۔ بعد کو پچھتاوا بھی ہو سکتا ہے آپ کو۔ میں ان کا کہنا دہراتا ہوں۔ ان کا کہنا ہے، انہوں نے چاقو نہیں نکالا تھا۔ آپ کے آدمی کا چاقو اس کے ساتھی کی پسلی میں جا کھپا ہے۔ انہوں نے مرنے والے کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ پہلے آپ کے آدمی نے شہر میں اجنبی اس نوجوان کا بٹوا چوری کیا۔ بٹوا واپس لینے کے لیے انہیں اس کا پیچھا کرنا چاہیے تھا یا دیکھتے رہ جاتے، چپ کھڑے اپنے لٹ جانے کا تماشا دیکھتے رہتے۔ مسافر کا بٹوا، سفر میں اس کی پونجی چھن جائے تو اس کی کیا حالت ہو گی۔ گلی میں جیب کترے کا پیچھا کر کے انہوں نے بٹوا حاصل کر لیا۔ ظاہر ہے، انہیں اپنے آپ پر بھروسا تھا کہ یہ ایسی آسانی سے چور کو فرار ہونے نہ دیں گے۔ نہ ہوتا تو وہیں، ڈاک خانے میں چیختے چلاتے رہ جاتے۔ بٹوا ملنے کے بعد بات ختم ہو گئی تھی لیکن اسی وقت آپ کے دو آدمی ان کے آڑے آ گئے...... بتائیے، پھر یہ کیا کرتے۔ آپ ان کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے، اور کوئی ہوتا تو......؟ ان کی جیب میں چاقو تھا۔ انہوں نے بات بڑھ جانے کے خیال سے جیب ہی میں پڑے رہنے دیا۔ چلیے، یہ جو کہتے ہیں، اس پر نہ جائیے۔ سب غلط ہے لیکن گلی کے لوگ! انہوں نے بھی کچھ دیکھا ہے۔ وہ آپ سے کتنی دور ہیں اور......اور یہ کہاں بھاگے جا رہے ہیں۔ پولیس بلوا کے آپ انہیں ہتھ کڑیاں ڈلوا سکتے ہیں لیکن پولیس کا کام ایک حد پہ جا کے ختم ہو جاتا ہے۔ کچہری کی بات دوسری ہوتی ہے۔ وہاں شطرنج کی بازی جمتی ہے، بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ، تیسری جگہ۔ بات آگے تک چلی جاتی ہے۔ یہ ہار جائیں یا جیت جائیں، آپ کا جانے والا ساتھی کسی صورت واپس نہیں آئے گا۔ جس بیمار بھائی اور اسپتال کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں، وہ بھی کسی دوسرے شہر میں نہیں ہے۔'' اکبر علی خاں نے بے چارگی سے ہاتھ پھیلائے اور تھکے ہوئے لہجے میں بولے۔''میں اس سے زیادہ کیا کہوں۔ آپ سمجھ دار ہیں۔''

شاید میدا کو توقع تھی، اکبر علی خاں اسے کچھ اور قائل کرنے کے لیے نکتہ آفرینیاں کریں گے لیکن یوں اچانک اپنی عرض گزاری سے دست بردار ہو جانے پر وہ چونک سا پڑا اور اس نے اپنے قریب بیٹھے معمر آدمی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ معمر آدمی کے پپڑی جمے سیاہ ہونٹ پھڑ پھڑا کے رہ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا۔ غصہ و غضب کے علاوہ اب میدا کے چہرے پر کش مکش و کشاکش بڑی نمایاں تھی۔ حقے کی نے منہ سے چپکائے اس نے جلدی جلدی کئی کش لیے اور نکیلی آواز میں بولا۔''اب آپ ان کی وکالت کرو ہو وکیل ساب۔''

''صرف ان کی نہیں، سوچیے تو آپ کی بھی۔'' اکبر علی خاں نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔''یہ تو میری رائے ہے میدا بھائی۔ میرا کیا زور ہے آپ پر؟ آپ نہ مانیں، حکم ہو تو زبان ہی بند رکھوں۔''

''اپنے لیے کبھی کوئی حکم کرو استاد!'' اکبر علی خاں کے چپ ہوتے ہی میں نے کہا۔ لہجے لفظوں کے رنگ بدل دیتے ہیں۔ میرے بہ ظاہر سرد لہجے میں آگ سی لگی ہوئی تھی، میدا کے جسم و جاں میں بھی منتقل ہوئی ہو گی۔ میں نے تلخی سے پھر اسے ٹوکا۔ ''چوکی سے نہیں اترنا تو پولیس کو بلواؤ۔ جو کچھ بھی ہے، تھوڑی مہربانی کر دو، جلدی کرو۔''

اکبر علی خاں نے دبے لہجے میں مجھے پولیس کے حوالے کر دینے کی صورت میں طویل اور پیچیدہ مرحلوں کے عواقب سے میدا کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کچہری عدالت تو دور کی بات ہے، صرف ایک دن اور مجھے بھُل کے پاس نہ پہنچ پانے کا عذاب بھگتنا ہو گا۔ اتنا وقت میں نے جس طرح گزارا ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ یہ ایک دن بھی مجھے جیسے تیسے کاٹنا ہے۔ ایک دن یا ڈیڑھ دن۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔ پٹنے سے کلکتا ایسا دور نہیں ہے۔ انہیں خبر ملنے کی دیر ہو گی۔ پہلی گاڑی سے چل پڑیں گے۔ کل تک جامو، جمرو، زورا اور جانے کون کون یہاں پہنچ جائیں گے۔ کل استاد میدا باقی اور شاید یہ اڈا ہی قائم نہ رہے۔ وہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ اپنے مربی استاد بھُل کی حالت دیکھ کے تو وہ اور پاگل ہو جائیں گے۔ میدا کے پاس پھر کیا جائے اماں رہ جائے گی۔

میں میدا سے یہی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مجھے پولیس کے حوالے کرنے سے اڈے پر اس کی حکم رانی بے شک جاری رہے گی لیکن تا بکے، صرف ایک رات اور ایک دن کے لیے۔ پھر یہاں سب کچھ بدلا ہوا ہو گا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا کہ اب مزید کہنے سننے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر جاتی تھی، میدا کو بہر حال کسی نتیجے پر پہنچنا ہی تھا اور یہ آسان کام نہیں تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اڈے کے اتنے لوگوں کے درمیان کسی عزت مندانہ فیصلے کے لیے اب اسے میری اعانت کی ضرورت ہے۔ ابتدا ہی میں اس کے پیش و پس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ چوکی سے دست برداری پر آمادہ نہیں ہے۔ وہ ناپختہ، کچی عقل کا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ایک اجنبی چاقو بردار کے مطالبے پر سینگ آگے کیے ڈکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہو۔ اڈے کے تین آدمیوں کی پس پائی کا واقعہ اس اجنبی شخص سے منسوب تھا اور جس تیور سے اس نے اڈے کے استاد کی عمل داری میں، اس کے حاشیہ برداروں کے درمیان آ کے ایک طرح کی یورش و یلغار کی تھی، اڈے کا کوئی بھی استاد ہوتا تو یہی تحمل و تامل کرتا۔ میدا کو بھی میرا میزان کرنے کے لیے کچھ مہلت مطلوب ہو گی۔ کچھ میں نے بھی درازئ وقت سے عملاً چشم پوشی کی تھی۔ اڈے کے آزمودہ کار استاد کا ارادہ دگرگوں کرنے کے لیے وقت کا اتنا اصراف تو لازم ہی تھا۔ چاقو گھماتے، لہراتے ہوئے میری جانب سے مسلسل دعوت مبارزت اور مسلسل یاد

دہانی سے استاد کی فکر و تشویش میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہوگا۔

ادھر اکبر علی خاں نے درمیان کا کوئی فسانوی راستہ نکالنے کے لیے اپنی سی کوشش کی تھی۔ ان کی موجودی سے اتنا ضرور ہوا کہ میدا استاد کی فہمایش و سرزنش کا جو کام مجھے کرنا اور کرتے رہنا تھا، اس کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ اکبر علی خاں نہ ہوتے تو مجھی کو سارا کچھ دیکھنا تھا۔ میں اکیلا ہوتا تو شاید اتنی دیر نہ لگتی مگر وضع و مروت میں جو شخص ساتھ آیا تھا، ایک شریف النفس، تعلیم یافتہ، صاحب دل، صاحب نظر شخص۔ بت کی طرح کھڑے رکھنے کے بجائے اسے بھی اپنی مفاہمانہ، صلح جویانہ کاوش کا کوئی موقع ملنا چاہیے تھا۔

پہلی نظر میں میدا مجھے کوئی مشکل آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ ہوتا بھی تو میں تو اس کے اڈے، اس کی قلم رو میں آچکا تھا۔ مجھے ہر حال میں اس سے معرکہ آرائی کرنا تھی۔ واپسی کسی طور ممکن نہیں تھی۔ میرا تخمینہ غلط بھی ہوسکتا تھا۔ بٹھل کے کہنے کے مطابق مقابل کی نادیدہ برتری کی ایک گنجایش ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے اور اپنی کسی اتفاقی کوتاہی کا امکان بھی۔ اور بٹھل ہی کا کہنا تھا کہ چاقو آزمائی سے پہلے مقابل کی نفسی و اعصابی شکست اور بخت کے لیے ہر ممکن حربہ آزمانا چاہیے۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی، میں ہی جانتا ہوں کہ تمام تر یقین اور خود اعتباری کے باوجود اس دو بہ دو عداوت سے پہلو تہی کی خواہش مجھے بھی تھی کہ میرا دل دماغ تو بٹھل میں اٹکا ہوا تھا۔ میں کتنا ہی اپنے آپ کو باندھ کے رکھوں، مجھے تو وہاں اسپتال میں بٹھل کے سرہانے ہونا چاہیے تھا۔ پولیس طلب کرکے مجھے اس کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس پہلو پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اڈوں کو پولیس کی دخل اندازی سے دور رکھا جاتا ہے۔ اڈوں کا تو خود پولیس ایسا نظام ہوتا ہے اور اڈے کے استاد کی پشت پر صرف اس کا بل ہوتا ہے، پولیس کی پشت پناہی نہیں۔ یہ استاد کی پستی و پس ماندگی ہے کہ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پولیس کو آلۂ کار بنائے۔ میدا سے مجھے اس کم ظرفی و کمینگی کی امید نہیں تھی۔ اڈے کے آدمیوں کے لیے بھی ان کے استاد کی یہ ناروا حرکت بڑی سبکی کی بات تھی۔

آئینے پر چھائی دھند ختم ہورہی تھی۔ اب مجھے بہت کچھ صاف نظر آرہا تھا لیکن ایسا تیقن بھی نامناسب تھا۔ میدا نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ جواب خاصا مشکل بھی تھا۔ اس دوران اکبر علی خاں نے چپ سادھے رکھی، مایوسی میں یا میری طرح کسی خوش گمانی میں۔ بہر حال تو تکرار اور تاویل و تکرار کا مرحلہ اب تمام ہوچکا تھا۔

استاد میدا مجھے گھورتا اور حقے سے شغل کرتا رہا، پھر اس نے پہلو میں بیٹھے معمر آدمی سے قریب ہوکے کچھ کہا۔ معمر آدمی کی پیشانی سکڑ گئی اور ہونٹ پھیل گئے۔ دونوں چند لمحے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔ معمر آدمی کبھی انکار، کبھی اقرار میں سر ہلاتا رہا اور اس نے میدا کا بازو پکڑ کے کچھ سمجھانے کی کوشش کی، بڑبڑاتے ہوئے نزدیک بیٹھے ساتھیوں کو متوجہ کیا۔ ان کے چہرے بھی سلگ رہے تھے۔ لگتا تھا، معمر آدمی کی ہم نوائی کررہے ہیں۔ میدا کا منہ بگڑ رہا تھا اور یکا یک اس نے جھٹکے سے حقے کی نے فرش پر ڈالی، دونوں بازو سمیٹے، پھیلائے جیسے تازہ دم ہونا چاہتا ہو۔ جیب میں ہاتھ ڈال کے ہاتھ باہر نکالا تو خالی نہیں تھا، بند چاقو ہاتھ میں تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی ہاتھ پیر سیدھے کیے، دائیں بائیں جسم گھمایا، چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور اکبر علی خاں کو اشاروں میں تسلی دی، ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چوکی پر اور آس پاس، آمنے سامنے اور کھڑے ہوئے لوگوں کی بھن بھناہٹ ہال میں گونجنے لگی تھی۔

میدا نے چاقو کھول کے دھار پر انگلی پھیری۔

معمر آدمی کے ہاتھ چومے۔ معمر آدمی نے انکار میں شدت سے سر ہلایا۔ میدا اٹھا ہی چاہتا تھا کہ معمر آدمی نے اس کی کلائی گرفت میں لے لی اور آنکھیں بھینچ کے تنبیہی انداز میں کچھ تاکید کی۔ میدا کے چہرے پر بیزاری اور ناگواری نمایاں تھی۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ اس کے اور قریب ہوگئے اور گھیرا سا ڈال دیا۔ میدا آمادہ نظر نہیں آتا تھا مگر جیسے زچ ہوگیا ہو، منہ موڑ کے اور سر جھکائے اس نے معمر آدمی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کے آگے چاقو کردیا۔ معمر آدمی نے جھپٹنے کے انداز میں چاقو تحویل میں لے لیا۔ ہر طرف شور اٹھ پڑا۔ معمر آدمی نے ہاتھ بلند کرکے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی اور ادھر میدا کی کمر تھپک کے ممنونیت کا اظہار کیا اور میری طرف نگاہیں مرکوز کیں۔ پہلے ایک دوبار، چاقو والا ہاتھ فاصلے کے تعین کے لیے آگے پیچھے کیا۔ میری نظریں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ناپ تول کے اتنی اونچائی سے چاقو اچھالا کہ درمیان کی لمبائی مجھی پر ختم ہو۔ چاقو کھلا ہوا تھا۔ چاقو سے اس کی دست برداری اور میری گرفت کا وقفہ لمحوں پر مشتمل تھا۔ میں نے سارا ہوش چاقو کو دستے سے پکڑنے میں صرف کیا اور مجھ سے کوئی چوک نہیں ہوئی۔ معمر آدمی کا منشا میری سمجھ میں آچکا تھا۔ اب میری باری تھی۔ مجھے اپنا چاقو اسی چابک دستی اور مشاقی سے اس کا اور اپنا فاصلہ ذہن میں رکھ کے اچھالنا تھا۔ معمر آدمی بھی منتظر تھا۔ پہلے میں نے میدا کا چاقو سکون سے بند کیا پھر اپنا چاقو پھینکا۔ مجھے حیرت ہوئی اور کسی قدر خوشی بھی۔ اس کبر سنی کے باوجود چاقو پکڑنے میں معمر آدمی سے ذرا سی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی۔ احتیاط سے چاقو بند کرکے اس نے میدا کی طرف بڑھایا۔ بادل نخواستہ، لمبی سانس کھینچ کے اور آنکھیں چڑھا کے میدا نے چاقو جیب میں رکھ لیا۔

”تم جاسکتے ہو۔“ معمر آدمی نے دھڑکتی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ ”پر تمرے کو لوٹ کے ادھر آنا ہے۔“

میں نے سر کو خفیف جنبش دی اور حتمی لہجے میں کہا۔ ”تمہاری یہ مرضی ہے تو یہی سہی۔ استاد میدا کا چاقو میرے پاس ہے اور مجھے اپنا چاقو واپس لینا ہے۔ کسی کی بھینٹ ہے وہ، اور اپنے کو بہت راس ہے۔ میں اسے ہر دم ساتھ ہی رکھتا ہوں۔“

معمر آدمی کوئی جہاں دیدہ اڈا گیر تھا۔ ہوسکتا ہے، میدا اسی کا پروردہ ہو۔ میدا نے اس کے ہاتھ کو بوسہ بھی دیا تھا۔ جس مہارت سے معمر آدمی نے میری جانب چاقو پھینکا اور میرا چاقو اچکا تھا، کچھ اسی طرح نپا تلا اس کا لب و لہجہ تھا۔ اس ساری حکمت کی صراحت اس نے ضروری سمجھی۔ وہی اس کی مقامی طرز بیان تھی۔ اس نے کہا کہ کسی فیصلے تک پہنچنے میں دیریوں ہوئی کہ اجنبی نوجوان (یعنی میں) مختلف صورت حال میں یہاں آیا ہے۔ اڈے کے تین آدمیوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعے میں وہ ملوث ہے۔ ان تینوں میں ایک تو زندگی ہار بیٹھا ہے۔ اڈے کا ہر آدمی اپنے پرانے ساتھی کی ناگہاں موت، اس کی جدائی پر دل گیر ہے۔ خطا کار کو بدترین انجام تک پہنچائے بغیر کسی کو چین نہیں آئے گا۔ نوجوان کی طرف سے اڈے کے استاد سے چوکی سے اتر جانے کا مطالبہ اور اسی کے ہاتھوں یا اس کی وجہ سے چند گھنٹے پہلے اڈے کے سرکردہ آدمی کے خون کا واقعہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔ نوجوان کو اس ستم گری کی سزا ضرور ملنی چاہیے اگر واقعی وہ مرتکب پایا جائے۔ رہا اڈے کی چوکی پر قبضے کا معاملہ، تو استاد میدا اڈے کے ریتی رواج سے خوب واقف ہے۔ بے شک کوئی بھی، کسی وقت حاضر استاد کی نااہلی پر انگلی اٹھا سکتا اور اپنی اہلیت کا دعوا کرسکتا ہے۔ ثابت کردینے پر اڈے کی سربراہی اسی کو سزاوار ہے۔

نوجوان محض اڈے کی چوکی پر حق جتانے آتا تو

ذکر صورت ہوئی۔ فیصلے میں ایسی دیر نہ لگتی لیکن دو باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ نوجوان کا کہنا ہے کہ اس کا بھائی شہر کے اسپتال میں زیرِ علاج ہے اور تیمار دار اس کے سوا کوئی نہیں، اور بھائی کے پاس اسپتال پہنچنا اس لیے ممکن نہیں رہا کہ استاد میدا کے حکم سے شہر کے راستے اس پر بند کر دیے گئے ہیں۔ استاد میدا اور اس کی گدی سے اسے ایسا سروکار نہیں۔ مجبوری میں یہی ایک تدبیر اسے سجھائی دی کہ اڈے کے استاد کو بے دخل کر کے خود اڈے کا استاد بن جائے۔ سامنے اڈے کا مستند استاد ہو تو ذہنی انتشار یا کسی بے حد شخصی اعتماد ہی میں کوئی اتنا بڑا دعوا کر سکتا ہے۔

استاد میدا نے اپنے ساتھیوں کے مشورے اور شہر کے معزز شخص وکیل اکبر علی خاں کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے نوجوان کے راستے میں حائل بندشیں دور کر دی ہیں اور مبارزت سردست ملتوی کر دی ہے۔ میدا استاد اور اس کے ساتھی شقاوت اور سنگ دلی کا کوئی الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتے اور حقیقت جاننے کے خواہش مند ہیں۔ اس مہلت سے انہیں حقائق کی چھان بین کا اچھا موقع مل جائے گا اور جیسا کہ وکیل صاحب کا خیال ہے، وہی سچ ہوا تو نوجوان خاطر جمع رکھے، اڈے کی طرف سے وہ ہر قسم کے بغض و عناد سے مبرا ہو گا۔

چاقوؤں کی منتقلی سے مراد ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان پنجہ آزمائی بہ وجوہ ملتوی کی گئی ہے، ختم نہیں، انکار نہیں کیا گیا۔ التوا کی رعایت میدا استاد کی کشادہ دلی اور خود اعتمادی پر محمول کی جائے کہ ذہنی فشار سے دوچار اپنے مقابل سے معرکہ آرائی وہ اس وقت مناسب نہیں سمجھتا۔ اس اعتراف کے باوجود کہ اڈے کی چوکی سے نوجوان کو کوئی واسطہ نہیں، بھائی کی صحت کی بحالی کے بعد اسے بہرحال اپنے دعوے کی پے روی کے لیے اڈے واپس آنا ہے۔ اس نے اڈے کے اتنے لوگوں کے سامنے ان کے استاد کی بھی حیثیت پر کیچڑ اچھالی ہے۔ اڈوں کی روایت کی تعمیل استاد میدا پر لازم ہے۔ اسے ثابت کرنا ہے کہ وہی اڈے کی گدی پر برقراری کا حق رکھتا ہے۔ اس کے ساتھی بھی اسی کو اڈے کے استاد کی حیثیت سے دیکھتے رہنا چاہتے ہیں۔ استاد میدا ان پر سایہ بنا رہا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ زور اور چاقو بازی میں دور دور تک اس کا ثانی نہیں اور وہی ان کے درمیان رہے گا، اور وہ بھی جانتے ہیں کہ اڈے کے دو طلب گار ایک دوسرے کے مقابل ہوں تو کسی ایک کو اپنی توانائی کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ نوجوان نے اپنی برتری ثابت کر دی تو استاد میدا کے جاں نثار، اڈے کے یہی لوگ اس کے خیر مقدم میں کوئی بخل بھی نہیں کریں گے کہ اڈوں کا یہی طور ہے۔ اس عارضی مدت میں نوجوان خود کو ہر طرح محفوظ سمجھے۔ نگرانی کے باوجود اڈے کا کوئی آدمی اس سے باز پرس نہیں کرے گا۔ نوجوان بھی گرہ میں باندھ لے کہ اسے اڈے واپس آ کے مبارزت کا موقوف معاملہ نمٹانا ہے۔ استاد میدا اس کی جلد واپسی کا منتظر رہے گا۔ اس دوران اس نے شہر سے فرار کی کوئی حرکت کی تو وکیل اکبر علی خاں کو ذمے دار سمجھا جائے گا۔ وہ نوجوان کی ہم دردی میں اس کے ساتھ آئے ہیں اور انہوں نے اس کے حق میں اڈے کے استاد کو قائل کرنے کی موثر کوشش کی ہے۔ یہ پہلو وکیل اکبر علی خاں کے ذہن نشیں رہے کہ ان کا واسطہ اسی شہر سے ہے اور اڈے کے لوگ ایک حد تک ہی فیاضی اور درگزری کی استطاعت رکھتے ہیں۔

اڈے پر سناٹا چھایا رہا۔ معمر آدمی کا لہجہ اتنا درشت تھا نہ ایسا نرم۔ سکوت میں اس کی بوڑھی آواز کی گونج بڑھ گئی تھی۔ میں پورے انہماک سے سنا کیا۔ عدالت کے کسی جج کے مانند اس نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ میں نے اسے نہیں ٹوکا کہ یہ اکبر علی خاں بیچ میں کیسے آ گئے۔ میرے ساتھ ان کے آ جانے،

ہم دردی کا اظہار کرنے اور حقیقت حال سے آگاہ کرنے سے مراد میری ضمانت کہاں ہوئی۔ ضمانت وغیرہ کا تو کوئی ذکر ہی نہیں آیا۔ کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن نہ معمر آدمی چاہتا تھا نہ میں نے اس کی یاوہ گوئی پر حرف زنی مناسب سمجھی۔ ایسی پیچیدہ اور نازک صورت حال میں گھرا آدمی یہی کچھ کر سکتا تھا، اور مجھے غنیمت جان کے خاموش رہنا تھا۔ مجھے تو اڈے سے نکلنے اور اسپتال پہنچنے کی جلدی تھی۔ اخلاقاً اس کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے تھا لیکن یہ تشکر میری جانب سے ان ساروں پر مرتب ہونے والے تاثر کی نفی کرتا۔ معمر آدمی کی سوجھ بوجھ سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اڈے پر اسی کا دماغ کام کرتا ہے۔ اس نے اڈے کے لوگوں میں میدا کا وقار اور دبدبہ بحال رکھنے اور دوسری طرف اڈے کو کسی ناخوش گوار واقعے سے محفوظ کرنے کے لیے اپنے جتن خوب کیے تھے۔ اس نے ہر گوشے اور ہر سمت کا خیال رکھا تھا۔ اس کا نام مجھے اب تک معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اڈے سے رخصت کے وقت کچھ رسمی کلمات ادا کرنے ضروری تھے۔ میں نے کھنچی ہوئی آواز میں معمر آدمی کو مخاطب کیا۔ ”میں آؤں گا بڑے صاحب۔ تسلی رکھیں، مجھے اپنا چاقو واپس لینا ہے۔ میں ضرور آؤں گا، پھر دیکھ لیں گے۔“

یہ اختصار ہی اس وقت موزوں تھا۔ معمر آدمی کی بھی یہی خواہش ہوگی۔ میں نے اکبر علی خاں کو اشارہ کیا۔ وہ تو گم سم سے تھے۔ میرے ٹوکنے پر چونک پڑے۔ سامنے چوکی پر بیٹھے اور ادھر ادھر کھڑے اڈے کے لوگوں کو ہم نے پھسلتی نظروں سے دیکھا اور دروازے کی طرف پلٹ گئے۔ پیچھے کھڑے لوگوں نے دائیں بائیں ہٹ کے ہمارے لیے راستہ بنا دیا۔ ہم دروازے سے نکلنا ہی چاہتے تھے کہ معمر آدمی کی بلند آواز پر رکنا پڑا۔ اکبر علی خاں کو اس نے پکارا تھا۔ وہ ان سے معذرت کرنے لگا۔ ”آپ پہلی بار ادھر آیو ہو وکیل ساب، اور ہم تمری کوئی آؤ بھگت نہ کر سکے۔ سمے ہی الٹا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں دھنوا بابو کی لاش آ رہی ہے۔ ادھر سبھی اسی کارن اکٹھے ہیں۔ آپ جانو اس سمے......“ معمر آدمی کی آواز چیخنے لگی۔

اکبر علی خاں نے سر جھکا کے سلام کرنے کے انداز میں ہاتھ اٹھایا، جواب دینے کی کش مکش سے دوچار رہے اور کچھ کہہ نہ پائے۔ معمر آدمی کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ اس نے بھی ہاتھ اٹھا کے سلام کا جواب دیا اور اکبر علی خاں کو مشکل سے نکالنے کے لیے لمحے بھر بعد استاد میدا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے اکبر علی خاں کو ٹہوکا دیا تو وہ گھبرا سے گئے اور کسی معمول کے مانند میرے ساتھ چل پڑے۔

اڈے کی عمارت میں اب شور پھوٹ پڑا تھا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ بھاگ کر فاصلہ طے کروں لیکن ہم دونوں متوازن رفتار سے عمارت سے نکل آئے، درمیانی کھلا حصہ اور ڈیوڑھی عبور کر کے سڑک پر آ گئے۔ عمارت کی طرف جاتے ہوئے دو تین آدمیوں سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ اندر سے کوئی ہمارے پیچھے نہیں آیا۔ چار دیواری کے باہر بھی اکا دکا آدمی موجود تھے۔ تانگے والا قریب ہی گلی میں ایک کنارے کھڑا ہمارے انتظار میں پریشان پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اضطراب کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ اڈے کے آدمیوں کی زبانی اسے کچھ بھنک مل گئی ہو۔ یہ تو اسے اچھی طرح معلوم ہی تھا کہ یہ جگہ کون سی ہے۔ تانگے کی پچھلی نشست پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ دھوپ کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ آگے چوک کی دکانوں کی چہل پہل بھی کم تھی۔ گلی اور چوک سے گزر کے ہم چوڑی سڑک پر آ گئے اور گھوڑے نے سرپٹ بھاگنا شروع کر دیا۔

اکبر علی خاں نے شیروانی کے اوپر کے بٹن کھول دیے۔ کئی بار انہوں نے پیشانی پر ابھرنے والی بوندیں رومال سے خشک کیں۔ دور آ جانے کے بعد ان کے چہرے پر آتے جاتے رنگ ٹھیر سے گئے تھے۔ دیر تک انہوں نے مجھ سے کوئی کلام نہیں کیا۔ میں نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو جیسے انہیں لب کشائی کا حوصلہ ہوا۔ ان کے ہونٹ کپکپائے، ان سنائی آواز میں بولے۔ ”یہ سب کچھ کیا تھا میاں؟“

”جو آپ نے دیکھا، وہی تھا۔“ میں نے کہا۔

”مگر، مگر یہ کیا ہوا بھائی؟“

”کیا ہوا۔“ میں نے آنکھیں میچ کے کہا۔ ”جو ہونا تھا، وہی ہوا۔“

”آپ، آپ کو اندازہ تھا؟“ وہ حیرانی سے بولے۔

”وہاں جا کے کچھ دیر بعد ہو گیا تھا۔“

”یعنی کہ ہم، ہم اس طرح......“

”اس طرح چلے آئیں گے۔“

”ہاں میاں!...... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔“

”آپ کیا سمجھ رہے تھے؟“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ ایسی جگہ اور ایسے لوگوں سے پہلی مرتبہ سابقہ پڑا تھا۔“ اکبر علی خاں وحشت زدگی سے بولے۔ ”دل دھڑکتا رہا کہ آنے والا لمحہ کیا رخ اختیار کر لے، کس کروٹ جا بیٹھے۔“

”آپ نے بڑی جرات کی۔“ میں نے کہا۔

”کیسی جرات۔“ اکبر علی خاں ہیجانی انداز میں بولے ”جو منہ آیا، بکتا گیا۔ بس یقین تھا کہ سچ کہہ رہا ہوں۔ جسے آپ جرات کہہ رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تھی۔“

”ورنہ یہ سب کچھ مجھے کہنا پڑتا، ویسے میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ دخل دیں۔“

”مجھے معلوم تھا لیکن میں کب تک چپ رہتا، سوچا کہ شاید اسی طرح کچھ بات بن جائے۔“

”آپ نے میرا کام آسان کر دیا۔“

”کیا کر دیا۔“ اکبر علی خاں بکھری ہوئی آواز میں بولے۔ ”ایک بات تو بتائیے میاں، اگر واقعی وہ بدذات مقابلے پر آمادہ ہو جاتا؟“

”نہیں ہوتا۔“

”کیوں، کیسے...... یہ آپ وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

”جس وقت اسے ہونا چاہیے تھا، اس نے وہ وقت نکال دیا تھا۔“

”لیکن اگر ہو جاتا، فرض کیجیے، اگر ہو جاتا؟“

”تو میں تو اسی غرض سے گیا تھا۔“

”یعنی آپ......“ وہ ست پٹا کے بولے۔ ”آپ!“

”ہاں“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”یوں تو ہو کچھ بھی سکتا تھا لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھا۔ مجبوری کی بات دوسری ہے۔ اس لیے میں بار بار اسے دعوت دیتا رہا۔ ہو سکتا ہے، اس نے مجھے پاگل دیوانہ سمجھا ہو کہ ایسے شخص کے منہ لگنا ٹھیک نہیں۔ ایسا شخص تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”مجھے تو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا۔“ اکبر علی خاں سراسیمگی سے بولے۔ ”آپ اس کی عزت نفس پر مسلسل وار کر رہے ہیں، اس کے اتنے بہت سے ساتھیوں کے سامنے، کہیں اس کی غیرت کا پیمانہ چھلک نہ جائے۔“

”اور اس کی محتاط روی کی وجہ بھی تو یہی ہو سکتی ہے کہ اڈے کے اتنے لوگوں کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑ جائے۔“

”ہاں ہاں، یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے۔“ اکبر علی خاں اضطراری لہجے میں بولے۔ میرے چہرے پر ان کی بے قرار نظریں منڈلا رہی تھیں۔ ”لیکن ایک بات...... ایک بات سے مجھے آپ نے مطمئن نہیں کیا۔“

”میں آپ کو ہر بات سے مطمئن کر دوں گا۔“ میں نے نرمی و شائستگی سے کہا۔ ”مگر اس وقت مجھ

سے کوئی سوال جواب مت کیجیے۔ میں آپ کو ابھی کچھ نہ بتا پاؤں گا۔ اس وقت تو بس کسی طرح جلد سے جلد اسپتال......"

"مناسب ہے۔" وہ کسمسا کے چپ ہو گئے اور کچھ توقف بعد آہستگی سے بولے۔ "گھر نزدیک ہے۔ آپ نے دوپہر بھی کچھ نہیں کھایا۔ کچھ دیر ٹھیر کے کیوں نہ اسپتال چلیے، زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

"نہیں، ابھی نہیں۔" میں نے صاف انکار کر دیا۔ "نہ جانے میرے وہاں نہ ہونے پر کیا چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں۔ ڈاکٹر رائے کیا سوچ رہا ہوگا اور بٹھل بھائی کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو مجھے پاس نہ دیکھ کے وہ تو بہت پریشان ہو جائیں گے۔ نرس کتنے ہی عذر کرے لیکن آپ نہیں جانتے، وہ کیسے آدمی ہیں۔ اس حالت میں وہ اٹھ کھڑے نہ ہو جائیں۔ انہیں ذرا بھی شبہ ہو گیا، کتنی ہی حالت خراب ہو، وہ نکل پڑیں گے۔ وہ ایسے ہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" اکبر علی خاں اداسی سے بولے۔ "آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کو پہلے اسپتال ہی جانا چاہیے۔"

"جیسے ہی ان کی طرف سے تسلی ہوئی، میں آپ کے گھر آؤں گا۔ مجھے تو آپ سب سے دست بستہ معافی مانگنی ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب، کیا میں آپ کے ساتھ اسپتال نہیں جا سکتا؟" وہ شکایتی انداز میں بولے۔

"جا سکتے ہیں، کیوں نہیں مگر دیر ہو گئی ہے۔ پہلے آپ کو گھر جانا چاہیے۔ وہاں سب آپ کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

"آپ کو مجھے اپنے ساتھ لے جانے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" ان کے شکوے میں ناراضی بھی شامل ہو گئی تھی۔

"نہیں نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" میں نے معذرت کی۔ "مجھے تو ادھر گھر والوں کی فکر ہے۔ انہیں مطمئن کر کے کچھ دیر بعد آپ اسپتال آ جایئے۔"

"نہیں جناب، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوا یہ کیا بات ہوئی۔" اکبر علی خاں فیصلہ کن لہجے بولے۔

انہوں نے کوچوان کو کچھ ہدایت کی۔ ا ڈیڑھ فرلانگ بعد تانگا دائیں طرف کی سڑک مڑ گیا۔ دفتر بند ہونے کا وقت تھا۔ سڑکوں سواریوں اور پیدل چلنے والوں کی بھیڑ ہو گئی تھ تانگے کی رفتار میں بھی فرق آ گیا تھا۔ جیسے اسپتال نزدیک آ رہا تھا، میرا دل بیٹھا جاتا میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا اور مجھے کسی جر احساس ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں، یہ کیسی ندامت تھی مجھے ہلکان کر رہی تھی۔ غلطی میری ہی تھی۔ اسپتال سے نکلتا، نہ یہ سب کچھ پیش آتا۔ پھر ج جیب کترے نے بٹوا اڑا لیا تو اس کے تعاقب حماقت دوسری غلطی تھی۔ اکبر علی خاں کا ہیج و اضطراب بے جا نہیں ہے۔ میں نے انہیں ج تیسے چپ کرا دیا ہے لیکن استاد میدا کے اڈے پر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھ بہرحال اب پشیمانی سے کیا حاصل تھا۔ آدمی غلطیاں ہوتی ہیں۔ زندگی میں غلطیوں کا کتنا د ہے۔ غلطیوں سے زندگی کا سلسلہ چلتا ہے، غلطیاں، زیادہ غلطیاں، چھوٹی غلطیاں، بڑ غلطیاں۔ کبھی بڑی غلطی سے کچھ نہیں ہوتا، کبھی ای چھوٹی غلطی زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہے۔ آدی اشرف المخلوق کہا جاتا ہے۔ آدمی تو بہت ناقص بہت ادھورا ہے۔ ایک دماغ ہی اس کے قابو م نہیں تو کس بات کا افتخار، کیسی برتری۔ کہتے ہیں آدمی دماغ کے سوا کچھ نہیں اور دماغ تو بہکتا، بھ رہتا ہے۔ دماغ کو آدمی کا مطیع ہونا چاہیے نا کہ دما آدمی پر حاوی ہو۔ دیکھا جائے تو آدمی سارا گرد سے اوپر ہے، یہ کم قامتی، دراز قدی تو ایک گما ہے۔ آدمی کے قد کی پیمائش تو گردن سے اوپر

حصے سے ہونی چاہیے۔

ایک جگہ سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ تانگے کو گھوم کے جانا پڑا۔ دھوپ سمٹنے لگی تھی۔ پانچ بج چکے تھے۔ تانگے والے کو کرایہ ادا کرنے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا، اکبر علی خان سامنے آ گئے اور انہی نے پیسے ادا کیے۔ تانگے کی نشست کے نیچے رکھا ہوا بیگ بھی انہیں یاد تھا۔ میں تو بھول ہی چکا تھا۔ انہوں نے بیگ بھی مجھے اٹھانے نہیں دیا اور میرا ہاتھ تھامے ہوئے اسپتال میں داخل ہو گئے۔

شام کے وقت اسپتال میں عیادت کاروں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ہم نے جلدی جلدی فاصلہ طے کیا۔ بٹھل کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میری سانس پھولنے لگی تھی۔ اسپتال کے اس حصے میں جہاں سب سے کشادہ اور آرام دہ کمرے بنے ہوئے تھے، نسبتہً سکون تھا۔ میں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ جسم کو جھٹکا سا لگا۔ کئی ڈاکٹر اور نرسیں بٹھل کے بستر کے گرد موجود تھے۔ میں نے بے اختیار اکبر علی خاں کو دیکھا۔ انہوں نے بیگ ایک کونے میں رکھ کر میرا شانہ تھپ تھپایا۔ ہم بے قدموں پلنگ کی طرف بڑھے اور ڈاکٹروں کے پیچھے جا کے کھڑے ہو گئے۔ میں آگے جانے کے لیے بڑھ گیا تھا۔ اکبر علی خاں نے مجھے روک ا۔

ڈاکٹر نرسوں کو ہدایتیں دیتے اور دھیمی تیں کرتے رہے۔ ان میں ڈاکٹر رائے بھی تھا۔ ں نے ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی لیکن میرے تو اس ہی منتشر تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چند ٹ بعد ڈاکٹر رائے، بٹھل کے بستر سے ہٹ گیا۔ ہ اپنے ساتھی ڈاکٹروں سے مشورہ کر رہا تھا کہ اس نظر مجھ پر پڑی اور وہ چونک پڑا۔ "تم، تم کہاں تھے؟" اس نے میری جانب انگلی اٹھا کے انگیریزی ں پوچھا۔

"کیا، کیا حال ہے ان کا؟" میں نے جھجکتی آواز میں کہا۔

اس نے شانے اچکائے۔ "ابھی دماغ کے ایک ماہر ڈاکٹر، ڈاکٹر فرینکی کو بلا کے دکھایا ہے۔ اتفاق سے ان دنوں وہ انگلستان سے لیکچر دینے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایکس ریز دیکھ لیے گئے ہیں، کچھ اور ڈاکٹر فرینکی نے بھی تجویز کیے ہیں۔" اس کے لہجے میں درشتی تھی۔

"سب ٹھیک تو ہے ڈاکٹر صاحب؟" میں نے اٹکتی زبان سے پوچھا۔

اس نے فکر مندانہ انداز میں سر ہلایا۔ "ہم کوشش کر رہے ہیں۔"

"یہ تو ایک فرسودہ جملہ ہے۔ اس سے مریض اور تیمار دار کی تشفی نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے، آپ اپنی کوشش کر رہے ہوں گے لیکن مجھے کچھ اور بتایئے۔"

اس کا جسم تن گیا، چہرے پر رنگ آیا۔ "اس کے سوا بتانے کو ابھی کچھ نہیں۔" وہ بے گداز آواز میں بولا۔

"ایکس ریز میں اور کیا کیا......اور کیا......؟"

مجھ سے پوچھا نہ جا سکا۔

"ابھی کچھ خاص نہیں۔ ٹرین کے جھٹکے سے سر کے اوپر کی جلد پچک گئی ہے۔ سر کا خول کسی حد تک متاثر ہوا ہے اور گردن......کچھ رپورٹیں اور آنی ہیں۔ ان کا انتظار ہے۔ تمہیں بتایا گیا تھا کہ بعض رپورٹیں آنے میں ایک دو دن لگ سکتے ہیں۔ دوائیں دی جا رہی ہیں۔ آپریشن کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔" ڈاکٹر نے لگی بندھی آواز میں بتایا۔ "پر تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"میں معافی چاہتا ہوں سمجھیے، کوئی ان ہونی پیش آ گئی تھی۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"راستہ بھول گئے تھے؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا، آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔"

اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''میرے لیے کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔'' میں نے عاجزانہ کہا۔

وہ مسکرا پڑا اور میرے گال پر ہلکی سی چپت رسید کی۔'' حوصلہ رکھو نوجوان آدمی، رات کو پھر آؤں گا یہاں۔ مریض کو دوسری دواؤں کے ساتھ نیند کی دوا بھی دی ہے۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے، اور تمہیں بھی......'' وہ میری سینے پر ٹھونگا مارتا ہوئے بولا۔'' لگتا ہے تم نے بھی اچھا وقت نہیں گزارا، کچھ تازہ دم ہو جاؤ اور تم بھی کچھ دیر کے لیے آرام کر لو۔ نرس تمہارے بھائی کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہے اور دیکھو!'' اس نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''تیماردار کی حالت مریض پر اثر انداز ہوتی ہے۔''

اس نے ساتھ رکے ہوئے ڈاکٹروں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ دوسرے لمحے وہ سارے کمرے سے چلے گئے۔ صرف ایک نرس رہ گئی۔ معاً مجھے جانے کیا ہوا، کمرے سے بھاگ کے میں نے ڈاکٹر رائے کا تعاقب کیا۔ وہ ابھی چند قدم دور ہی گیا ہوگا کہ راستہ روک کے میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس پر حیرانی طاری ہوئی۔ میں نے اس کے ہاتھ، اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔'' آپ انہیں ٹھیک کر دیجیے ڈاکٹر صاحب۔'' یہ التجا کرتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

''تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ چڑ سا گیا، پھر اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے مشفقانہ انداز میں کہا۔'' یہ ہمارا پیشہ ہے، فرض بھی۔ ہر مریض ہمارے لیے ایک چیلنج ہوتا ہے میرے بچے، ہماری طرف سے تم کوئی فکر مت کرو۔''

میں نے اپنی پلکیں اس کے ہاتھوں سے مس کیں۔'' اب آپ ہی ہیں ڈاکٹر صاحب۔'' میری آواز ڈول رہی تھی۔'' خدا کے لیے......''

جواب میں اس نے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کے میرے بال بکھیر دیے اور آگے بڑھ گیا۔

اکبر علی خاں بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آ گئے تھے۔ کمرے میں واپس آ کے جھجکتے ہوئے ہم نے بٹھل کے بستر کا رخ کیا۔ میں نے تو آنے کے بعد اس کی شکل ہی نہیں دیکھی تھی۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بہت سفر کیے۔ وہ تو نیند کی جیسے کوئی رسم ادا کرتا تھا۔ ذرا سی آہٹ پر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ تو سوتے میں جاگتا رہتا۔ کل رات ڈاکٹر کو کھلے بھی ڈاکٹر رائے سے یہی کہہ رہا تھا کہ اس نے نیند کی طاقت ور گولیاں بٹھل کو دی تھیں۔ اس پر اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہی شخص اب بے سدھ پڑا تھا۔ اس طرح بے خبر تو میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ کے حرارت دیکھی۔ ہاتھ گرم تھا لیکن اتنا نہیں۔ اکبر علی خاں مجھے اس کے پاس سے ہٹا کے صوفے پر لے آئے اور میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔

''اپنے آپ کو سنبھالیے میاں! آپ تو بڑی ہمت والے ہیں۔ اب اندازہ ہو رہا ہے واقعی آپ کیسی اذیت میں تھے۔ وہاں ان لوگوں کے درمیان خود کو کس طرح جکڑ کے رکھا تھا۔ یہاں بھی آپ کو اسی برداشت کی ضرورت ہے۔'' وہ آہستگی سے مجھے سمجھاتے رہے، کہنے لگے۔'' اس سے بڑا اسپتال شہر میں نہیں ہے اور دور دور تک نہیں ہے اور یہ جو ڈکٹر رائے ہے، یہ بھی بہت مشہور ڈاکٹر ہے۔ مزاج کا ذرا سخت ہے، اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا ہے لیکن ہاتھ میں شفا ہے۔ یہ کوئی کسر نہیں چھوڑے گا...... یہ دیکھ کے مجھے تو بڑی حیرت ہوئی۔ آپ کی خاصی تیز باتیں اس نے سہ لیں، ورنہ لوگ کہتے ہیں، وہ تو ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا۔ کیا جادو کیا آپ نے؟''

''معلوم نہیں، میں نے تو سیدھی بات کی تھی۔'' میں نے پژمردگی سے کہا۔

''آپ بھی جادوگر ہیں میاں، خدا نے آپ کو کیسی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ آپ سے ملاقات میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔'' ان کے لہجے سے وارفتگی جھلک رہی تھی۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں تو......''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولے۔'' میں تو بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں، مگر یہ موقع نہیں۔ آپ ڈاکٹر رائے سے کیسی عمدہ انگریزی، کس روانی سے بول رہے تھے۔ میں تو دیکھتا ہی رہا، اور وہاں استاد میدا کے ٹھکانے پر آپ کا تیور کچھ اور ہی تھا۔''

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''خیر جانے دیجیے، پھر بات کریں گے۔ بہت سی باتیں جی میں اُمڈ رہی ہیں، پھر سہی۔ اب آپ ذرا سکون سے بیٹھیے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ یکا یک میرے پاس سے اٹھ گئے۔

نرس سیورین بٹھل کے پہلو میں رکھی تین خانہ کھلی الماری کی چیزیں ترتیب دینے میں مصروف تھی۔ انہوں نے نرس کے پاس جا کے کچھ سرگوشی کی اور آ کے دوبارہ میرے قریب بیٹھ گئے۔'' اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟'' وہ کتراتی ہوئی آواز میں بولے۔'' میرا مطلب ہے آپ نے کیا سوچا ہے؟''

میری سمجھ میں نہیں آیا، وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

''کسی کو خبر کیجیے گا؟'' انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا'' مجھے نہیں معلوم، آپ کے کنبے خاندان کی کیا صورت ہے لیکن میرا خیال ہے، بہتر ہوگا، کسی قریبی عزیز، عزیزہ کو بلا لیں، اگر کوئی آ سکے۔ آپ کی دوسراہٹ ہو جائے گی۔ آپ کا یہاں سے نکلنا تو مشکل ہے اب، اور کہیں جایئے بھی تو کیوں۔ میں انہیں تار دوں گا۔''

''ہاں ہاں۔'' میں نے بے سوچے سمجھے گردن ہلا دی۔

''سوچ لیجیے آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ کس کے آنے سے بھائی صاحب کو تسلی ہو سکتی ہے اور کون آپ کا بوجھ کم کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔'' ان کے محتاط لہجے میں کسی قسم کی مغائرت نہیں تھی۔

''سوچتا ہوں، کسی کو کیوں پریشان کروں۔ میں اکیلا ہی ان کی دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔ مجھے اور کون سا کام ہے، اور اس سے بڑا کام میرے لیے اور کیا ہو سکتا ہے''

''یہ کمال کی سعادت مندی اور محبت ہے۔ ٹھیک ہے، کسی کو مت بلایئے اور پھر میں بھی تو ہوں یہاں آپ کے ساتھ۔ مجھے بھی کوئی ایسے کام نہیں۔ ہفتے میں چار دن کالج جاتا ہوں، تین چار گھنٹوں کے لیے۔ چند دن نہیں جاؤں گا۔''

''آپ کی مہربانی ہے مگر آپ اپنے مشاغل جاری رکھیے۔ آپ کو میں نے پہلے ہی کیا کم دکھ دیا ہے۔ اس وقت کا خیال آتا ہے تو اپنے آپ سے چڑ ہوتی ہے۔ آپ سب کو اذیت دینے کے بجائے سیدھا میدا کے اڈے پر چلا جاتا تو......''

''واہ صاحب!'' اکبر علی خاں سرتاپا بے قرار سے ہو گئے۔'' اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ بے شک وہ ایک بڑی، بہت بڑی اذیت تھی لیکن اس کا صلہ کیسا دل نواز ہے۔ آپ کو ایسی صورت حال میں یہی کچھ کرنا چاہیے تھا۔ بخدا، سوچتا ہوں، آپ کے بارے میں۔ کسی اجنبی گھر کے دروازے پر دستک دینے......اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ......وہ سب کچھ کرتے ہوئے آپ خود کیسی اذیت میں ہوں گے۔ کیا ہی اچھا ہوا، وہ ہمارا گھر تھا، کسی اور کا بھی ہو سکتا تھا۔''

''شکر ہے۔ وہ آپ کا گھر تھا۔ ایک نفیس طبع، معاملہ فہم اور شفیق آدمی کے گھر کے دروازے کی طرف میرے قدم اٹھ گئے۔ گھروں کے انتخاب کا تو موقع ہی نہیں تھا۔ کسی دوسرے گھر میں جانے کیسے لوگوں سے سامنا ہوتا۔''

''اسی کو شاید حسن اتفاق کہتے ہیں۔'' وہ مسکرا کے بولے۔

اکبر علی خاں نے کسی کو بلا لینے کا نہایت صائب مشورہ دیا تھا۔ میں خود اسی شش و پنج میں تھا، کسے بلاؤں، کسے نہیں۔ بٹھل کی نسبت سے زریں کا چہرہ ہی سب سے پہلے سامنے آتا ہے۔ تار ملتے ہی وہ چل پڑے گی۔ ارشد، تنویر اور جہاں گیر فیض آباد میں ہیں۔ اب تو نصیر بابا بھی وہیں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے ہم راہ وہ آسکتی ہے اور نیساں، سلمٰی اور خانم وغیرہ میں کسی کو بھی ساتھ لا سکتی ہے۔ اسپتال میں رات کے وقت ایک ہی تیمار دار رہ سکتا ہے، باقی دوسرے گرانڈ ہوٹل میں رات گزار لیں گے۔ زریں سے زیادہ بٹھل کی خدمت کون کر سکتا ہے۔ مسیحائی تو اس کا ہنر ہے۔ آدمی دھوپ ہوتا ہے آدمی چھاؤں، کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔ زریں تو سر بہ سر کوئی شجر سایہ دار ہے۔ اس گل اندام کا تو وجود ہی شبنم سے، ریشم سے عبارت ہے۔ آدمیت کا اس سے سوا اعلیٰ ترین وظیفہ کیا ہو سکتا ہے کہ خود کو دوسروں پر ترک کر دیا جائے۔ اس کی مثال تو شمع کے مانند ہے جو روشنی بکھیرتی اور تمام ہوتی رہتی ہے۔ اپنے سرہانے اسے دیکھ کے بٹھل کو بہت سکون ہوگا۔ وہ اس کی بات بہت مانتا، بہت اس کے ناز اٹھاتا ہے۔ اس شیوۂ ناز برادری کے تسلسل کے لیے لازم ہے کہ وہ جلد سے جلد ٹھیک ہو جانے کی کوشش کرے۔ زریں اس کے لیے امید کا درجہ رکھتی ہے۔ امید ہی تو زندگی کی توانائی ہے۔ امید بجائے خود زندگی ہے۔

ادھر کلکتے بھی تار دیا جا سکتا ہے۔ تار پہنچنے کی دیر ہوگی۔ زورا، جمرو اور جامو کو ذرا سی تاخیر گوارا نہ ہوگی۔ ان میں سے کوئی بھی کل رات یا زیادہ سے زیادہ پرسوں صبح تک یہاں آ جائے گا لیکن زریں ہو، جامو ہو یا جمرو اور زورا۔ آج صبح ہی ڈاک خانے سے پٹنا شہر پہنچنے کی اطلاع انہیں دی ہے۔ اسی دن دوسرا تار ملنے سے سب کھٹک جائیں گے۔ اور انہیں بلانے کے لیے کوئی تو عذر کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی عذر نہ کیا جائے تو بھی انہیں طرح طرح کے وسوسے اور خدشے گھیر لیں گے۔ زریں تو بہت ذہین، بہت حساس ہے۔ تار کا مضمون کیسا ہی گھما پھرا کے لکھا جائے، کتنا ہی ہلکا پھلکا ہو، وہ تو ہراساں ہو جائے گی۔ فیض آباد میں اس کی موجودی بھی ضروری ہے۔ ساری حویلی اس کے دم سے آباد ہے۔ ابھی فروزاں اور یاسمن وہاں نئی نئی ہیں۔ حویلی میں ان کی دل بستگی کے لیے زریں کی ضرورت ہے۔ اور انہیں بے خبر رکھنا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ بعد کو سبھی شکایت کریں گے کہ بٹھل سے آخر ان کا بھی کوئی رشتہ، ان کا بھی کوئی حق ہے۔

جتنا میں سوچتا، اتنا ہی الجھ جاتا۔ فیصلے کا مرحلہ ہو تو دماغ کبھی بالکل ساتھ نہیں دیتا، کئی حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک ہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ ابھی کچھ انتظار کرنا چاہیے۔ خدا کرے، بٹھل جلد ہی ٹھیک ہو جائے۔ کل رات وہ اپنے پیروں سے یہاں آیا تھا۔ ایک رات میں اس کا کیا حال ہو گیا۔ کل اس کی حالت میں بہتری بھی آسکتی ہے۔

میں اسی اندیشہ و فکر میں الجھا ہوا تھا کہ اسپتال کی مخصوص وردی پہنے دو مودب ملازم ہاتھوں میں تشت اٹھائے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کے نرس سیورین اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ملازم بسکٹ، کیک پیسٹری، سموسے اور چائے پر مشتمل ناشتے کا سامان لائے تھے۔ اکبر علی خاں صوفے کے آگے رکھی لمبی میز پر تشتریاں اور چمچے رکھنے میں سیورین کا ہاتھ بٹانے لگے۔ یہ سارا ناشتہ انہیں کے ایما پر آیا ہوگا۔ تھوڑی دیر پہلے اسی مقصد سے وہ سیورین کے پاس گئے ہوں گے۔

"اب آپ انکار مت کیجیے۔ مجھے بھی اب کچھ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ دیکھیے، سموسے کیسے گرما گرم ہیں۔" مجھے آمادہ کرنے کے لیے انہوں نے سوداگروں جیسا طریقہ اختیار کیا۔

میری بھوک غائب تھی لیکن منع نہ کیا جا سکا۔ اکبر علی خاں نے سیورین کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اس کی معذرت پر اصرار بھی نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی اور جیسے میں کوئی مہمان ہوں، میزبانہ برتاؤ کرتے رہے۔ چائے پیتے ہوئے مجھ سے کچھ اور قریب ہو کے وہ راز دارانہ انداز میں کہنے لگے۔ ''ایک بات ذہن میں اٹک رہی ہے میاں۔ اسے میرا وہم ہی جانیے۔ اصل میں قانون کے پیشے سے وابستگی ہے۔ ہر دیدہ و نادیدہ پر نظر رکھنے کا مجھے عارضہ سا ہو گیا ہے۔''

''کیا بات ہے؟'' میں نے تردد سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، یہی مناسب رہے گا آپ کسی کو یہاں بلا لیں۔'' وہ رک رک کے بولے۔

''کیوں، کیوں؟'' میں نے الجھ کے پوچھا۔

''دیکھیے، میدا کے ٹھکانے سے ہم بہ سلامت واپس آ گئے ہیں۔ بہ ظاہر سب کچھ درست ہو گیا ہے لیکن، لیکن......'' وہ پہلو بدلنے لگے۔

''لیکن کیا؟''

''ایسے لوگوں کا کیا بھروسا۔ بدماغ لوگ ہیں۔ کسی وقت دماغ پھر جائے۔ مرنے والے کی آخری رسوم کے وقت وہاں موجود لوگ بھڑک نہ جائیں۔ اپنے ساتھی کے اس طرح جدا ہو جانے کا صدمہ انہیں مشتعل بھی کر سکتا ہے، اور کتنے ہی وہ میدا کے فرماں بردار ہوں، برہمی میں اس سے باز پرس بھی کر سکتے ہیں کہ ایسی آسانی سے آپ کو کیسے جانے دیا گیا۔ ٹھیک ہے، وہ لوگ اس وقت خاموش رہے لیکن ضروری نہیں، بعد کو بھی چپ سادھے رہیں۔ بعد کی کیا ضمانت ہے۔ میری مراد ہے، میدا کے ٹھکانے کا کوئی آدمی، مرنے والے سے زیادہ قریب کوئی بھی جنونی آدمی پولیس کا رخ نہ کر لے۔ اور وہی بات ہوگی، پولیس تو تماشے کی منتظر رہتی ہے۔ فرض کیجیے، ایک فی صد بھی میرے اس خدشے کا امکان ہے تو یہاں بھائی صاحب کی تیمارداری کے لیے کوئی عزیز تو موجود ہوگا۔ کم از کم ایک طرف سے سکون رہے گا۔ دوسری جانب رہا پولیس سے نمٹنے کا معاملہ...... دیکھ لیا جائے گا پھر...... مگر کچھ وقت تو قانونی مراحل میں لگ جاتا ہے۔''

میرا لحاظ تھا یا اپنے مدعا پر مبالغے کے شبہے نے انہیں آ گھیرا تھا، وہ لفظ چبا چبا کے بول رہے تھے۔ انہوں نے ایک فی صد امکان کی بات کی تھی۔ ان کا اندیشہ ایسا غلط نہیں تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''سمجھے آپ؟'' میری خاموشی پر وہ مایوس سے ہو گئے اور کسمسا کے بولے۔ ''میں نے کچھ زیادہ قیاس تو نہیں کر لیا؟''

''نہیں'' میں نے ان کی ہم زبانی کی۔ ''بے شک کچھ بھی ممکن ہے۔''

اکبر علی خاں ان لوگوں سے واقف نہیں تھے اور ان کے سامنے اڈوں کے طور طریقوں کی تشریح بھی مناسب نہیں تھی۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ ''آپ کے خدشات بجا ہیں لیکن ایسا ہونا نہیں چاہیے۔''

''نہیں ہونا چاہیے۔ دس از پازیٹو تھنکنگ مگر جناب، میں تو ایک فی صد کی بات کر رہا ہوں۔ نظر تو ہمیں ہر طرف رکھنی پڑے گی، رکھنی چاہیے۔''

''وہ ایسے بدعہد لوگ نہیں ہیں۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''میاں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' ان کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

''میں انہیں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''یعنی آپ پرامید ہیں کہ اب ان شورہ پشتوں کی طرف سے کسی کینے اور عداوت کا امکان نہیں ہے؟'' اکبر علی خان کے لہجے میں ناراضی بھی تھی، طنز بھی تھا۔

جرح کرنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے ان کی دل جوئی کے لیے کہا۔ ''نہیں، پوری طرح

نہیں۔''

''یہی تو میں عرض کر رہا ہوں میاں۔'' وہ زور سے کے بولے۔

''ایک دن اور دیکھتے ہیں، کسی کو بلانے اور آنے میں اتنی دیر نہیں لگے گی۔''

وہ ایک مہذب آدمی تھے۔ میری تھکی تھکی آواز سے انہوں نے اخذ کر لیا کہ ان کے وہم و قیاس میری ناگواری و ناسازی کا باعث ہو رہے ہیں۔ ایک تیز فہم شخص کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ تحمل کی تیمارداری کے لیے کسی کو بلانے میں تامل کی وجہ کوئی مجبوری اور مصلحت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ خاموش ہو گئے اور انہوں نے موضوع بدل دینے کی بلاغت کی۔ سموسے کا ایک ٹکڑا میرے سامنے کیا۔ ''منہ سلونا کر لیجیے۔''

میں نے ان کی خواہش کی تعمیل کی۔

''شیرینی منہ میں گھلی رہتی ہے اور ذائقے بدلتی رہتی ہے۔ دیر ہو جائے تو منہ کا مزہ کڑوا سیٹھا ہو جاتا ہے۔ اس کا توڑ نمک ہی سے ممکن ہے۔'' انہوں نے خوش کلامی کی۔

غذا کی اپنی کرشمہ کاری ہے۔ کہتے ہیں، غذا، غم کی توہین ہے لیکن پھر آدمی کیا کرے۔ اپنے بیمار کے ساتھ بیمار ہو جائے۔ کسی جانے والے کے ساتھ خود بھی چلا جائے۔ کیا عجب ہے، دکھ سہنے کے لیے بھی توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے بہت کم کھایا پیا تھا لیکن مجھے اپنا جی کسی قدر ٹھیرا ہوا لگتا تھا، تشنہ شکمی سے دکھ دو چند ہو جاتا ہے اور سیر شکمی سے جاتا نہیں۔ شاید کچھ یوں ہے کہ حالت غم میں اشتہا مٹتی نہیں، دبی دبی، چھپی چھپی رہتی ہے لیکن آدمی کو خود اچھا نہیں لگتا۔ حالت غم میں تو اسے غم ہی عزیز ہوتا ہے۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ سیورین نے کمرا روشن کر دیا۔ دوپہر اکبر علی خاں گھر سے نکلے تھے۔ ان کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ گئے بھی وہ میرے ساتھ تھے، ایک چاقو بردار کے ساتھ جو ان کے گھر میں ناگہانی بلا کی طرح وارد ہوا تھا۔ کتنی ہی بات صاف ہو گئی ہو، میری ہیبت تو ان کے دلوں پر نقش ہو چکی ہوگی۔ اکبر علی خاں کو گھر جانے کے لیے میں ٹوکتے ٹوکتے رہ جاتا تھا۔ کہیں وہ برا نہ مان جائیں۔ غالباً میں بھی کچھ یہی چاہتا تھا کہ وہ یہیں میرے پاس بیٹھے رہیں۔

روشنی کو اپنے اظہار کے لیے اندھیرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اندھیرا جتنا گہرا ہو رہا تھا، کمرے میں جلتے قمقمے اتنے ہی روشن ہوتے جاتے تھے۔ اکبر علی خاں کو خود ہی احساس ہوا، کہنے لگے۔ ''جی تو نہیں چاہ رہا مگر گھر جانا چاہیے۔ مجھے اجازت دیں میاں۔''

''گھر میں سب شدت سے منتظر ہوں گے۔ یہی بہتر ہوتا کہ آپ انہیں بتا کے آتے۔''

''آپ کو نہیں معلوم، نزہت خانم عام قسم کی جذباتی خاتون نہیں۔ ان میں بہت تحمل ہے۔'' اپنی بیگم کا ذکر کرتے ہوئے ان کا لہجہ شیدائیت سے لب ریز تھا۔

''مگر دیر تو ہو گئی ہے۔'' میں نے زیر لب کہا۔

''ہاں، لیکن نزہت ہمیں غیر ذمے دار نہیں سمجھتیں۔'' وہ وثوق سے بولے اور صوفے سے اٹھتے اٹھتے مجھے تاکید کرنے لگے کہ رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھائیں گے، وہ گھر سے کھانا لائیں گے۔

میں نے بہت کہا کہ اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ ایک تو مجھے بھوک نہیں، دوسرے اب رات ہوا ہی چاہتی ہے۔ گھر جا کے وہ آرام کریں اور تازہ دم ہو کے صبح آ جائیں۔

''دل نہیں مانے گا۔ گھر سے یہاں تک کا فاصلہ بھی اتنا نہیں ہے۔ بس میں آ رہا ہوں۔ اب آپ کچھ نہ کہیے۔'' انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔

دروازہ عبور کرتے ہوئے وہ رک گئے اور

بولے۔ ''گھر تو آپ کو یاد ہوگا؟''
''کیوں؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔ ''آپ تو آ ہی رہے ہیں۔''
''بس یوں ہی۔'' ان کا جسم لہرا سا گیا۔ ''ایسے ہی خیال آیا۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی صورت ہو تو مجھے اطلاع مل سکے۔ احتیاطاً میں گھر کا پتا لکھ دیتا ہوں۔''
''کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے ان کا بازو تھام کے کہا۔ ''آپ اطمینان سے جائیے۔''
وہ مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ اسی کیفیت میں دروازے سے نکل گئے۔ کچھ دور تک میں نے ان کا ساتھ دیا پھر ان کے اصرار پر کمرے میں لوٹ آیا اور میرے قدم سیدھے بٹھل کے بستر کی جانب اٹھے۔ اس کی حالت وہی تھی، اپنے آپ سے بے خبر۔ میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ اس کے جسم میں جنبش نہیں ہوئی۔ ناچار میں نے سیورین کی طرف دیکھا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے منع کیا اور جلدی سے اپنے لیے مخصوص کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آ گئی اور میرے پہلو میں کھڑی ہوگئی۔ کسی اچھی خبر کے آسرے میں، میں نے اس سے پوچھا۔ ''اب کیا حال ہے ان کا؟''
میرے لہجے میں چھپی حسرت اس پر عیاں ہوگئی۔ وہ ایک خوش طینت لڑکی تھی، مستعدی سے بولی۔ ''حرارت نہیں ہے اور اچھی علامت ہے۔''
''یہ کوئی بات کیوں نہیں کرتے؟'' میں نے شکستہ آواز میں پوچھا۔
''انہیں مسلسل نیند کی دوائیں دی جا رہی ہیں۔''
''ڈاکٹر لوگ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔
''وہ ہمیشہ پرامید رہتے ہیں۔'' وہ نرمی سے بولی۔
''بتاتے کیا ہیں؟'' میں نے تکرار کی اور اپنے لہجے کی ترشی پر قابو نہ پا سکا۔ ''آپ کو تو کچھ بتایا ہوگا۔''
''ابھی واضح طور پر کچھ نہیں۔'' وہ متانت سے بولی۔ ''لیکن ظاہر ہے، جلد ہی وہ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔''
مجھے اندازہ ہوگیا کہ سادہ و شائستہ سیورین کے پاس میری خوش نودی کے لیے صبح سے کچھ سوا نہیں۔ نرس ایمی کی طرح اس نے بھی مربیانہ انداز میں مجھے آرام کا مشورہ دیا۔ کتنی آسانی سے ایک آدمی، دوسرے آدمی کو سکون و آرام کی تلقین عطا کر دیتا ہے۔ یہ جانے بغیر کے دوسرے کے نہاں خانے میں کیسی شورش بپا ہے۔ سیورین کو یا تو واقعی کچھ معلوم نہیں تھا یا کوئی احتیاط درپیش تھی۔ اس کی اس کم سخنی، رسمی رسمی جواب دہی پر جی میں آتا تھا کہ کسی دوسرے لہجے میں باز پرس کروں مگر میں اسے خشمگیں نظروں سے دیکھا کیا۔ اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ وہ تو ایسی نازک تھی کہ ذرا اونچی آواز پر کھلا، مرجھا جائے۔
''گھبرائیے نہیں۔'' وہ نرم و ملائم آواز میں بولی۔ ''ڈاکٹر رائے رات کو آئیں گے۔ رات کو وہ اسپتال نہیں آتے۔ صرف آپ کی خاطر آئیں گے۔ آپ پر وہ بہت مہربان ہیں۔''
''میرے بجائے میرے بھائی پر مہربان ہوں تو بہتر ہوگا۔''
''انھی کی وجہ سے آئیں گے۔'' میرے لہجے کی تیزی سے وہ اداس ہوئی اور کچھ توقف کے بعد میرا دھیان بٹانے کے لیے دل گداز لہجے میں بولی۔ ''آپ کو اتنی دیر کیوں ہوگئی؟ مجھے تو فکر ہو رہی تھی۔ آپ نے کہا تھا، آپ کے لیے شہر نیا ہے۔''
''لمبی داستان ہے۔ بس ایسے ہی۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔
''ڈاکٹر رائے وقت پر آ گئے تھے۔ وقت کے وہ بڑے پابند ہیں۔ آپ کے بارے میں پوچھنے پر

میں نے ان سے نہیں کہا کہ آپ کو گئے دیر ہوگئی ہے۔ دوسری بار انہوں نے پوچھا تو مجھے بتانا پڑا، لباس تبدیل کرنے اور کچھ ضروری سامان لانے گرانڈ ہوٹل تک گئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔ ڈاکٹر رائے کے مزاج کا کوئی بھروسا نہیں۔ اسپتال میں بھی ان سے دور دور رہتے ہیں۔'' اس کی پلکیں تھرک رہی تھیں۔ جیسا کہ میں سمجھ رہا تھا، وہ ایسی کم سخن بھی نہیں تھی۔ کچھ ایسے تیور سے باتیں کرتی تھی جیسے پہلی بار نیا نیا کچھ بول رہی اور نیا کچھ سن رہی ہو۔
میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اکبر علی خاں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ ''کیا آپ کا ان سے کوئی رشتہ ہے؟''
''رشتوں کے لیے رشتے داری ضروری ہے اور نہ مدت۔'' میں نے کہا۔
''آپ انہیں پہلے سے نہیں جانتے تھے؟''
''ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔''
وہ حیران ہوئی اور مروتاً اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اسی اثنا میں بٹھل نے لمبی سانس کھینچی اور اس کا جسم بے کل سا ہوا۔ صاف نظر آتا تھا کہ درد و کرب کی کوئی لہر اس کے تن بدن میں اٹھی ہے۔ سیورین متحرک ہوگئی۔ میرا تو سر چکرانے لگا۔ سیورین نے ایک پہلو سے دبا ہوا بٹھل کا ہاتھ رسانی سے باہر نکالا۔ میں نے دھڑکتی آواز میں اسے پکارا۔ اس کے پپوٹے حرکت میں آئے، ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھلیں، ماتھے پر سلوٹیں ابھریں۔ دوسرے لمحے وہ غافل ہوگیا۔ سیورین نے اشارے سے مجھے مزید آوازیں دینے سے روک دیا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ سیورین نے اس کے جسم پر سلیقے سے چادر ڈھانپ دی۔
میں وہیں بٹھل کی پائنتی کھڑا رہا۔ وہ تو کوئی اور آدمی لگ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پیر کھلے ہوئے تھے اور آس پاس کوئی بندش بھی نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے میں کسی شکنجے میں کسا ہوا ہوں۔ میں تو کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ کیسی بے چارگی، ناکارگی ہے کہ میں اس کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھ سے اس کی خبر گیری میں کہاں کوتاہی ہو رہی ہے۔ میں پھر کیا کروں، کہاں جاؤں، کون سا ہنر، کون سا داؤ آزماؤں کہ وہ سنبھل جائے اور میری حالت اس سے کون سی جدا ہے۔ وہ سب سے بے گانہ ہو کے بستر پہ پڑ گیا ہے۔ میرا ہوش اور میرے دست و بازو بھی کس کام کے ہیں۔ میرا حال تو اس سے برا ہے۔ اسے میری فکر نہیں کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ میری تو جان کھنچی جا رہی ہے۔ کسی بیمار کو علم نہیں ہوتا کہ دوسرے ثابت و سالم اس کے مدعی، اسے اپنے آپ سے زیادہ عزیز رکھنے والے کیسے ویران ہو جاتے ہیں۔
جانے کتنی دیر ہوئی، میں بٹھل کے بستر کے سرہانے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ سیورین کب میرے پاس آئی۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ اس کی دھیمی آواز کی دستک پر میں چونک پڑا۔ وہ نزدیک ہی کھڑی تھی۔ اس نے چپکے سے میرا ہاتھ تھاما تو میں سٹ پٹا سا گیا اور مجھے پشیمانی بھی ہوئی۔ کسی معمول کی طرح میں نے اس کی پیروی کی۔ وہ مجھے بٹھل کے بستر سے ہٹا کے صوفے تک لے آئی۔ خوش چہرگی سے خوش اطواری مشروط نہیں ہے۔ اس میں دونوں خوبیاں یک جا ہوگئی تھیں۔ اسپتال کے ان شاہانہ کمروں کے لیے اپنے ہنر میں ماہر نرسوں کا انتخاب کیا گیا ہوگا اور انہیں مریض کے ساتھ ساتھ تیمار دار سے حسن سلوک کی تربیت بہ طور خاص دی گئی ہوگی۔ تیمارداروں کو کچھ کم توجہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سیورین کی خوش شعاری میں خوش نہادی کا بھی دخل تھا کہ اس کی راہ و رسم میں تکلف و تصنع کی گرانی نہیں تھی۔ میں نے صوفے کے مونڈھے سے گردن ٹکا کے آنکھیں میچ لیں۔ سیورین بھی شاید یہی چاہتی تھی۔ میری طرف سے مطمئن ہو کے وہ

دروازے کے کنارے رکھی کرسی پر جا بیٹھی۔

میں نے طرح طرح کے وہم وگمان کی یورش سے خود کو محفوظ کرنے اور یک سو ہونے کی کوشش کی لیکن آدمی کو اپنے اختیار کا یارا کس قدر ہے۔ میرا سارا جسم ٹوٹ پھوٹ سا رہا تھا۔ اکبر علی خاں کی موجودگی میں ایسی ناتوانی اور بے بسی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد سب کچھ بکھرا ہوا لگتا تھا، بہت شور ہو رہا ہو جیسے، ایک ہاؤ ہو مچی ہو اور ہجوم میں، میں اکیلا کھڑا ہوں، اور کوئی کسی کی نہ سن رہا ہو، کوئی کسی کی طرف نہ دیکھ رہا ہو جیسے۔

میں صوفے پر نیم جاں پڑا تھا کہ کسی کی بہت ہلکی آواز پر آنکھیں بند نہ رہ سکیں۔ وہ نرس ایمی تھی۔ اس کا مطلب تھا، سیورین چلی گئی ہے۔ جاتے وقت اس نے مجھے بتانا مناسب نہ سمجھا ہوگا حالاں کہ میں سو کہاں رہا تھا۔ میں تو اپنے آپ سے دور ہو جانے، اپنے آپ سے اوجھل ہو جانے کے جتن کر رہا تھا۔ ایمی نے مسکراتے ہوئے مجھے سلام کیا، حال پوچھا اور معذرت چاہی کہ ڈاکٹر رائے اسپتال آ چکے ہیں اور کسی وقت کمرے میں آ سکتے ہیں، اس لیے اسے میرے آرام میں مخل ہونا پڑا۔

میں فوراً اٹھ گیا اور میں نے کمرے سے ملحق غسل خانے میں جلدی جلدی چہرے پر پانی چھڑکا۔ کاش پانی میں آدمی کے دورنِ خانہ غبار دھو دینے کی قوت بھی ہوا کرتی۔ اپنا حلیہ کسی قدر درست کر کے میں کمرے میں واپس آیا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ میری نظریں دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں، پھر میں باہر نکل گیا۔ گھومتی ہوئی مختصر راہ داری میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس سرے سے اس سرے تک میں نے کئی پھیرے لگائے۔ ڈاکٹر رائے کا نام ونشاں نہیں تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے میں نے اسپتال کی مرکزی عمارت جانے کا ارادہ کیا اور چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ دور سے آہٹیں سنائی دیں۔ اس خیال سے کہ ڈاکٹر رائے یوں راہ داری میں مجھے ٹہلتا دیکھ کے مکدر نہ ہو، میں کمرے تک لوٹ آیا۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی تھا۔ اس کے استقبال کے لیے میں کمرے سے باہر کھڑا رہا۔ اس کی رفتار اتنی کم تھی نہ اتنی تیز۔ مجھے دیکھ کے اس نے میرے سلام کے جواب میں سر کو خفیف جنبش دی اور اپنے ادھیڑ ساتھی ڈاکٹر سے گفتگو کرتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے اس کا یہ مغائرانہ طور اچھا نہیں لگا، سو اس کے پیچھے جانے کے بجائے میں دروازے کے پاس سکڑا سمٹا کھڑا رہا۔

دونوں ڈاکٹر انہماک سے بٹھل کا معائنہ کرتے رہے۔ انہوں نے نبض دیکھی، پیر کے انگوٹھے کھینچے۔ ڈاکٹر رائے نے اس کا سر ٹٹولا، دبایا اور پپوٹے اٹھا کے آنکھیں دیکھیں اور اپنے ساتھی سے کوئی سرگوشی کی۔ دونوں نے پائینتی سے لٹکے ہوئے احوال نامے پر بار بار نظر ڈالی۔ ڈاکٹر رائے نے بٹھل کو آہستہ سے پکارا تو مجھ سے اپنی جگہ ٹھیرا نہ جا سکا لیکن ایک قدم بعد میں نے خود کو روک لیا۔ میں نے دیکھا، ڈاکٹر رائے کی آواز کے جواب میں بٹھل کے جسم میں کچھ حرکت ہوئی ہے۔ ڈاکٹر رائے نے اس کا حال پوچھنا چاہا، دوبارہ، سہ بارہ۔ بٹھل کے ہونٹ بدبدائے ہوں گے کہ ڈاکٹر نے سر جھکا کے اپنا کان اس کے قریب کر دیا، اتنے قریب کے بٹھل کی گہری سانسیں اس کے گال سے مس ہو رہی ہوں گی۔ بٹھل نے کوئی جواب دیا، یہ میں نہ جان سکا۔ شاید کچھ بھی نہیں۔ ڈاکٹر رائے کچھ سن پاتا تو اتنی جلد وہاں سے نہ ہٹتا۔ لمحوں تک وہ اپنے ساتھی سے مشورہ کرتا رہا اور دوبارہ پہلے کی طرح بٹھل کے سرہانے چلا گیا اور آہستہ آہستہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ ہو سکتا ہے، دبا بھی رہا ہو۔ بٹھل کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوتی ہیں یا کوئی کراہ اٹھتی ہے؟ وہ یہی جاننا چاہتا ہوگا۔ میری نگاہیں مسلسل ڈاکٹر رائے کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں۔ ڈاکٹروں کے چہروں کی بے تاثری ان کی تعلیم کا حصہ ہوتی

ہے یا پھر یہ معمول کی بات ہے۔ صبح وشام طرح طرح کے مریض آزماتے آزماتے وہ ان کی آہ وبکا کے عادی ہو جاتے ہیں۔ معمول کی باتوں اور مناظر سے عام آدمی بھی سرسری گزر جاتا ہے۔ ڈاکٹر رائے نے عقب میں مستعد کھڑی نرس ایمی کو کوئی ہدایت دی۔ ایمی تن دہی سے نوٹ بک میں درج کرتی رہی۔

پھر کہیں ڈاکٹر رائے کو میرا خیال آیا۔ میرے سامنے آ کے وہ ٹھیر گیا اور تیز چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں خاموش رہا۔ ''کیسے ہو تم؟'' اس کا لہجہ اتنا سپاٹ نہیں تھا، لہجہ نہ چہرہ۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور کچھ نہیں کہا۔

''ٹھیک تو ہو؟'' وہ اکڑی ہوئی آواز میں بولا۔

''ٹھیک کیسے ہو سکتا ہوں۔''

''ہونہہ!'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ در آئی۔ ''کچھ ناراض لگتے ہو، کیا بات ہے؟''

''کوئی بات نہیں...... کچھ نہیں۔'' میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''آپ سے کوئی ناراض ہو سکتا ہے۔''

''تم ہو سکتے ہو۔''

''میں کہاں...... میں......'' مجھ سے آگے کچھ نہ بولا جا سکا۔

''تم نے کچھ پوچھا نہیں بھائی کے لیے؟''

''کیا حاصل، معلوم ہے، کیا جواب ملے گا، وہی رٹے رٹائے، گھسے پٹے جملے۔''

''تم کیا سننا چاہتے ہو؟''

''آپ جانتے ہیں۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''کہنے کے لیے کچھ ہو تبھی تو کچھ کہا جائے۔'' اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

''اس لیے میں بھی نہیں پوچھ رہا۔ آپ کو زحمت ہو گی خواہ مخواہ۔''

''اب تم ایک اچھے لڑکے بن گئے ہو۔''

ایک ساتھ بہت سے جواب ذہن میں منڈلائے لیکن نازکی کے احساس نے مجھے باندھے رکھا۔

''کافی پیو گے؟'' اس نے دھیرے سے کہا۔

میں دنگ رہ گیا۔

''کافی یا چائے؟''

''جو...... جو آپ کو پسند ہو۔'' میری زبان ہکلا گئی۔

''تمہیں کیا مرغوب ہے؟''

''کافی ہی ٹھیک ہے۔'' میں نے دبی آواز میں کہا۔

اس نے نرس ایمی سے کافی منگوانے کی فرمائش کی۔ میری طرح ایمی کو بھی یقین نہیں آیا۔ ایک ثانیے کے لیے اس پر سناٹا طاری رہا پھر لپکتی جھپکتی باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر رائے میرا ہاتھ پکڑے پکڑے صوفے پر آ گیا اور اس نے اپنے ساتھی ڈاکٹر کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

مجھے اپنی کم فہمی، جلد بازی اور بے اعتنائی پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

''تم کب آئے تھے یہاں؟'' ڈاکٹر رائے نے چبھتی ہوئی آواز میں یکا یک مجھ سے پوچھا۔

''کل...... کل رات......'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''گویا ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ سر کی اندرونی چوٹ ہے، چوٹ سے ہونے والے نقصان کی نوعیت جاننے کے لیے چند ٹیسٹ ضروری ہیں۔ ان کا نتیجہ دیکھنے کے بعد ہی کچھ کہنا مناسب ہوگا۔''

''جی، جی ہاں، میں سمجھتا ہوں۔''

''تم نہیں سمجھ رہے۔''

میں چپ رہا۔

''تمہاری عمر ہی ایسی ہے اور یوں بھی تم ایک الگ نوجوان ہو۔ ویسے نوجوانوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

''مجھ سے ان کی حالت برداشت نہیں

ہو رہی۔" میں نے تپیدہ آواز میں کہا۔
"یہ تعلق کی بات ہے۔"
"آپ کو کیا بتاؤں، یہ کون ہیں...... آپ نہیں سمجھیں گے، یہ میرے لیے کیا ہیں۔"
"کوئی بھی کسی کے لیے اتنا اہم ہو سکتا ہے۔"
"وہ میری زندگی ہیں۔" اپنے لہجے کی شدت مجھے خود گراں گزری۔
"یہ جذبہ اب کیسا عنقا ہوتا جا رہا ہے۔" وہ دیدے گھما کے بولا۔
"آپ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ سب لوگ یہاں یہی کہتے ہیں۔" میں نے اس کی منت کی۔
"بس ڈاکٹر صاحب، آپ انہیں اچھا کر دیجیے۔ میں آپ کا...... آپ کا......"
میری بات ادھوری رہ گئی۔ نرس ایمی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ایک باوردی خدمت گار بھی تھا۔ اس نے پیالیاں، دودھ، شکر اور رکافی کے برتن میز پر سجانے شروع کر دیے۔ دو سینیوں میں انگریزی بسکٹ، خشک میوہ بھی وہ ساتھ لایا تھا۔
"ایمی! تم بناؤ، دودھ برائے نام، آدھ چمچہ شکر۔" ڈاکٹر رائے نے ایمی کو حکم دیا۔
ایمی تمام تر نفاست سے کافی بنانے لگی۔ ڈاکٹر رائے دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "تم کیا کہہ رہے تھے؟"
"میں کہہ رہا تھا...... مگر نہیں، جانے دیجیے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "مجھے آپ کو کیا باور کرانا ہے۔"
"ہاں" وہ سر ہلانے لگا۔ "بہتر ہے، کچھ مت کہو اور باتیں کرتے ہیں۔"
"کیسی بات؟ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا ڈاکٹر صاحب۔"
"ہشت" اس نے منہ بنایا۔ "تم پڑھے لکھے نوجوان ہو، تمہیں معلوم ہوگا کہ زندگی وقت کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر کام میں وقت لگتا ہے۔"
"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر وقت کا پیمانہ گھڑی نہیں ہونا چاہیے۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے آپ نے بھی بتائے ہیں، میں نے بھی، لیکن مجھ پر قیامت کی طرح گزرے ہیں، پہاڑ کے مانند۔ ممکن ہے، آپ پر چوبیس گھنٹے کم گزرے ہوں۔"
اس کے شانے سیدھے ہو گئے۔ "تم نے بڑی اچھی بات کہی لیکن کوئی نہ کوئی پیمانہ تو بنانا ہی پڑتا ہے۔ زندگی محض تصوریت یا عینیت نہیں۔"
"اور زندگی محض مادیت اور حقیقت بھی نہیں ہونا چاہیے۔"
"دو اور دو تو چار ہی ہوتے ہیں عزیز من۔"
"کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں۔ جناب، مگر یہ پانچ اور چھ ہو جانے والا پیمانہ آپ نے ایجاد نہیں کیا۔"
"کبھی کبھی کی بات ہے نا!......" وہ لطف لیتے ہوئے بولا۔ "اس کے لیے پیمانے کی ایسی کیا ضرورت۔"
"لیکن یہ کبھی کبھی زندگی کا ایک مستقل مظہر ہے، پھر کسی طرح اس کی تشریح، کس طرح اسے بیان کیجیے گا؟"
"یہ شاذ و نادر، اوزان و پیمائش سے ماسوا ہی رکھو۔" وہ بے پروائی سے بولا۔
"یعنی آپ ایک ڈاکٹر، پانچ یا چھے یا سات ہو جانے والے مظہر سے انکاری نہیں۔ میں بھی یہی التجا کر رہا ہوں کہ وقت کے ان ٹکڑوں سے کچھ سوا کیجیے، مسیحائی کا کوئی کرشمہ، کوئی اعجاز......"
اس کی آنکھوں کی چمک فزوں ہو گئی۔ "میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔"
"کیسا اندازہ جناب؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔
"یہی کہ تم سے دل چسپ اور معنی آفریں مکالمہ

ہوسکتا ہے۔'' اس نے کافی کی پیالی ختم کرتے ہوئے کہا اور ایمی سے ایک اور پیالی کی فرمائش کی اور میرے آگے بسکٹ کی پلیٹ بڑھائی۔ ''تم نے نہیں لیے۔ یہ تو کھانے پینے کی عمر ہے۔''

''مگر وقت نہیں۔'' میری بڑبڑاہٹ شاید اس نے نہیں سنی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پلیٹ سے بسکٹ اٹھالیا۔

''یہاں اسپتال میں تمہیں خالص چیزیں ہی ملیں گی۔ ذائقے میں مزے دار نہ ہوں مگر ہوتی خالص ہیں۔''

یکا یک میرے ذہن میں ایک گمان نے ڈنک مارا اور میرا سارا وجود ہی ڈگمگا گیا۔ مجھ ایک اجنبی سے ڈاکٹر جیسے تند خو شخص کی یہ رغبت اختیاری اور شعوری تو نہیں؟ اسے میری حالت اور وحشت کا احساس ہوگیا ہے۔ کہیں مجھ پر خالص لطف و کرم بٹھل کی طرف سے بے اطمینانی کے سبب سے تو نہیں؟ میری استقامت کے لیے وہ کوئی پیش بندی تو نہیں کررہا؟ ابھی ابھی تو اس نے بٹھل کا معائنہ کیا ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد اس کی مہربانی سوا ہوگئی ہے۔

میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں نے اپنی بدگمانی سر سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن آنکھوں میں اندھیرا اترنے لگا تھا۔ ڈاکٹر رائے کی کہی ہوئی باتوں کی بازگشت دماغ میں گونج رہی تھی۔ میری تشفی کے لیے خوش امیدی کے فراخ دلانہ اظہار میں اسے کیا عار ہے۔ اسے کوئی امید تو مبہم و موہوم۔ بنیادی طور پر وہ ایک اچھا آدمی ہے۔ مجھ پاگل کے لیے زینہ بہ زینہ آمادگی ہی مناسب رہے گی، ایسی کسی تدبیر پہ تو وہ عمل پیرا نہیں؟ مجھ پر نوازش کی ارزانی اور بٹھل کے معاملے میں محتاط بیانی میں دور بینی کا کوئی پہلو تو مضمر نہیں ہے؟

میرا سر گھوم رہا تھا اور شاید کافی کی پیالی میرے ہاتھ سے گر پڑتی کہ نرس ایمی نے سلیقے سے اپنی گرفت میں لے لی۔

''کیا بات ہے؟ تم چپ کیوں ہوگئے؟''

ڈاکٹر رائے نے چونک کے پوچھا۔ میں نے کچھ نہیں کہا مگر وہ ایک تجربہ کار آدمی تھا۔ میری کیفیت اس ہزار چشم سے چھپی کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ بے تاب سا ہوگیا۔ ''اوہ، اوہ، یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا ہوگیا میرے بچے۔ یقیناً کوئی برا خیال، برے خواب کی طرح تم پر مسلط ہوگیا ہے۔ نا نا...... میرے عزیز، حوصلہ رکھو۔''

میری آنکھیں جل رہی تھی۔ آنکھوں کی آگ پانی بن جاتی ہے۔ میں نے بہت ضبط کیا لیکن آنسو نہ رک سکے۔

ڈاکٹر اور مضطرب ہوگیا۔ اس نے میرے ہاتھ جکڑ لیے۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے۔ دوا اور دو، پانچ کی کرشمہ کاری کا مرحلہ ابھی نہیں آیا۔ ابھی تو ہم اپنے ناپ تول کی کوشش کررہے ہیں اور کسی امید ہی میں...... پہلے کسی نتیجے پر تو پہنچیں۔ میں نے وقت کی بات کی تھی، کوئی مایوسی کب ظاہر کی۔''

''ڈاکٹر صاحب۔'' بہ مشکل تمام میں نے کئی پھٹی آواز میں کہا۔ ''آپ مجھے سچ سچ بتائیے۔''

''کیا سچ؟'' وہ چٹخنا کے بولا۔ ''میں نے تم سے کیا چھپایا ہے؟''

''آپ نے صاف کچھ بتایا بھی نہیں۔'' میں نے یاسیت سے کہا۔

وہ اپنا سر تیزی سے ہلانے لگا۔ ''اوہ، نہیں، میں نے تم سے کیا کہا ہے، یہی نا کہ ابھی بعض طبی تجزیوں کا انتظار ہے۔ سہ پہر جب تم یہاں نہیں تھے، میں اس شعبے کے ماہر ڈاکٹر فرینکی کو لے کے آیا تھا۔ انہوں نے بھی یہی کہا۔ میں تمہیں کچھ صاف بتانے کی صورت میں نہیں ہوں، ہم مریض کے عزیزوں سے کوئی الٹی سیدھی بات نہیں کرتے جو بعد کو پشیمانی کا باعث ہو۔ ہم ابھی مشاہدے کے مرحلے میں ہیں میرے بیٹے!

یہ ایلو پیتھی طب ہے، یونانی، آیورودیک اور ہیومیو پیتھی نہیں۔ اس کا اپنا طور طریقہ ہے۔ تم کسی وید، سنیاسی بابا، سڑک کے کنارے چوکی پر بیٹھے کسی پہلوان، اطائی اور نبض دیکھ کے جسم کے اندر کا حال، سارا کچا چٹھا جان لینے والے حکیم کے پاس نہیں آئے۔'' اس کی آواز پر کشیدگی بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے سر جھکالیا۔ ڈاکٹر بھی چپ ہوگیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس نے میری کمر تھپکی۔ ''لگتا ہے، پہلے تمہارا علاج کرنا چاہیے۔ یہ تھڑدلی اور رونا دھونا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ چلو، ایک بہار اور حوصلہ مند نوجوان کی طرح اب کھڑے ہوجاؤ اور خوش دلی سے مجھے رخصت کرو۔ اپنے بارے میں میری رائے بدلنے کا دکھ مجھے مت دو۔''

یہ کہتے ہی میرا بازو تھام کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے بھی اپنے بوجھل جسم کے ساتھ اٹھنا پڑا۔ ابھی وہ کمرے میں تھا کہ دروازے پر اسپتال کے مخصوص لباس میں دبلا پتلا ایک آدمی دکھائی دیا۔ ڈاکٹر رائے کو دیکھ کے وہ پلٹ جانا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کی کڑکتی آواز پر ٹھٹھک کے رک گیا۔ ڈاکٹر کے اشارے پر نرس ایمی نے تیز قدموں سے آگے جاکے اس کی آمد کا مقصد پوچھا۔ اس نے کانا پھوسی کے انداز میں ایمی کو جانے کیا بتایا کہ ایمی جز بز نظر آنے لگی۔ اس دوران ڈاکٹر رائے، اس کا ساتھی اور میں دروازے پر پہنچ گئے۔

''کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے رکھائی سے پوچھا۔

''جناب! یہ کہتا ہے، بابر صاحب سے ملنے دو پولیس والے آئے ہیں۔'' ایمی نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

''کیا؟'' ڈاکٹر قریباً چیخ کر بولا۔ ''پولیس!''

دوسرے لمحے اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی سن لیا تھا۔ ایمی نے میرا نام ہی لیا تھا۔ میں تو دم بہ خود ہوگیا تھا۔ ''تمہارے لیے پولیس؟'' ڈاکٹر وحشت آمیز حیرانی سے بولا۔ ''کیوں، کس وجہ سے؟ یہ کیا معاملہ ہے۔''

''میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' اس کے سوا مجھے کوئی جواب نہیں سوجھا۔

''کیا بولتے ہیں وہ لوگ؟'' ڈاکٹر رائے نے ہندوستانی میں براہ راست قاصد سے پوچھا۔

''وہ ساب سے ملنا چاہتے ہیں جناب۔'' قاصد ممیا کے بولا۔

''کس واسطے، کیوں؟'' ڈاکٹر برگشتگی سے بولا۔

''اپنے کو نئیں مالوم جناب۔'' قاصد حواس باختہ ہونے لگا۔ ''وہ لوگ کچھ نئیں بولے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بے نیازی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ''آپ جائیے، میں ان سے مل لیتا ہوں۔''

''مگر وہ، وہ کیوں آئے ہیں یہاں؟'' ڈاکٹر کی فکر و تشویش میرے بے پروایانہ لہجے سے بھی کم نہ ہوئی۔ ''یہ اسپتال ہے۔'' وہ بپھر کے بولا۔

''کوئی بات ہی ہوگی۔'' میں نے نچلی آواز میں کہا۔ ''میں دیکھ لیتا ہوں۔''

ڈاکٹر رائے حیرت و اضطراب کے عالم میں کھڑا میری شکل دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں شانے اچکائے۔ ''مناسب ہے، تم دیکھو ان کو۔'' وہ ٹھیر کے بولا۔ ''اور سنو! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھ سے مت چھپاؤ۔''

''میں کچھ نہیں چھپاؤں گا آپ سے، مجھ پر بھروسا رکھیے۔ آپ اطمینان سے گھر جائیے۔'' میں نے بہ ظاہر اعتماد سے کہا۔

میری حالت عجیب تھی۔ ڈاکٹر رائے کے سامنے قاصد آیا تھا۔ مجھے ایسا لگا، میری کوئی چوری پکڑی گئی ہے۔ میں ڈاکٹر کے سامنے بے لباس ہوگیا ہوں۔ میں اسے تفصیل کیا بتاتا، میری کوئی غلطی، میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ صفائی پیش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ایک طرف اسے دلاسا دینے کا

فریضہ انجام دینا تھا، دوسری طرف پولیس والے میرے منتظر تھے۔ پولیس کی آمد کا سبب ایک ہی ہوسکتا تھا۔ جس خدشے کا اظہار اکبر علی خاں نے کیا تھا، وہی ہوا۔

''کدھر ہیں وہ لوگ؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔ اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

قاصد نے اسے بتایا کہ مرکزی عمارت کے ملاقاتی کمرے میں پولیس والوں کو بٹھا دیا گیا ہے۔ وہ سادہ لباس میں آئے ہیں۔ ڈاکٹر نے حکم دیا کہ انہیں کمرے میں نہ آنے دیا جائے۔ کمرے سے باہر سبزہ زار میں کرسیاں لگوادی جائیں۔

ڈاکٹر پھر وہاں نہیں ٹھیرا۔ اس نے شب بخیر کہا نہ میں نے۔ وہ تو گم سا ہو گیا تھا۔ جانے کیسے کیسے شکوک اس کے دل و دماغ میں گھر کرنے لگے ہوں گے۔ میں نے بھی گریز کیا کہ اس صورت حال میں شب بخیر کی رسم ادائی بڑی بے محل معلوم ہوتی تھی۔

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد کمرے میں آ کے میں نے ایک بار پھر بٹھل پر نظر ڈالی۔ اسے تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ نرس ایمی بھی کھوئی کھوئی، سہمی سہمی نظر آتی تھی۔ بار بار اجنبی نگاہوں سے مجھے دیکھتی تھی۔ پولیس ہیبت و دہشت کی علامت ہے۔ آمنا سامنا ہو جائے لوگ تو فرار کے راستے ڈھونڈتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، نرس ایمی یہ نہ سوچ رہی ہو کہ میں بھی کچھ یہی کروں گا۔ میں نے غسل خانے جا کے منہ دھویا۔ بال درست کیے، لباس کی شکنیں دور کیں اور خود کو استوار کیا۔ اب جو کچھ بھی ہو۔ تمام بدترین نتائج ذہن میں رکھتے ہوئے مجھے پولیس کے سامنے پیش ہو جانا چاہیے۔ پولیس دروازے پر کھڑی ہے اور میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اکبر علی خاں آیا ہی چاہتے ہوں گے۔ دیر ہو گئی ہے مگر وہ آئیں گے ضرور۔ میں ان کی بات مان لیتا تو ارجنٹ تار اب تک کلکتے پہنچ چکا ہوتا۔ میں نے نرس ایمی سے کاغذ اور قلم فراہم کرنے کی درخواست کی۔ اس کے پاس دونوں چیزیں تھیں۔ میں نے کلکتے کے اڈے کا پتا اور پیغام لکھا اور ایمی کو تاکید کی میری عدم موجودگی میں اکبر علی خاں نامی ایک صاحب آئیں تو یہ رقعہ ان کے حوالے کر دیا جائے۔ پیغام مختصر تھا کہ تار ملتے ہی پہلی گاڑی سے وہ چل پڑیں۔ پہلے میں نے اسپتال کا پتا لکھا تھا، پھر اسے کاٹ کے ہوٹل کا نام لکھ دیا۔ اسپتال کا پتا دیکھ کے وہ سارے گھبرا جاتے۔ سفر کاٹے نہیں کٹتا۔ تار کے اخراجات کے پیسوں کے لیے میرا ہاتھ جیب میں گیا تھا لیکن اکبر علی خاں کے شیشہ احساس کے خیال سے میں رک گیا۔

''ان لوگوں کے ساتھ تمہیں بھی جانا ہے؟'' ایمی نے آزردگی سے پوچھا۔

''کیا کہا جاسکتا ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

وہ کچھ اور پوچھتی یا کہتی کہ پولیس کی آمد کی اطلاع دینے والا قاصد دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے کچھ بتانے سے پہلے میں نے دروازے کا رخ کیا۔ کمرے کے آگے چوڑی راہ داری تھی۔ اس کے پار چھوٹے سے قطعے پر گہرا سبزہ بچھا ہوا تھا۔ کنارے کنارے پھلواری بچی ہوئی اور فاصلے فاصلے پر پستہ قد درخت ایستادہ تھے۔ راہ داری میں جلتے قمقموں کی روشنی کسی حد تک سبزہ زار بھی روشن کر رہی تھی ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ سکوت، سکون نہیں ہوتا۔ میرے سینے میں تلاطم برپا تھا۔ سامنے سبزے کے بیچ میں بید کی کرسیوں پر دونوں پولیس والے سر جوڑے بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان میں ایک کی عمر چالیس پینتالیس، دوسرے کی تیس بتیس کے درمیان ہو گی۔ کوٹ پتلون پہنے ادھیڑ آدمی کا قد درمیانہ، جثہ کسی قدر فربہ تھا۔ مونچھیں ہلکی ہلکی تھیں، رنگت سانولی اور کنپٹیوں پر سفیدی جھلک رہی تھی۔ کرتے پاجامے میں ملبوس نوجوان آدمی کا

جسم چھریرا، قد کھنچا ہوا تھا۔ رنگت اس کی بھی سانولی تھی۔ وضع قطع سے دونوں پولیس والے ہی لگتے تھے۔ مجھے سامنے دیکھ کے دونوں کھڑے ہو گئے۔ چند لمحوں تک نظروں نظروں میں مجھے تولتے رہے۔ میں بھی اس اثنا میں ان کا اندازہ کرتا رہا۔

''کیا بات ہے؟'' سلام کرنے کے بجائے اور ان کے کچھ بولنے سے پہلے میں نے اچٹتی آواز میں پوچھا۔

''آپ ہی ہو، ادھر میدا کے ٹھکانے پر جانے والے؟'' نوجوان شخص تیزی سے بولا۔

میں نے سر ہلا کے اقرار کیا۔

''آپ کا نام؟'' لگتا تھا، اپنے لہجے کے تعین میں اسے دشواری ہو رہی ہے۔

''کام بتائیں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

دونوں نے بے تابانہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ ادھیڑ آدمی کا منہ ٹیڑھا ہوا۔ ''کام بھی بتاویں گے۔''

''کون ہو آپ؟ تھوڑا اپنے بارے میں بتاؤ۔'' میں نے اپنی آواز متوازن ہی رکھی۔

''کوتوالی سے آوے ہیں۔ یہ انسپکٹر شری دھن راج جی ہیں۔ ہمرا نام رام پرساد ہے، سب انسپکٹر رام پرساد۔'' نوجوان نے چستی سے جواب دیا۔ اس چستی میں مناسب کا تکبر و تفاخر نمایاں تھا۔

''پولیس والے ہو آپ؟'' میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

''وہ اسپتال کا کبوتر کچھ نا ہیں بولس؟'' ادھیڑ شخص نے تنی ہوئی آواز میں کہا۔

''بولا تھا کچھ ایسا، پر آپ وردی بنا آئے ہو۔'' اپنے ہیجان کی پردہ پوشی کے لیے مجھے اپنا لہجہ ٹھیرا ہوا اور دھیما ہی رکھنا چاہیے تھا۔

''ہمرے کو اسپتال کا دھیان تھا۔'' نوجوان نے بہ عجلت عذر خواہی کی۔

''کام بتائیں پھر۔'' میں نے خشک آواز میں کہا۔

''تھوڑی جان کاری لینا ہے اپنے کو۔'' نوجوان بولا۔

''کیسی جان کاری؟'' میں نے تحمل سے پوچھا۔

''میدا کا آدمی دھنوا کا خون کے بارے میں۔'' نوجوان ادھر ادھر دیکھ کے بولا۔

''پر ہم کیسے جانیں، آپ پولیس ہی کے آدمی ہو؟'' میں نے کسمسا کے کہا۔

''کا...... کا مطلب؟'' نوجوان چڑ سا گیا۔

''پہچان بنا ہم آپ لوگ سے کیا بات کریں۔ اپنے کو کیا معلوم، آپ......''

''اچ چھا، اچ چھا۔'' ادھیڑ آدمی میری بات کاٹ کے بولا۔ ''ٹھیک ہی بولیس ہیں۔ پہچان کروائے دو اپنی۔''

نوجوان نے کرتے کی جیب سے گتے کا شکستہ و بوسیدہ کارڈ نکالا۔ ادھیڑ شخص نے بھی الکساتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے کارڈ نکال کے نوجوان کی طرف بڑھا دیا۔ نوجوان نے دونوں پہچان نامے میرے آگے کر دیے۔ میں نے انہیں ہاتھ میں لیے بغیر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

کم از کم ایک طرف سے اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ مجھے ساتھ لے جانے یا گرفتار کرنے نہیں آئے ہیں۔ اس کا اندازہ تو شروع ہی میں ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ سیدھے وارنٹ دکھاتے اور اپنے اصلی لب ولہجہ میں مخاطب ہوتے لیکن وہ میری جستجو میں اسپتال آئے تھے اور اپنی آمد کے سبب کا اشارہ نوجوان پولیس والے نے کر بھی دیا تھا۔ ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ دھنوا کے خون کے بارے میں انہیں کس قسم کی معلومات مطلوب ہیں۔ ایسی صورت میں اختصار ایک مجرب تدبیر ہے۔ یوں بھی، کہتے ہیں کہ کم گوئی میں بہت حفظ و امان ہے۔ دھند صاف ہو جانے تک مجھے بہت محتاط رہنا تھا۔ طول کلامی میں زبان بہک سکتی اور انہیں کسی اور طرف سوچنے پر مائل کر سکتی تھی۔ میں نے بوجوہ ایک بات کہہ دینی

ضروری سمجھی۔ ''ایک بات بتادیں آپ کو۔ جو بولنا ہے، کھل کے بولیں تو اچھا ہے، گھما پھرا کے نہیں۔''

''کھلا ہی بولیں گے۔'' ادھیڑ آدمی اینٹھی ہوئی آواز میں بولا۔

کچھ تامل کے بعد اپنے افسر کی طرف دیکھتے ہوئے نوجوان نے تاسف سے ابتدا کی۔ ''ابھی دھنوا کی ارتھی کا کریا کرم او لوگ کر دھن ہیں۔''

میں نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔

''آپ بیچ میں تھے، ہم کو بولیں، کیسو ہوگیو ایسا؟''

''ادھر گلی میں بہت سے تماش بین تھے۔ جا کے ان سے نہیں پوچھا؟'' میں نے تندی سے کہا۔

''او تو ہم سارا اونچ نیچ، دایوں بایوں دیکھ ہی رہت تھی۔'' ادھیڑ آدمی کو میری تلخی اچھی نہیں لگی۔

''میدا نے بھیجا ہے آپ کو؟'' میں نے انہیں بھٹکانے کی کوشش کی۔ جلد سے جلد ان کی آمد کی ٹوہ لینے کے لیے مجھے خود بھی سوالوں کی شوشہ طرازی کرتے رہنا چاہیے تھی۔

''او، رنڈی کا جنا۔'' ادھیڑ آدمی کرسی پر مچل گیا۔ ''او ہم کو بھیجتا بھڑوا۔''

نوجوان نے اپنے افسر کی ناگواری کم کرنا چاہی۔ ''پولیس کی اپنی جمے داری...... (فرض) بھی ہے۔''

''ادھر تو اپنے کو لگا، شہر کی ساری پولیس میدا کے ہاتھ میں ہے۔'' میں نے کہا۔

''او ادھر کا مہارا جالا گت ہے کا سرا۔'' نوجوان پھنکارتی آواز میں بولا۔

''اس کے اشارے پر پولیس کچھ جانے بوجھے بغیر ہمارے پیچھے پڑ گئی اور ہمارے راستے بند کر دیے۔''

''پولیس کو اس وگھت کچھ پتا نا ہیں تھا نا۔'' نوجوان منہ پھیر کے بولا۔

''اب تو پتا چل گیا۔'' میں نے گویا اپنے آپ سے کہا۔

''جو نا ہیں چلا، جان لیں گے اس کو بھی ترنت ہی۔''

''میدا نہیں تو آپ سرکار کی طرف سے آئے ہو پھر؟'' میں نے نرمی سے پوچھا۔ میرے سوال پر نوجوان نے جھٹ اپنے افسر پہ نظر کی۔ افسر نے ہونٹ سکوڑ کے جواب دیا۔ ''ہم اپنی اور (طرف) سے آوے ہیں۔''

''اپنی اور سے؟'' میں نے تذبذب سے کہا۔

''کھون کا مالا ہے، کیس آگے بھی جا سکے ہیں۔ ہم پہلے آپ سے مل کے آگے پیچھے کا سارا جان لینا چاہیں ہیں۔'' نوجوان نے وضاحت کی۔

''ابھی آپ نے کتنا جانا ہے؟''

''سمجھو، کوچھ بھی نہیں جانا۔'' ادھیڑ آدمی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

''پر کچھ جان کے ہی آئے ہوں گے ادھر۔ اپنا نام پتا پھر کسی نے بتایا جو ہم تک پہنچ گئے۔''

''سارے سہر کو پتا ہے۔ بچہ بوڑھا جوان، سب کو پتا ہے۔ درسن کرنے کو تڑپیں ہیں سبھی آپ کا۔'' نوجوان کی آواز میں پہلی مرتبہ طنز غالب تھا، استہزا بھی۔

''ایسا کیا کیا ہے ہم نے۔'' میں اب اپنے آپ کو اتنا بندھا ہوا محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''ادھر آپ میدا کے ٹھکانے پر کا ہے کو گیو تھے۔ کتا کتا نجر آتا؟ ایک سے ایک حرامی پلا ہے اودھر۔ سہر بھر میں تو پھر ہڑا ہڑی ہوبے کرے گی۔ پہلی بار لوگ باگ سنے کہ سہر کے باہر کا کوئی آدمی میدا کو آنکھیں دکھانے آیو تھا۔ سہر کے بھیتر تو کب سے ہر مائی کا لال نے چوڑی پہنا ہوا تھا۔ کلائی میں......اور کسی کو وسواس نا ہیں ہے۔'' نوجوان نے میدا کو غلیظ گالی دی۔ ''کا بولیں، اس کا دھاک سہر میں ایسا جما ہے کہ کسی کو یکین نا ہیں۔'' نوجوان کی آواز سلگ رہی تھی۔ وہ رکا اور کہنے لگا۔ ''ہم آپ کی

جبان سے سننا چاہیں ہیں، ہم کو بولو، کا ہوا تھا ادھر؟"
"ہم نے طے کیا تھا کہ اب کسی سے بات نہیں کریں گے۔ ایسا ویسا کچھ ہوا تو سیدھے کچہری جا کے زبان کھولیں گے۔" میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر آپ ادھر آئے ہو تو ٹھیک ہے۔ ہم بتاتے ہیں۔"

میں نے گاڑی میں بٹھل کو جھٹکا لگنے، سفر ملتوی کر کے پٹنا اترنے، اسپتال آنے، صبح ڈاک خانے جانے اور وہاں پیش آنے والا واقعہ مختصراً بتایا۔ میں نے کہا کہ اسپتال پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی۔ پولیس کے چکر میں پڑ کے جانے کتنا وقت لگ جاتا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ میدا کے اڈے پر جا کے بات کی جائے۔ یہ معلوم تو ہو ہی چکا تھا کہ میدا کو کون سی زبان آتی ہے۔ کوئی منت کرنے کے بجائے میں نے اس سے چوکی سے اتر جانے کو کہا۔ اس کے چوکی سے اتر جاتے پر سبھی کچھ خود بہ خود ٹھیک ہو جاتا۔ میں نے پھر اسی کی زبان میں بات کی۔

"بعد کا سارا ہم جانیں ہیں۔ اپنے دو چار آدمی بھی ادھر میدا کے ٹھکانے پر رہت ہیں۔" ادھیڑ پولیس افسر گردن ٹیڑھی کر کے بولا۔

"پھر ہمارا کیا بولنا......" میں نے کہا۔

"ابھی چاکو بدلی میں بات ٹل گیو۔ ٹھیک ہے پر کل ناہیں تو پرسوں، دس پندرہ دن بعد......"

میں نے ادھیڑ آدمی کی بات مکمل کی۔ "اس کے پاس جانا ہے۔"

"جانا ہے۔" نوجوان کی بے قراری دیدنی تھی۔

"اپنا چاقو اس کے پاس ہے، واپس تو لینا ہے اسے۔" میری آواز میں ذرا سی تپش نہیں تھی۔

"آپ ......آپ۔" نوجوان نہ جانے کیا پوچھنا چاہتا تھا کہ منتشر ہو گیا بل کھا کے بولا۔ "وہ بھوتنی کا بہت جمانے سے ادھر راج کرت ہے۔ ایک نمبر کا چاکو باج ہے۔"

"دیکھ لیں گے۔" میں نے سر ہلا کر کہا۔ "ہتھیار بیچ میں آتا ہے تو کسی ایک کو زمین دیکھنی پڑتی ہے۔"

"پھر کا آپ اس کے ٹھکانے پر بیٹھنا چاہیں ہیں؟"

"اپنے کو اس کے ٹھکانے، چوکی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں اس شہر میں نہیں ٹکنا، ہم نے اسے بھی صاف بول دیا تھا۔ ہم نے کہا، اپنے کو آگے جانا ہے۔ پٹنا تو ہم بھائی کی وجہ سے آ گئے۔ اس نے ہماری بات مان لی۔ گلی کے لوگوں نے سارا دیکھا بھالا تھا، انہوں نے بھی کچھ بتایا ہوگا اس کو۔"

میری سادہ بیانی پر وہ اور مضطرب ہوئے۔ ادھیڑ آدمی نے پھر وہ سوال کیا جو اس کے سر میں تنکا بنا ہوا تھا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ دیوزاد میدا سے مبارزت کا دعوا میں نے کس عزم، کس بل بوتے ہی پر کیا ہوگا۔ اس نے اٹکتی زبان سے پوچھا کہ نتیجہ مختلف نکلا، میں میدا پر قابو نہ پا سکا تو......! مجھے بھی بڑھ چڑھ کے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے یہ امکان تسلیم کیا تو دونوں بے مزہ اور بے آرام ہوئے اور جلد ہی انہیں قرار آ گیا۔ انہوں نے میرے سکون سے شاید وہی نتیجہ اخذ کیا جو میں اپنی زبان سے کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ پھر انہیں انجام سے غرض بھی کیا تھی۔ انجام کچھ بھی ہو، ان کا کون سا زیاں تھا لیکن ان کے کچھ کہے بغیر اتنا تو نظر آنے لگا تھا کہ نہ تو میدا کے فرستادہ ہیں، نہ اس سے کوئی ہم دردی رکھتے ہیں۔ البتہ اس کی ہزیمت کے مشتاق ہیں اور میرے پاس ان کی آمد کا ایک مقصد مجھے دیکھنا، میرے عزم و ارادہ کا اندازہ کرنا ہے۔

"بہت چربی چڑھ گوی تھی اس سور کو۔ لاگت ہے، او جان لہس، اب اس کا وکھت کھتم ہو چکو ہے۔" نوجوان نے مجھے مہمیز کرنے کے لیے کہا۔

اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ میں چپ رہا۔

"پر اپنے کو کوئی بھروسا ناہیں اس پر، اچھی طرح جانیں ہیں ہم اس کو۔ وکھت ناہیں دیو، اس رادن نے سمے لیو۔ من میں اس کے کسی اور پر کار گنوا پکڑن کا بھی ہو سکے ہے۔ ہو سکت ہے کہ ناہیں؟" نوجوان نے بڑبڑاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اے ہی تو ہم بولیں ہیں۔" ادھیڑ آدمی اٹھ کے بولا۔ "آپ کو پھر بہت سنبھل کے رہنا ہووے گا۔ اس کے پالتو جناور شہر میں ڈکراتے پھریں ہیں۔"

"ہم کیا کر سکتے ہیں ہمیں تو سب سے پہلے اپنے بھائی کی فکر ہے۔"

"اسی کارن ہم ادھر آئے ہیں، آپ کو دیکھنے بھی......اور اپنی کوئی مدد، سہاتیا کی جرورت ہو تو بھی......"

میں نے پھر ان کا شکریہ ادا کیا۔

"ناہیں ناہیں۔" نوجوان نے جوشیلے انداز میں اصرار کیا۔ "کوئی بات، کوئی اپائے من میں ہو تو آپ بولیں۔"

"کیا بولیں، آپ خود ہی سارا دیکھ چکے ہیں۔"

"او بدماس سہر کا سب سے بڑا احرامی ہے۔"

پھر ہم کیا کریں، آپ ہی مشورہ دیں۔"

"اب ہم آ گئے ہیں نا۔" نوجوان پولیس افسر نے شکر گزاری کے انداز میں کہا۔ "پر دیکھیں ساب! ایک آدمی کا کھون ہو گیو ہے۔ بہت بڑی بات ہے ای، چھوٹی موٹی ناہیں۔ لاگت ہے، او میدا دگا باج پہلے آپ کو اس چکر میں پھنساوے گا۔ ٹھیک ہے، گلی کے لوگ سارا کچھ دیکھے ہیں، پر ان کا کا بھروسا، او تو سسرے مٹی کے مادھو ہیں۔ بے پیندے کے لوٹے۔ میدا سے دشمنائی کا ہے مول لیں گے۔ ہم کو پتا ہے، آپ اپنا چاکو ناہیں نکالے تھے۔ دھنوا کو اس کے سنگی ساتھی کا چاکو کھبا ہے۔ اور ادھر سارے نہیں، تو پولیس کے بھی کچھ دلال لوگ میدا کا نمک کھاویں اور سسرے سر ملاویں ہیں۔ ٹھکانے سے ملیدہ ماکھن آوے ہے برابر۔ پکا تال میل بنا ہے دونوں میں۔ او بھی اڑچن ڈال سکیں ہیں...... پر آپ...... آپ سانت رہو، ہم سوچیں ہیں آگے کا۔"

ہم دردی کی وجہ میری سمجھ میں دیر سے آئی اور مجھے اپنی دیر فہمی پر غصہ بھی آیا۔ اس مہربانی کی وجہ میدا سے عداوت، پیشہ وارانہ فرض شناسی اور دور اندیشی نہیں تھی بلکہ وہ دونوں کچھ زیادہ ہی پولیس والے تھے۔

مجھے ان کا شکریہ ادا کرتے رہنا چاہیے تھا۔ نوجوان کا لہجہ اب خاصا مفاہمانہ ہو گیا تھا، اشتیاق سے بولا۔ "آپ لوگ، مطلب ہے، آپ کے بھائی اور آپ کا کریں ہیں؟"

میں نے اسے بتایا کہ فیض آباد شہر کے علاقے میں تھوڑی بہت زمینیں ہیں۔

"جمین دار ہیں آپ؟ او تو لاگت ہی تھا اپنے کو۔" نوجوان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

شہر کے سب سے بڑے اسپتال اور اسپتال کے سب سے مہنگے کمرے میں علاج و معالجے کا حوصلہ کوئی اقبال مند شخص ہی کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے، انہیں شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں ہمارے قیام کا بھی علم ہو۔ وہ پولیس والے تھے۔ نرس، ڈاکٹر، مجھے ڈاک خانے لے جانے والا تانگا، ہوٹل کا منیجر اور عملے تک ان کی رسائی مشکل نہ تھی۔ میدا کے اڈے، گلی کے لوگوں اور راہ گیروں سے ایک پہر کے عرصے میں انہوں نے اس قدر معلومات حاصل کر ہی لی تھیں۔ وہ پوری تیاری کر کے آئے تھے۔

"اپنی کوشش ہووے گی، آپ ان کٹ کھنا لوگن، ان بجو جنم سے دور دور رہیں۔ ادھر بھائی کی دیکھ بھال میں کوئی کھوٹ نہ پڑے۔"

"آپ کی مہربانی۔" میں اور کیا کہتا۔

میں نے کہنا چاہا کہ صرف دو دن کی بات ہے۔ بٹھل اور میری پرسش حال کے لیے اتنے لوگ اکھٹے ہو سکتے ہیں کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے ان سے نہیں کہا کہ وہ غلط جگہ آ گئے ہیں، یہاں سے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ان کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے، ان کی مذمت کرنے کو بہت جی کرتا تھا لیکن یہی بہتر تھا کہ ان کے فرمودات جوں کے توں قبول کر لیے جائیں۔ انہوں نے بہر حال ایک اعانت ضرور کی تھی، ایک ایسے گوشے کی طرف انہوں نے اشارہ کیا تھا جو مجھ حواس باختہ سے اوجھل رہا تھا۔ میدا اور اس کا سرپرست برجو اپنی عطا کی گئی مہلت میں میرا قصہ ہی پاک کر دینے کی کوشش کیوں نہیں کریں گے؟ میدا اور برجو ایک زمانے سے اڈا چلا رہے ہیں۔ بٹھل کے بہ قول چاقو اور بازو کے زور کے ساتھ اڈا گیری میں دماغ کے زور کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ان سبھی اڈے کی چوکی سے چمٹے رہنے والوں کو میری موجودی میں اپنا راج پاٹ تمام ہو جانے کا خدشہ بجا طور پر لاحق ہونا چاہیے۔ اڈے کا استاد ہی نہیں، چوکی سے ہٹ جانے پر اس کے نفس ناطقہ، حاشیہ بردار بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ان کی عزت و مرتبت، ان کی بقا خطرے میں ہے۔ میں نہیں رہوں گا تو سب کچھ یوں ہی قائم رہے گا۔ ادھر اڈے کے بہت سے لوگوں کے سینوں پر اپنے ہم نشیں دھنوا کی جواں مرگی کا بار ہے۔ دیوانگی کا پورا جواز ہے، عذر بھی بہت معقول ہے کہ دھنوا کا کوئی فدائی، ایک سرکش بے لگام ہو گیا تھا۔ یہ شہران کا، پولیس کی پشت پناہی انہیں حاصل ہے۔ اتنی جلدی اور تیزی مشکوک ہو سکتی ہے۔ سو میری نابودی کے فیصلے میں انہیں کچھ تحمل کرنا چاہیے لیکن کیا عجب، دماغ میں کچھ بھی سما جائے...... اور یہ اسپتال کوئی قلعہ نہیں۔ کوئی بھی کسی وقت میرے سر پہ آ دھمک سکتا ہے۔ سامنے سے نہیں تو عقب سے آ سکتا ہے۔ بے وضعی ٹھیری تو کیا جائز و نا جائز۔ حاصل یہ کہ مجھے تو اب اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا ہے۔

"آپ سمجھ رہے ہیں نا؟" مجھے گم دیکھ کے نوجوان افسر نے ٹوکا۔

"جی، جی ہاں۔" میں نے سانس لے کے کہا۔ "ہر بات سمجھ میں آ رہی ہے۔"

"کچھ نا ہیں ہووے۔ بھگوان کرے، سارا ٹھیک ہی رہے، پر اپنے کو تو آگے پیچھے کا دھیان رکھنا ہے۔" نوجوان نے مجھے تلقین کی۔

"پولیس باڑھ کا اپنا ایک تریکا ہے۔ کانونا آپ مانگ سکیں ہیں پرنتو کا پتا، پولیس کا او، کوئی بکاؤ آدمی ہوا۔" ادھیڑ پولیس افسر نے اپنا انتباہ جاری رکھا۔

میں نے کہنا چاہا کہ دعوا تو میری طرف سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ کل صبح عدالت کا دروازہ کھٹ کھٹایا جا سکتا ہے۔ شہر میں ایک اجنبی جس کے ساتھ بیمار بھائی تھا، کیسی کیسی زیادتیوں کا ہدف بنا رہا۔ اس کی جمع پونجی چھینی گئی۔ مزاحمت پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ دھنوا کو چاقو نہیں لگتا تو اجنبی نشانے پر تھا۔ انہوں نے اس کے لیے شہر کے راستے تنگ کر دیے اور اب وہ اسے ختم کر دینے کے درپے ہیں کہ اس نے شہر کے اڈے کے استاد کو اس کی چوکی سے بے دخل کر دینے کی جرأت کی تھی۔ گواہ موجود ہیں، ایک نہیں، بہت سے۔ روپے پیسے کی بات ہے تو سچ بولنے کے لیے انہیں خریدا جا سکتا ہے۔ آج کل سچ بھی خریدا جاتا ہے۔

ایسے ایسے بے سروپا خیال میرے سر میں منڈلا رہے تھے۔ اچھا ہوا جو میں نے اپنی زبان بند رکھی ورنہ وہ میرے متعلق کیا سوچتے۔ عدالت، اس کے مرحلے، الزامات، صفائیاں، پیشیوں پر پیشیاں۔ ہمیں کون سا یہاں ٹھیرے رہنا ہے۔ کچھ عرصے کے لیے عدالت کی طرف سے پولیس کا حفاظتی دستہ تعینات ہو جائے گا اور تاریخیں پڑتی رہیں گی۔ سچ کا اپنا زور و اثر کس قدر، عدالت میں

اسے ثابت کرنا پڑتا ہے اور آدمی کی عمر صرف ہو جاتی ہے۔ یہ عدالت کی بات جانے کیسے میرے دماغ میں آ گئی۔ آدمی کے پاس دماغ ہونے سے مراد یہ نہیں کہ دماغ ہر وقت اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ کہتے ہیں، دو خوبیاں آدمی کو جانور سے ممیز کرتی ہیں۔ بولنے اور سوچنے کی قوت یا صلاحیت مگر دونوں کا کچھ ٹھیک نہیں۔ دونوں کتنا اور کہاں تک آدمی کا ساتھ دیتی ہیں۔ زبان بہک جاتی ہے دماغ بھٹک جاتا ہے۔ دونوں آدمی کا ساتھ دیتے تو دنیا ہی بدلی ہوتی۔ آدمی کے یہ دونوں اوصاف تو بہت خام اور نا تمام ہیں۔

"آپ بولو تو اسپتال اور آس پاس سپھید کپڑواں میں آدمی پھیلا دے ویں؟ او لوگ میدا کا سب آدمی کو جانت ہیں۔ تھوڑا کھرچا پانی ہووے گا پر کام پکو ہو جاوے گا۔" نوجوان کو حرف مطلب زبان پر لانے میں اتنی دیر لگ گئی۔

مجھے کوئی اچنبھا نہیں ہوا اور شاید جو مجھے کہنا چاہیے تھا، میں نے وہی کہا کہ جو بہتر سمجھیں، کریں۔

میرے اس خسروانہ عندیے سے ان کے چہروں پر سکون و مسرت کے آثار نمودار ہوئے۔ دولت کا عجب کرشمہ ہے۔ آدمی کو آدمی کا اسیر کر دیتی ہے۔ پاس ہو تو گرویدگی میں کمی نہیں آتی، پاس نہ ہو تو دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ جلوہ گری کی تو بات ہی اور ہے، ذکر ہی اس کا مسحور کن ہوتا ہے۔ جس پر لٹاؤ، اس کا تو عالم ہی کیا، جس سے ہاتھ کھینچے رکھو، وہ ایک نظر عطا، لطف و عنایت کی ایک نظر کے آسرے میں زندگی گزار دیتا ہے یا گنوا دیتا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں دونوں پولیس افسروں کو طمانچے مارتا اور دھکے دے کے باہر نکال دیتا لیکن میرے پاس پیسا تھا، انہیں اس کی ہوس تھی۔ وہ میری ضرورت تھے، میں ان کی ضرورت تھا۔ وہ کتنی دولت کے طلب گار ہوں گے۔ سائل کا ظرف بھی تو کشادہ ہونا چاہیے، اور یہ تو بٹھل کا معاملہ ہے۔ سائل کا ہر ظرف چھوٹا پڑتا۔

بہت دیر سے نرس ایمی خاصی فکر مند نظر آ رہی تھی۔ پولیس سے بڑے بڑے رستم پناہ مانگتے ہیں۔ وہ تو ایک عورت تھی۔ بار بار کمرے سے باہر آ کے وہ ہمیں دیکھ جاتی۔ اس بار وہ مجھے دکھائی دی تو میں نے آواز دے کے اسے روک لیا۔ وہ منتظر ہی تھی۔ لپکتی ہوئی ہمارے قریب آ گئی۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ مہمانوں کی خاطر تواضع کا کچھ انتظام ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے انگریزی میں مخاطب کیا تھا، اس لیے کہ اب تک وہ مجھ سے اسی زبان میں ہم کلام رہی تھی۔ اس نے مودبانہ انداز میں سر جھکایا اور راہ داری میں بائیں طرف چلتی ہوئی نظروں سے دور ہو گئی۔

گوروں کی زبان بھی ان کی طرح دولت و حشمت، طاقت و عظمت کی علامت ہے، اسے بولتے ہوئے آدمی زیادہ دانا و بینا، اعتبار کے لائق معلوم ہوتا ہے۔ کچھ شد بد میرے سامنے موجود پولیس افسروں کو بھی تھی۔ "ای کا، کا جروت ہے۔ اپنے کو پتا ہے، ای اسپتال ہے، کھاتر تواجو کی جگہ نا ہیں۔" نوجوان نے چہکتی آواز میں کہا۔ اس کے بزرگ ساتھی نے بھی ہم نوائی کی۔

"ان کمروں میں انہوں نے مہمانوں کے لیے ایسا کچھ انتظام کیا ہے۔" میں نے اس کے احترام کی روش ترک نہیں کی۔

"ای کمروں کا، کا بات ہے گورا لوگ بھی ادھر آ کے ٹھیرت ہیں۔" نوجوان پلکیں پٹ پٹا کے بولا۔ دونوں کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

خوشامد ہر ایک کو مرغوب ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی وضع و مروت میں قبول کی جاتی ہے۔ آدمی کیا کرے، تعریف و توصیف کرنے والے کو دھتکار دے کہ وہ حد سے تجاوز کر رہا ہے۔ اپنا عرفان، ممدوح کو سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی کو سب سے کم ہوتا ہے۔ اس

کے مداح، تعریف و توصیف کی تکرار سے اس کی خود شناسی کی صلاحیت دھندلا دیتے ہیں۔ نوجوان افسر کہنے لگا کہ لگتا ہے، میدا کا وقت آ ہی گیا ہے۔ ہر ایک کے اقبال و اقتدار کا ایک وقت ہوتا ہے۔ خدا نے مجھے اسی لیے شہر پٹنا بھیج دیا ہے۔

میں نے دانستہ شوشہ چھوڑا کہ ایک صورت یہ بھی ہے۔ دیر کیوں کی جائے، کیوں نہ کل صبح سورج نکلتے ہی اپنا چاقو واپس لینے کے لیے اڈے کا رخ کرلوں۔ اڈے کی چوکی پر جگہ بنانے کے بعد خود بہ خود سارا معاملہ نمٹ جائے گا۔

یہ سن کے دونوں کھو سے گئے، پھر ادھیڑ افسر نے اٹکتی زبان سے کہا کہ مجھے ابھی اپنے بھائی کے علاج کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے۔ بھائی کی ناگفتہ بہ حالت کے دباؤ میں مبارزت کا مرحلہ متاثر ہوسکتا ہے۔ بہرحال کھلے چاقو درمیان میں ہوں گے۔ ہتھیاروں کی موجودگی میں زندگی اور موت کا فاصلہ کم ہی رہ جاتا ہے۔ ذرا سی چوک سے ایسی غلطی ہوسکتی ہے جس کا ازالہ مشکل ہوجائے۔

وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا لیکن اس کی سچائی نیک نیتی پر مبنی نہیں تھی۔ ہوتی تو محسوس ہوجاتی۔

''ہم کاہے کو ادھر آئے ہیں۔ ہم ہیں ساب۔ پہلے آپ بھائی کو دیکھو، اپنی سمجھ میں ایہی آوت ہے۔ باکی تو آپ...... آپ جانو۔'' نوجوان نے اپنے افسر کی فہمائش میں اضافہ کیا۔

میری دل جوئی کے لیے انہوں نے بہت سی باتیں کیں۔ مجھے اب وہ بالکل بدلے ہوئے لوگ لگ رہے تھے۔ وہ بیٹھے بیٹھے منقلب ہوگئے تھے۔ یہ وہ لوگ نہیں تھے جن سے کچھ دیر پہلے میرا سامنا ہوا تھا۔ جیب سے خریدی ہوئی چیزوں کی طرح ان پر اب مجھے اختیار حاصل تھا اور میں نے طے کرلیا تھا، جو وہ کہیں گے، اس پر سودے بازی نہیں کروں گا۔ دولت سے کسی پہلو سکون ملتا ہو تو دولت کا اس سے بڑا مصرف کیا ہے۔ دولت کی سب سے بڑی خریداری شاید آدمی کی خریداری ہے۔ یہ آدمی کو موم بنا دے، ریشم بنا دے، آدمی کو آدمی بنا دے اور آدمی کو جانور بنا دے۔ ''آپ لوگ کچھ بتاؤ گے یا مجھے چھوڑ دیں گے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میری بات ان کی سمجھ میں دیر سے آئی، ادھیڑ آدمی کو پہلے۔ اس کا جسم لہرا لہرا گیا اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ ''کا بات کرت ہو ساب۔''

''نہیں نہیں، کچھ کہنا ہو تو جھجک نہ کریں۔''

''ہم کا بولیں، آپ خود سمجھ دار ہو۔''

''ٹھیک ہے، پھر ہم پر چھوڑ دیں اور کسی بات کی فکر نہ کریں، آپ نے ابھی کہا تھا، ہم ہیں ناں ہم بھی آپ سے یہی کچھ کہتے ہیں۔ ہمیں تو اپنا بھائی سب سے زیادہ عزیز ہے۔''

مجھے ڈر تھا، اس دوران کہیں اکبر علی خاں نہ آ جائیں۔ اسپتال کے ملازم چائے اور کھانے پینے کی چیزیں لے آئے تھے اور وہی ہوا۔ راہ داری میں قدموں کی آہٹیں گونجیں۔ وہ اکبر علی خاں ہی تھے۔ کوئی نوعمر لڑکا بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی مطبخی (ٹفن کیریر) لٹکی ہوئی تھی۔ مجھے سبزے پر بیٹھا دیکھ کر اکبر علی خاں میری طرف ہی آ گئے۔ دو اجنبی میرے ساتھ تھے۔ انہیں پریشان ہو جانا چاہیے تھا۔ یہی حال دونوں افسروں کا ہوا۔ انہوں نے میرے ساتھ کھڑے ہو کے اکبر علی خاں کا استقبال اور ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا۔ ایک کرسی خالی تھی۔ اکبر علی خاں اس پر بیٹھ گئے۔ نوعمر لڑکا ان کی ہدایت پر کمرے میں چلا گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ اور مکدر ہوتے، میں نے دونوں افسروں کا تعارف کرایا۔ وہ اکبر علی خاں کو اچھی طرح جانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ میدا کے اڈے پر میرے ساتھ جانے والے بھی وہی تھے میں نے چائے کے برتن چھیڑ کے ان تینوں کا دھیان بٹانا چاہا۔ اکبر علی خاں خاصے متوحش تھے کہنے لگے۔ ''خیریت، آپ لوگ کیسے آ گئے؟''

''کا بولیں۔'' نوجوان افسر معذرت اور ستایش ملی جلی آواز میں بولا۔ ''ساب کو دیکھن واسطے آ گیو بس۔'' اس نے کم و بیش وہی کہا جو مجھ سے کہہ چکا تھا کہ میدا کے اڈے پر جا کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے شخص کا سن کے ان سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ مجھے دیکھنے کے لیے آ گئے۔ جزوی طور پر اس کا بیان صحیح تھا۔

''وہ تو ان کی مجبوری تھی۔'' اکبر علی خاں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ خوامخواہ کسی سے اڑنا نہیں چاہتے تھے مگر کیا کرتے؟''

''ان کی جگہ یو پہ کوئی اور ہوتا تو ایسو ہی تھوڑی چلا جات تھا۔''

ادھیڑ افسر بے ساختہ بولا۔ ''کوئی بات تو الگ ہووے گی وکیل ساب!''

دونوں افسروں نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ میرے اصرار پر رسماً انہوں نے دو ایک بسکٹ لیے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اکبر علی خاں کے آنے کے بعد وہ کشادگی محسوس کر رہے تھے۔ میں نے بھی انہیں نہیں روکا۔ راہ داری کے آخری سرے تک میں نے اور اکبر علی خاں نے انہیں تپاک سے رخصت کیا۔ یہ تپاک بڑا اوا جبی تھا۔ چلتے چلتے میں نے جلد ہی دوبارہ ملنے کا اشتیاق ظاہر کرکے ان کی دل جوئی کر دینا ضروری سمجھا۔

مجھے معلوم تھا، اکبر علی خاں ان دونوں کے سامنے چپ ہو گئے تھے، ان کے جانے کے بعد چپ نہ رہ سکیں گے۔ ہم سبزے پر رکھی کرسیوں پر آ کے بیٹھے ہی تھے کہ انہوں نے کوئی تامل نہیں کیا۔ ''کیوں آئے تھے یہ؟'' انہوں نے ناگواری سے پوچھا۔

''میں نے نہیں بلایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ظاہر ہے آپ کیوں بلاتے مگر آنے کی وجہ کیا تھی؟''

''انہوں نے بتایا تو تھا آپ کو۔'' میں نے دبی زبان سے کہا۔

''صرف اتنا ہی؟''

''وہ پولیس کے آدمی تھے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''میدا نے انہیں بھیجا تھا؟''

''کس لیے، میدا انہیں کیوں بھیجتا؟''

''سن گن لینے، تاڑ بھاڑ لینے کے لیے۔''

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟''

''اور کیا کہہ رہے تھے؟ مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے میاں۔'' اکبر علی خاں کی آواز میں دل سوزی تھی۔

''پولیس والے تھے، خود کو بیچنے آئے تھے۔''

''بیچنے۔'' وہ اچھل پڑے۔ ''پھر، پھر؟''

''میں نے انہیں خرید لیا۔''

''خرید لیا! کیا مطلب؟''

''میں نے ان سے بات کرلی۔''

''کس سلسلے میں؟''

''ان کا گداز، ان کی ہم دردی خریدنے کے لیے۔ وہ یہی بیچنے آئے تھے۔''

''کتنے میں سودا ہوا؟''

''یہ میں نے ان پر چھوڑ دیا۔ نرخ پوچھنا نامناسب معلوم ہوتا تھا۔ عطیے کی صورت رہے تو اچھا ہے۔''

''گویا ابھی نقد کچھ ادا نہیں کیا؟''

''کچھ ساکھ بن گئی ہے شاید۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''مجھے پوری بات بتائیے۔''

میں سوچتا رہا، انہیں کیا بتاؤں، کیا نہیں مگر چھپانے کو تھا بھی کیا۔ میں نے اختصار سے ساری روداد گوش گزار کردی۔

وقت گزر گیا۔ انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر

نہیں کیا تو میں نے پوچھا۔ ''کس فکر میں پڑ گئے آپ؟''
''کچھ نہیں۔'' وہ متردد لہجے میں بولے۔
''سوچ رہا ہوں، بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ایک بات انہوں نے بھی غلط نہیں کہی۔ میدا یا اس کے آدمی اس مہلت میں......'' وہ کہتے کہتے رک گئے۔
''وہ مجھے دوبارہ اڈے پر جانے کے قابل ہی نہیں چھوڑیں گے۔ یہی نا؟''
''یہ خیال میرے دماغ میں بھی آیا تھا لیکن ایسی جگہوں اور ان لوگوں کے رسم ورواج پر آپ کا یقین دیکھ کر، میں چپ رہا۔''
''ایسا کہیں ہوتا نہیں ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''اور مجھے تو اب بھی شبہ ہے۔''
''یعنی اب تک آپ کو......'' وہ رنجیدہ ہونے لگے۔ ''مگر مجھے ان لوگوں پر کوئی بھروسا نہیں۔ صاف بات ہے۔ آپ مانیں نہ مانیں۔ وہ میدا کا دست راست ہر جو بہت گھاگ اور کائیاں شخص ہے۔ اس نے مہلت لی ہے، دی نہیں ہے اور جیسا کہ آپ کا اعتماد تھا، اسے اپنے پروردہ کا انجام نظر آگیا تھا۔ اس وقت مجھے یہ مہلت بڑی غنیمت محسوس ہو رہی تھی لیکن اب......ان سے کچھ بعید نہیں ہے میاں۔''
''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔
''کیا کہوں۔ دماغ کام نہیں کر رہا۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے، وہ پولیس والے ٹھیک کہہ رہے تھے، آپ ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔''
''کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہی پڑے گا۔'' اکبر علی خاں بہت گھبرا گئے تھے۔ ان کی پریشانی کم کرنے کے لیے میں نے ہلکی آواز میں کہا لیکن یہ تسلی بڑی مصنوعی تھی۔
''اب تو مجھے اپنا یہ شک بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو کہیں میدا ہی نے نہ بھیجا ہو۔ وہ یہ جاننا چاہتا ہوگا کہ اس کے ٹھکانے سے جانے کے بعد اب آپ کے ارادے کیا ہیں۔''
''ایسی صورت میں تو کچھ بھی ممکن ہے۔''
''انہوں نے آپ سے آپ کے ارادوں کے بارے میں کچھ پوچھا تھا؟''
''ہاں ہاں، پوچھا تو تھا کچھ ایسا۔''
''اور آپ نے کیا جواب دیا؟''
''میں نے وہی کہا جو میرا ارادہ ہے کہ مجھے اپنا چاقو واپس لینے میدا کے اڈے پر جانا ہے۔''
''اوہ!'' انہوں نے شدت سے آنکھیں بھینچ لیں، ماتھے پر شکنوں کا جال پڑ گیا۔ ''معاف کیجیے، کیا ضرورت تھی آپ کو یہ کہنے کی۔''
''ہاں، مجھے شاید اپنا عزم اپنے آپ تک ہی رکھنا چاہیے تھا۔'' میں نے خفت سے کہا۔
''اس کے بعد وہ کیا بولے؟'' انہوں نے تیزی سے پوچھا۔
''انہوں نے میرا ارادہ اور مہمیز کیا اس وقت میں نے جانا کہ وہ میدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہیں۔ انہوں نے میدا کو بہت برا بھلا کہا۔ مغلظات سنائیں۔''
وہ خاموش ہو گئے، میں بھی۔
شبنم گرتی محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن سبزہ نم ہو گیا تھا۔ بہت دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی۔ نرس ایمی نے باہر آ کے ہمیں چونکایا۔ وہ کھانے کے لیے پوچھ رہی تھی۔ اکبر علی خاں ایک دم کھڑے ہو گئے۔
''میں تو بھول ہی گیا۔'' وہ پشیمانی سے بولے۔
''کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔''
ہم کمرے میں چلے آئے اور بٹھل کو ایک نظر دیکھ کے پھر باہر آ گئے۔ ایمی کا مشورہ تھا، دیسی کھانوں کی خوشبو۔ کمرے میں رچ بس جاتی۔ ایمی نے کینٹین کے ملازم سے رکابیاں منگوائیں۔ اکبر علی خاں کے ساتھ آنے والے لڑکے نے بھی اس کی مدد کی۔ کھانا ابھی نیم گرم تھا۔ وہ کوئی پانچ چھ آدمیوں کا کھانا لے آئے تھے۔ بھوک نہ ہو تو اشتہا انگیز خوشبو بھی

پھیکی پھیکی لگتی ہے۔ اکبر علی خاں کی وجہ سے میں نے ساتھ دیا۔ کھانا خاصا لذیذ تھا مگر لذت بھی تو نشاطِ خاطر سے مشروط ہے۔ میں لقمے ٹونگتا رہا۔ اکبر علی خاں بھی رسم نبھایا کیے۔ کھانے کے دوران انہیں خیال آیا۔ ''کچھ پیش بندی تو کرنی ہوگی۔''

''دو ہی صورتیں ہیں۔'' میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایک تو یہ صاحب، کسی طرح جلد سے جلد ٹھیک ہو جائیں۔'' میرا اشارہ بٹھل کی طرف تھا۔

''خدا کرے، آپ کی زبان مبارک ثابت ہو۔'' اکبر علی خاں تڑپ سے گئے۔ ایسی تڑپ جو کسی اپنے ہی میں ممکن ہے۔ ''اور دوسری صورت؟'' انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

''دوسری یہی رہ جاتی ہے کہ آپ پہلی فرصت میں تار دے دیں۔''

لقمہ ان کے ہاتھ میں رہ گیا۔ ''ہاں ہاں، بے شک۔ یہ بھی ایک صورت ہے، ان حالات میں نہایت صائب۔ کاش آپ شام ہی کو ہاں کر دیتے۔''

''اب بھی کتنی دیر ہوئی ہے۔ تار گھر تو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ تار وقت پر مل گیا تو کل رات یا پرسوں صبح تک کوئی نہ کوئی ضرور آ جائے گا۔''

''ارجنٹ تار دیا جائے گا۔ رات کو بھی پہنچایا جاتا ہے۔ پھر تو مجھے جلدی کرنی چاہیے۔''

''پہلے آپ کھانا تو ختم کریں۔''

''میرا ارادہ دیر تک بیٹھنے کا تھا۔ آپ کا دل بھی بہلا رہتا ہے۔ مجھے آنے میں وقت لگ گیا۔ آپ کو معلوم ہے، والدہ بیمار ہیں۔ شام کے وقت ان کی طبیعت عموماً بگڑ جاتی ہے۔ آج تو ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔''

''پھر تو آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''کیسے نہ آتا۔ وعدہ جو کیا تھا آپ سے۔ نزہت نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ وہ تو سبھی آنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا، رات ہو گئی ہے بھئی۔ کل چلیں گے۔ سب آپ سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔''

''میں تو دوپہر ہی ان سے ملا تھا۔'' میں نے اداسی سے کہا۔

''اس وقت کی بات اور تھی۔ میں نے جا کے جب بتایا کہ بابر میاں کی ایک ایک بات حرف بہ حرف درست تھی۔ واقعی ان کے بھائی اسپتال میں ہیں اور علاج...... علاج تشخیص کے مرحلے میں ہے تو سبھی شرمندہ ہوئے۔''

''الٹا شرمندہ ہوئے۔'' میں نے زہر خند سے کہا۔ ''مجھے تو ان کے سامنے جانے کے خیال ہی سے ندامت ہو رہی ہے۔''

''واہ صاحب، کیسی ندامت۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولے۔ ''خیر چھوڑیے۔ یہ میٹھا لیجیے۔ کھانا تو آپ نے کھایا ہی نہیں۔ نزہت خانم نے یہ حلوہ اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ تجربے کرتی رہتی ہیں۔ کہیں لبنانی حلوے کی ترکیب پڑھ لی...... تھی، بس طبع آزمائی شروع ہو گئی۔'' اکبر علی خاں نے رکابی میں حلوہ نکال کے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ایک چمچہ لیا۔ بہت خوش ذائقہ تھا۔ واقعی نفاست سے تیار کیا گیا تھا۔ ''میری طرف سے شکریہ ادا کر دیجیے گا۔'' میں نے کہا۔

''کل وہ آئیں گی۔ آپ خود کہہ دیجیے اور ہاں، اگر آپ کہیں تو تار دے کے میں واپس آ جاؤں۔''

''نہیں نہیں۔'' میں نے شدت سے انکار کر دیا۔ ''رات اب بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ جا کے آرام کریں۔''

''آپ کو نیند نہیں آئے گی اور سچ پوچھیے تو مجھے بھی نہیں آئے گی۔ خدا آپ کے بھائی کو جلد صحت یاب کر دے۔ گھر میں سبھی نے دعا کی ہے۔ نزہت تو کہہ رہی تھیں، کل محلے کی عورتیں بلا کے آیتِ کریمہ کا ورد کروائیں گی۔''

ان سے آج دوپہر ملاقات ہوئی تھی۔ جس طرح برسوں کا تعلق لمحوں میں ختم ہو جاتا ہے، لمحوں میں برسوں جیسا تعلق قائم بھی ہو جاتا ہے۔ تعلق خاطر کے لیے وقت کے طول و عرض کی کوئی شرط نہیں۔ کوئی ایک نگاہ بھی ایسی کارگر ہوتی ہے کہ آدمی زندگی وقف کر دے، زندگی تج دے۔ کبھی زندگی بھر کی رفاقت سے کچھ فرق نہیں پڑتا، آدمی کی تنہائی اور تشنہ کامی ختم نہیں ہوتی۔

اکبر علی خاں جلد ہی چلے گئے۔ کچھ دیر میں اکیلا باہر بیٹھا رہا۔ تنہائی سے مراد خاموشی نہیں ہے۔ تنہائی میں آدمی خود سے ہم کلام ہوتا ہے۔ مخاطب کو خاموش کیا جا سکتا ہے، اپنے آپ کو نہیں۔ شبنم سے کپڑے رسمسانے لگے تو میں نے کمرے کا رخ کیا۔ کمرا سنسان تھا۔ میں بٹھل کے بستر پہ نہیں گیا۔ اسے اس طرح بے حال دیکھ کے میرا جی ہولنے لگتا تھا۔ ایمی اپنی مخصوص آرام کرسی سے اٹھ کے میرے پاس آ گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اسے مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ اس نے وہی سوال کیا جس کا جواب میں دینا نہیں چاہتا تھا۔ میرے جواب سے اس کی بے چینی وحشت میں بدل جاتی۔ ''کچھ خاص نہیں۔'' میں نے سرسری طور پر کہا۔ ''کچھ شبہ ہو گیا تھا نہیں۔ دور ہو گیا تو چلے گئے۔''

ایمی ایک بردبار عورت تھی، اپنی حدود سے واقف، سو اس نے تجاوز نہیں کیا۔ میں بھی کچھ پوچھنا چاہتا تھا، وہی ایک سوال جو کئی بار میں نے کیا تھا۔ اب پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میرے عاجزانہ لہجے پر مسکرا پڑی۔ ''میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز پر یاسیت غالب آ گئی۔

''نرس بھی آدھی ڈاکٹر ہوتی ہے۔ تمہارا تجربہ بھی کم نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''کاش میں کچھ بتا سکتی ایک بات ہے۔ مجھے ڈاکٹر رائے پر اعتماد ہے۔ وہ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔'' اس نے وثوق سے کہا۔

''یہ تو میں کل رات سے سن رہا ہوں۔''

''اور کچھ غلط تو نہیں سن رہے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔''

''لیکن ڈاکٹر رائے تو کچھ کہتے ہی نہیں۔''

''وہ ایک ذمے دار ڈاکٹر ہیں۔''

''لگتا ہے، وہ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔''

''ڈاکٹر رائے نے غلط نہیں کہا تھا۔ تم ایک بڑے بچے ہو۔'' اس کے ہونٹوں پر اس کی خاص مشفقانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے۔ وہ بٹھل کے بستر کی طرف گئی اور کرسی پر بیٹھ کے آنکھیں موند لیں۔ یوں وہ مجھے بھی آرام کی ترغیب دینا چاہتی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھا رہا۔ پھر مریض کے ذاتی نگہ دار کے لیے مخصوص بستر پر آ کے دراز ہو گیا۔

کھلی آنکھوں کے سامنے موجود افراد، مناظر اور اشیاء، آدمی کے تصور کی بے کرانی محدود کر دیتے ہیں۔ بند آنکھوں کے آگے تو ایک جہاں کھل جاتا ہے۔ پھر کوئی حد اور کوئی حساب نہیں۔ بند آنکھیں تو اور بینا ہو جاتی ہیں۔ آنکھ بند کرتے ہی میرے سامنے کوئی فرد ماہ و سال کھل گئی تھی، اپنی عدالت آپ۔ آپ ہی منصف، آپ ہی مدعی۔ کون سی کوتاہی ہوئی، کس کا حق چھینا گیا، کس سے زیادتی کی گئی۔ یہ کون سے گناہوں کی سزائیں ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتیں۔ یاسمین اور فروزاں کو اس کمینے سید محمود علی کے چنگل سے چھڑانا کوئی جرم تھا کیا؟ انہیں آباد کرنے کی خاطر فیض آباد جانا ضروری تھا۔ وہاں گئے ہوئے وقت بھی خاصا گزر گیا تھا۔ ایک دن حویلی سے نکلنے کی غلطی کیا ہوئی کہ شہر سے باہر جانے پر پابندی لگا دی گئی اور جب اجازت ملی تو...... جہاں اتنے دن ہو گئے تھے، ایک دو دن فیض آباد میں اور گزارے جا سکتے تھے۔ بٹھل نے زریں کا خیال کیا نہ حویلی میں نووارد فروزاں اور یاسمین

کا۔ حویلی کے ہر مکین کی یہی خواہش تھی کہ ابھی چند دن اور ہم ان کے پاس رہیں۔ جب ہم رخصت ہو رہے تھے، سب کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ میں نہ ہوتا تو بٹھل رک جاتا، میں نہ ہوتا تو بٹھل کہیں جاتا ہی کیوں۔ وہ تو اتنی عزیز از جان، اپنی بیٹی زریں کے پاس ہی رہتا۔ زریں میں تو اس کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ بٹھل رک جاتا لیکن میں جو ایک مسلسل مطالبہ، مستقل تقاضا، اس کے سامنے کھڑا تھا۔ روز ہزاروں ریل گاڑیاں ادھر سے ادھر جاتی ہیں۔ اسی دن ہمیں روانہ ہونا اور اسی گاڑی سے سفر کرنا تھا جس کا انجن آگے جا کے خراب ہو جانا تھا اور یہاں پٹنا شہر میں بٹوا چھن گیا تھا تو اس غاصب کے تعاقب کا گناہ کیوں مجھ سے سرزد ہو گیا۔ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی۔ کہتے ہیں، سارا کچھ آسمان کے تیور پر ہے۔ کوئی مصلحت، کوئی اس کی رمز ہوتی ہے۔ آسماں کا یہی طور ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ آسماں کی نظر میں یہ لغزشیں ہیں تو آدمی سے ہوتی رہیں گی۔ اب تو ہر بات پر شبہ، ہر قدم پر کسی خطا کا گمان ہوتا ہے۔ کیا معلوم، کون پیچھے سے چھرا گھونپ دے، تمنچے کا منہ کھول دے۔ کسے کون سی بات بری لگ جائے، کون سا راستہ کب بند ہو جائے۔ کوئی امتحان ہے یہ......؟ تو کیسا امتحان ہے جو ختم نہیں ہوتا۔ امتحان ہی میں آدمی تمام ہو جاتا ہے کیا!......

میں کروٹیں بدلتا رہا، ایک کے بعد ایک منظر۔ ہوا میں رکھی کتاب کے ورق جیسے پلٹتے جاتے ہیں۔ کہاں سے کہاں تک، کتنے گلی کوچے، کتنے چہرے، کیسے کیسے لوگ، مڑ کے پیچھے دیکھو تو دماغ پھٹ جائے۔ کتنے لوگ لپیٹ میں آ گئے۔ کہتے ہیں، آدمی کے ختم ہو جانے کے بہانے بن جاتے ہیں۔ بہانہ پھر کس کا ہوا؟ اس رات نہ میں اپنا گھر چھوڑ کے کورا کے ساتھ نکل جانے کا ارادہ کرتا نہ اتنے لوگوں کا بہانہ بنتا۔ اب تو کوئی شمار ہی نہیں۔ کورا پناہ لینے گھر آئی تھی اور ابا جان اسے گھر میں رکھنے پر تیار نہیں تھے، تو مجھے ان کے سامنے سینہ سپر ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ کیا کر لیتے، گھر سے نکال دیتے تو بات دوسری تھی۔ سب لوگوں کو چھوڑنے کا اتنا بڑا فیصلہ میں نے کیوں کر لیا۔ میں ابا جان کے پیروں پر سر رکھ کے دہائیاں دیتا تو وہ پسیج بھی سکتے تھے۔ امی، فی، کرشنا جی، پیرو دادا، کانتے، مارٹی اور جانے کون کون ...... کہتے ہیں، جو گزر گیا، وہ مٹی ہو گیا، آدمی ہو یا وقت۔ آج جو موجود ہے اس کی فکر کرنی چاہیے...... مگر آدمی کو گزرے ہوئے ماہ و سال سے نجات کہاں ملتی ہے، گزرے ہوئے وقت کی زنجیریں تو اسے جکڑے رہتی ہیں۔ ہر آج، بیتے ہوئے کل کے خمیر سے اٹھتا ہے اور آدمی کو چین لینے نہیں دیتا۔ امی اور فی مٹی ہو گئیں پر سامنے تو اب بھی آ جاتی ہیں، کرشنا جی، پیرو دادا، کانتے، مارٹی، ان کا بھی یہی ہے، جب دیکھو منہ اٹھائے چلے آتے ہیں...... آدمی مٹی ہو جاتا ہے، نقش تو مٹی نہیں ہوتے۔ نقش تو اس وقت تک محفوظ رہتے ہیں جب تک نقش محفوظ رکھنے والا ہی مٹی نہ ہو جائے۔ کاش زندگی بہت مختصر ہوا کرتی، ایک دن، دو دن، ایک پل، دو پل۔ انجام تو ایک ہی ہے۔ وقت زیادہ ملے یا کم پر یہ زیادہ وقت کی زندگی تو بڑی عذاب ہے۔

یکا یک ایک ہوک سی اٹھی۔ میں بستر پر اٹھ کے بیٹھ گیا۔ سینہ جیسے کوئی دھنک رہا تھا۔ کمرے میں برائے نام روشنی تھی۔ ایمی آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ بٹھل حسب معمول بے خبر تھا۔ میں نے کمرے پر نظر ڈالی۔ ہر چیز ٹھیری ہوئی، جوں کی توں تھی۔ ایمی نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ایمی کے منتشر ہو جانے کے خیال سے میں نے اٹھ کے پانی پینے کا ارادہ ملتوی کیا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

اس وقت دروازے پر دستک کا شبہ ہوا۔ نیم خوابیدہ ایمی مجھ سے پہلے چونک پڑی۔ اس نے

بے کلی سے میری طرف دیکھا۔ لکڑی کے اونچے اور چوڑے دروازے کے بالائی حصے میں چھوٹے چھوٹے چوکور خانے شیشے کے تھے۔ ایمی نے پردہ کھینچ دیا تھا۔ باہر کا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ دروازے کے قریب ہی تھی۔ دروازہ کھولنے کے بجائے گھبرائی ہوئی آواز میں اس نے انگریزی میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

جواب میں ایک دو لمحے خاموشی رہی پھر کسی نے بے ربطی سے کہا۔ ''بابر صاحب کے کچھ مہمان آوت ہیں۔ ان کو باہر بھیج دیو۔''

میں بستر سے اچھل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے آواز پہچاننے کی کوشش کی۔ بیک وقت بہت سے شکوک ذہن میں امڈے۔ اشارے سے میں نے ایمی کو اپنے بارے میں کچھ بتانے سے منع کیا۔

دروازے سے ہٹ کے ایمی کچھ فاصلے پر کھڑکی کی جانب چلی گئی۔ کھڑکی پر باریک جالی نصب تھی۔ اندر عام دروازے کی طرح لکڑی اور شیشے کے پٹ تھے۔ تازہ ہوا کے لیے ایک پٹ کھلا ہوا تھا لیکن کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں آڑ میں ہوگیا۔ ایمی نے پردہ ذرا سا کھسکایا۔ ''بابر ساب ادھرنا ہیں ہے۔'' ایمی نے پہلے انگریزی پھر ہندوستانی میں جواب دیا۔

''ساب کدھر گیو ہیں؟'' باہر سے کسی نے ہیجانی آواز میں پوچھا۔

''وہ ادھرنا ہیں ہے۔'' ایمی نے بہ ظاہر بے اعتنائی سے کہا۔ ''ہوٹل گیا ہے۔''

''ہوٹل...... کون سا ہوٹل؟'' یہ آواز پہلے سے مختلف تھی اور جکڑی ہوئی تھی۔

''اپنے کو ناہیں معلوم، رات ادھر ہی ریسٹ کرے گا۔ سویرے آنے کو بولتا ہے۔'' ایمی نے اس بار کسی جھجک کے بغیر پوچھا۔ ''آپ کون ہے؟''

ابھی ایمی نے اتنا کہا تھا کہ راہ داری میں دور سے کہیں بھاگتے قدموں کی چاپیں گونجیں اور بھن بھناتی سرگوشیاں۔ چاپوں اور سرگوشیوں کا ملا جلا شور قریب ہوا اور اسی تیزی سے دروازے سے دور ہوتا گیا۔

ایمی کھڑکی کے پاس کھڑی رہی۔ کچھ ہی دیر میں سناٹا چھا گیا۔

ایمی نے کھڑکی کا پردہ ٹھیک کیا۔ میں بھی آڑ سے ہٹ کے صوفے پر چلا آیا۔ اتنی رات گئے آنے والے میری تلاش میں آئے تھے۔ یہی ہوسکتا تھا کہ انہیں اسپتال میں داخل ہوتے ہوئے اسپتال کے عملے اور دربانوں نے کہیں دیکھ لیا تھا اور ان کا تعاقب شروع کردیا تھا۔ میری جستجو میں آنے والے ہمارے کمرے تک پہنچنے میں کام یاب ہوگئے تھے لیکن انہیں زیادہ دیر دروازے پر ٹکنے کا موقع نہ مل سکا۔ راہ داری میں اسپتال کے دربانوں اور محافظوں کے سر پہ پہنچ جانے کی وجہ سے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہی کچھ ہوسکتا ہے۔

میرا جسم ڈھیر ہوگیا تھا۔ سانس لینے اور کچھ سوچنے سے پہلے ایمی کے سوالوں کے جواب کے لیے مجھے تیار ہوجانا چاہیے تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مجھے بھی اپنے آپ کو جواب طلبی کی بہت بے چینی ہے۔ ایمی پختہ عمر عورت تھی، اپنے کام میں طاق، پر اعتماد لہجے میں بات کرتی تھی، اپنے کام اور اپنی ذات پر اسے بہت اعتماد تھا۔ اس وقت اس کا حال مختلف تھا۔ بے گانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا کی، میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں جیسے۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی اور سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''کون تھے یہ؟'' اس نے دھڑکتی آواز میں پوچھا۔

جواب آسان نہیں تھا۔ رات کو دو پولیس افسروں کی غیر متوقع آمد کے بارے میں اسے جس کس طرح مطمئن کردیا تھا لیکن اب میں اسے کیا بتاتا صبح تک سارے اسپتال میں گردش کرنے والی چہ

میگوئیوں کے خیال سے میرے حواس کام نہیں کررہے تھے۔ بہت کچھ ایمی پر منحصر تھا کہ وہ اپنی زبان کس حد تک کھولتی ہے۔ ڈاکٹر رائے اور اسپتال کے منتظمین کو کیا کچھ بتاتی ہے۔ رات ہی ڈاکٹر رائے پولیس افسروں کی آمد کی اطلاع پر کھٹک گیا تھا۔ اب اسے میرے اور بٹھل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں کیا دشواری ہوگی۔ وہ ایک سخت مزاج شخص ہے۔ اس کی بدگمانی اور برہمی ..... مشکل صورت حال سے دوچار کرسکتی ہے۔

''کیا بات ہے؟'' نرس ایمی سراسیمگی سے بولی۔ ''کون تھے یہ؟''

میں نے آنکھیں میچ لیں اور چیختی آواز میں کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم...... لیکن وہ میرا ہی نام لے رہے تھے اور میری تلاش میں آئے تھے۔''

ایمی کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

''میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اس لیے کہ تمہارا کوئی واسطہ نہیں تھا۔'' میں نے اوسان مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ ''لیکن وہ یہاں تک آگئے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو لیکن اب تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ کل رات سے اب تک میرے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ کل رات سے پہلے اس شہر میں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہمیں یہاں آنا ہی نہیں تھا مگر بھائی کی حالت کی وجہ سے آگے سفر جاری رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔''

شاید یہی مناسب تھا کہ میں اس سے کچھ نہ چھپاؤں اور میں نے کچھ نہیں چھپایا۔ میں نے اس قدر اختصار روا رکھا کہ اسے میرے بیان میں کوئی گرہ اور پیچیدگی محسوس نہ ہو۔ سیاق وسباق کے بغیر اس سادہ شعار کی نظر میں یہ عرض حال نامکمل ہوتا۔ وہ درمیان میں نہیں بولی، ایک بار میری آواز بیٹھ گئی تو اس نے اٹھ کے مجھے پانی پلایا اور مبہوت انداز میں سنتی رہی۔ اس نے وہی سنا جو میں نے کہا تھا اور وہی سمجھا جو میں چاہتا تھا کیوں کہ وہی سچ تھا اور کیوں کہ وہ ایک نیک دل خاتون تھی۔ میں چپ ہوا تو وہ آب دیدہ ہوگئی۔

''ہم کوئی چور اچکے نہیں ہیں۔ ہم نے کسی کا حق غصب نہیں کیا۔ بھائی کی حالت تمہیں معلوم ہے۔ ایسے میں کون کسی جھگڑے ٹنٹے میں پڑنا چاہے گا۔ پاگل ہی ہوگا کوئی......'' میری آواز رندھنے لگی۔

''یہ سارا کچھ ناقابلِ یقین سا ہے۔ ایسے برے، بے ایمان اور بدمعاش لوگ رہتے ہیں اس شہر میں۔'' وہ حیرانی سے بولی۔ ''اور...... اور یہ، یہ لوگ کیا کرنے آئے تھے؟''

''ظاہر ہے، ایک ہی بات ہوسکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''یعنی وہ تمہیں...... تمہیں......'' اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور آنکھیں بند کرلیں۔ ''اوہ میرے خدا......''

''ان کی آواز پر میں باہر نکل جاتا، اگر ان سے پہلے وہ پولیس افسر نہیں آتے۔ پولیس افسروں کی آمد کے بعد مجھے چوکنا ہوجانا چاہیے تھا۔''

''اوہ، اوہ......'' اسے جھرجھری آگئی۔ ''یعنی وہ پولیس افسر جو تم سے ہم دردی جتانے آئے تھے، یہ انہی کے آدمی تھے۔''

''ہوسکتا ہے۔ وہ میدا کو بری طرح گالیاں دے رہے تھے۔ وہ میدا کے فرستادہ بھی ہوسکتے ہیں۔ انہوں نے سارا محل وقوع دیکھ لیا تھا۔ اسپتال کے اس حصے میں ویسے بھی سناٹا ہوتا ہے۔ اتنی رات گئے تو انہیں یہ سب کچھ بہت آسان معلوم ہوا ہوگا۔ کچھ مجھ سے بھی غلطی ہوئی۔ پولیس افسروں کی زبانی میدا کے ارادوں کا سن کے میں نے کہا کہ پھر تو مجھے کل سویرے سورج نکلتے ہی میدا کے اڈے کا رخ کرنا چاہیے لیکن صرف غصہ ہی نہیں، یہ جتانے سے مقصد کچھ اور بھی تھا۔ پولیس افسروں کے سامنے اپنے عزم کی پختگی کا اظہار بھی مقصود تھا۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان پولیس افسروں کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔ جیسا کہ

انہوں نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ چاقو بدلنے کی رسم ادا کر کے میدا نے سر پہ منڈلاتا خطرہ ٹالا ہے۔ اب اسے میرا کام تمام کرنے میں جلدی کرنا چاہیے۔ دھنوا کے جنونی ساتھیوں کے غم وغصہ کا جواز تو موجود ہی ہے۔ دربانوں نے انہیں دیکھ لیا اور ادھر میں کمرے سے باہر نہیں نکلا۔" میں نے ایمی کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میرے کچھ کہے بغیر کمرے میں میری موجودی سے انکار کر دیا۔ ہوسکتا ہے، انہیں یقین آگیا ہو اور وہ مایوس لوٹنا چاہتے ہوں کہ تعاقب میں آنے والوں نے انہیں اور بوکھلا دیا۔

"مجھے کچھ شبہ ہو گیا تھا۔" ایمی کی آواز ہانپ رہی تھی، کہنے لگی "رات وہ پولیس والے آئے تھے، پھر رات گئے، اتنی رات گئے تمہیں پوچھتے ہوئے ان لوگوں کی آمد پر میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں کوئی گڑ بڑ ہے۔ تم جانتے ہو گے کہ ان خاص الخاص کمروں کے ہر کمرے سے ملحق نرس کا ایک چھوٹا کمرا بھی ہوتا ہے۔ رات بھر نرس وہیں رہتی ہے اور وقفے وقفے سے مریض کو دیکھنے آتی رہتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر مریض اور اس کا ساتھی تیماردار بھی گھنٹی بجا کے اسے طلب کر سکتا ہے۔ گزشتہ رات میں اپنے کمرے میں تھی اور شاید تین چار مرتبہ مریض کا معائنہ کرنے آئی تھی۔ آج ڈاکٹر رائے نے خاص طور پر مجھے مریض کے کمرے میں رہنے کی ہدایت کی تھی۔ انہوں نے نیند آور دواؤں میں کمی کی تھی اور مریض کا ردعمل دیکھنے کے لیے میرا اس کے پاس رہنا ضروری تھا۔ عموماً رات کو ہم کمروں میں چٹخنی نہیں لگاتے۔ یہ ایک بڑی محفوظ جگہ ہے۔ ایسی واردات کا تو یہاں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ دوسرے کسی انتہائی اہم ضرورت میں چٹخنی کھلونے میں وقت صرف ہونے کا بھی احتمال رہتا ہے۔ لیکن چوں کہ آج رات میرا قیام اسی کمرے میں تھا، میں نے چٹخنی لگا دی۔ میں کہہ نہیں سکتی، کیوں؟ شاید اس لیے کہ تمہارے پاس آنے والے پولیس افسر دیکھ کے میرے چھٹی حس بیدار ہو گئی تھی...... اور یہ لوگ آگئے۔ انہوں نے دروازہ کھول کے اندر آنے کی کوشش کے بجائے دستک دینا مناسب سمجھا۔ وہ خود بھی گھبرائے ہوئے ہوں گے۔ دراوزہ کھلا ہوتا اور وہ دھکا دے کے اندر داخل ہو جاتے اور اگر میں نہ ہوتی، کمرے میں صرف تم ہوتے اور اگر ہم دونوں بھی ہوتے تو......" ایمی کا جسم لرز گیا۔ اس نے جلدی سے سینے پر کراس بنایا اور خوف زدگی سے بولی۔ "خداوند نے ہم سب پر رحم کر لیا۔"

"ہاں" میں نے تھکی تھکی آواز میں اقرار کیا۔ "پھر تو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔"

اس کے ہم دردانہ رویے سے مجھے حوصلہ ہوا۔ اسی لیے میں نے سیاق وسباق کے ساتھ سارا احوال اس کی جناب میں کہہ دینا ضروری جانا تھا۔ اب میں اس سے گزارش کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "سسٹر! تم ڈاکٹر رائے کو کچھ نہ بتاؤ تو بہتر ہوگا۔ کیا ضرورت ہے، انہیں بتایا جائے کہ وہ لوگ ہمارے کمرے پر آکے ٹھیر گئے تھے اور میرا نام لے رہے تھے۔"

"مگر...... مگر ان کا تعاقب کرنے والے دربانوں نے انہیں ہمارے کمرے پر ٹھیرے ہوئے ضرور دیکھ لیا ہوگا۔" وہ ہچکچا کے بولی۔

"امکان یہی ہے، نہیں دیکھا ہوگا۔ ہمارے کمرے کے دروازے پر موجود لوگ، دربانوں کی بلند ہوتی ہوئی چاپوں پر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ انہوں نے پھر کوئی لمحہ نہیں گنوایا ہوگا۔" میں نے ایمی کو قائل کرنے کی کوشش کی اور ملتجی لہجے میں کہا۔ "سسٹر! ڈاکٹر رائے کے مزاج سے تم واقف ہو۔ جانے وہ ہمیں کیا سمجھیں۔ مفرور، جرائم پیشہ، کیا کیا۔ کوئی الٹی سیدھی بات ان کے دماغ میں آگئی تو ہم کیسی مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، اسپتال سے نکل جانے کا حکم دے دیں۔ پھر ہم کہاں کہاں بھاگتے پھریں گے، کون سے اسپتال کا رخ کریں گے۔ بھائی کی حالت اس دربدری کی

متحمل ہوسکتی ہے؟ یہ تم بہتر جانتی ہو۔ بھائی کی صحت یابی کے بعد تم جو چاہو، ان سے کہہ دینا۔"

وہ چپ ہو گئی اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"تم نزاکت سمجھ رہی ہو؟" میں نے عاجزی سے کہا۔

وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

میں نے پھر اس سے اصرار نہیں کیا۔ بہت دیر خاموشی کے بعد وہ ہڑبڑا کے بولی۔ "لیکن ناکام ہو جانے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ شیطان دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے۔"

"اکبر علی خاں کے ذریعے میں نے تار دلوا دیا ہے۔ کل رات یا پرسوں صبح تک کوئی نہ کوئی ضرور آجائے گا۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"پھر میں انہیں دیکھ لوں گا۔"

"کیا...... کیا دیکھ لو گے؟"

"اس عرصے میں بہت محتاط رہنا ہوگا۔" مجھے یال آیا اور میں نے بات بدل کے کہا۔ "اس دران ہم خود بھی پولیس کی مدد لے سکتے ہیں۔ وہ لیس والے، اگر واقعی میدا کے آدمی نہیں تھے تو یسا کہ انہوں نے کہا تھا، روپے پیسے کے عوض رے لیے سپر کا کام کر سکتے ہیں اور اب امید یہی ہے، اس ناکامی کے بعد دو ایک دن تو کوئی بھی پتال آنے کی جرأت نہیں کر پائے گا۔ وہ خود بھی شیار ہو جائیں گے اور کیا عجب ہے، اس دوران ئی ٹھیک ہو جائیں۔ مجھے تو پہلے ان کی فکر ہے، ان طرف سے ذرا سکون ہو تو دیکھنا۔ میں انہیں دیکھ ں گا۔ ایسا اندھیر ہوتا نہیں کہیں۔" میں نے بٹھل طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے مجھے کسی م کا نہیں......" میری آواز حلق میں گھٹ گئی۔

"ارے، ارے، سب ٹھیک ہو جائے گا، خدا پر وسا رکھو۔" ایمی، وہ غم گسار خاتون، سامنے کے نے سے اٹھ کے امڈتے ہوئے میرے پاس آگئی اور میرا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ایک ہمت والے نوجوان ہو، اور مرد...... مرد روتے نہیں۔ یہ کام تو ہمارا ہے۔ ہم عورتوں کا۔" وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور خود اس کی آواز چھلکنے لگی۔ میں سسکیاں بھرنے لگا۔

باقی رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ جیسے ہی سورج طلوع ہونے کے آثار ہوئے، ایمی کو بتائے بغیر میں کمرے سے نکل گیا اور سن گن لینے کے لیے راہ داری سے آگے چلا گیا۔ سارا اسپتال جاگ رہا تھا۔ صفائی کرنے والے خاک روب کو کمرے کی طرف بڑھتا دیکھ کے میں فوراً ہی واپس آگیا۔ خاک روب کو آج اپنے کام سے زیادہ رات ہونے والی واردات سے ایمی کو باخبر کرنے کی فکر تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پھیلی آنکھوں اور پھٹی پھٹی آواز میں ایمی کو بتایا کہ رات اسپتال میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ ان کے چہرے ڈھاٹوں سے چھپے ہوئے تھے۔ تعداد میں چار پانچ ہوں گے یا اس سے زیادہ۔ اسپتال کے عام دروازے سے داخل ہونے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ان خاص کمروں کے حصے پر تعینات بوڑھے دربان کو انہوں نے چند ضربوں سے ادھ موا کر دیا لیکن رات کی ڈیوٹی پر موجود اسپتال کے ملازمین میں سے کسی نے انہیں دیکھ کے شور مچایا اور تعاقب شروع کر دیا۔ کئی اور ملازم بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ ڈاکو پہلے تو ادھر ادھر چھپتے پھرے اور کوئی راستہ نہ دیکھ کے انہوں نے واپس ہو جانے میں عافیت سمجھی۔ وہ بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ انھونی نامی اسپتال کا ایک نوجوان ملازم تاک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اوٹ سے نکل کے کسی کے سر پر لاٹھی ماری اور اسے دبوچ لیا۔ ڈاکو نے اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ کے جان چھڑائی۔ زخمی انھونی نے آدھ گھنٹے میں دم توڑ دیا۔ ڈاکوؤں نے جس بوڑھے دربان [illegible]

اس کی حالت بھی نازک ہے۔ پولیس آچکی ہے اور تفتیش کررہی ہے۔

ایمی نے میری طرف دیکھا اور کچھ نہیں بولی۔ میرے اور ایمی کے لیے ناشتہ لانے اور کمرے میں تولیے چادریں وغیرہ بدلنے والے ملازمین نے بھی کم وبیش یہی روداد دہرائی۔ مبالغہ بہ تدریج نمو پاتا ہے۔ حاشیہ آرائی اور خلاقی کے لیے انہیں وقت ہی کتنا ملا تھا۔ شکر ہے، ان میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ، ان کے بہ قول ڈاکو، ہمارے کمرے کے دروازے پر آکے ٹھیرے تھے۔

مجھے شدت سے ڈاکٹر رائے کا انتظار تھا۔ وہ کسی قدر تاخیر سے آیا۔ اس کا چہرہ سلگ رہا تھا۔ میرے سلام کا جواب اس نے سر کی جنبش سے دیا اور کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی اس کے نزدیک جانے سے پہلو تہی کی۔ اس کے ساتھ دو اور ڈاکٹر تھے۔ ان تینوں اور ایمی نے بٹھل کے بستر کا محاصرہ کرلیا تھا۔ میں دور کھڑا دیکھتا رہا۔ انہوں نے خاصا وقت لیا پھر نرس کو ہدایات دے کے ڈاکٹر رائے میری جانب پلٹا۔ اس کے سامنے آجانے پر میرا جسم غیر ارادی طور پر تن گیا۔ ''کچھ بہتر علامتیں ہیں، شاید آپریشن کی ضرورت نہ پڑے۔'' اس نے بھاری آواز میں مژدہ سنایا اور کہنے لگا۔ ''لیکن اصل فیصلہ دوپہر رپورٹیں آنے پر کیا جائے گا۔''

پرسوں رات سے اب پہلی بار ڈاکٹر رائے کے منہ سے کوئی امید افزا بات سنی تھی۔ میرے ہونٹ کپکپانے لگے اور مجھ سے کچھ کہا نہ جاسکا۔

''رات وہ پولیس والے کیوں آئے تھے؟'' اس نے دھمکتی آواز میں پوچھا۔

''ایسے ہی بس...... کوئی خاص بات نہیں۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔ انہیں...... انہیں کچھ شبہ ہوگیا تھا۔'' میں نے بے تعلقی اور بے پروائی کا اظہار کیا۔

''کیسا شبہ؟'' وہ چونک کے بولا۔ ''کوئی اور بات تو نہیں۔''

''اور کیا بات ہوتی۔'' میں نے کسمسا کے کہا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا، میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔''

نرس ایمی بھی قریب کھڑی سن رہی تھی۔

''تمہیں معلوم ہے، رات اسپتال میں کیا ہوا؟'' ڈاکٹر بگڑے تیوروں سے بولا۔

''سنا تو ہے کچھ......'' میں نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

''یہاں پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

''جواب تک نہ ہوسکا، ضروری تو نہیں کہ آئندہ بھی نہ ہو۔'' میں نے بدبداتے ہوئے کہا۔

''یہ بہت سنگین معاملہ ہے۔'' ڈاکٹر رائے چبھتی آواز میں بولا۔ ''پولیس آگئی ہے۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔ تم سے دوپہر کو بات ہوگی۔'' چلتے چلتے وہ رک گیا۔ اس نے ساتھ کھڑے ہوئے معاون ڈاکٹروں کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ نرس ایمی کے دور ہوجانے کے بعد وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ''اگر وہ ڈاکو تھے تو اسپتال میں ان کا کیا کام۔ یہاں سے انہیں کیا مل سکتا تھا؟''

''ہاں۔ لیکن، ممکن ہے، انہیں کسی آدمی کی تلاش ہو۔'' میرے منہ سے نکل گیا۔

''آدمی؟'' وہ اچک کے بولا ''آدمی کی کیوں؟''

''آپ کہہ رہے ہیں نا......'' میں نے اپنی زبان کی لغزش کی تلافی کرنا چاہی۔ ''انہیں یہاں روپیا پیسا تو نہیں مل سکتا تھا۔''

وہ کھوسا گیا پھر جھنجھلاتی آواز میں بولا ''تمہارے پاس کوئی بڑی رقم یا کوئی اور قیمتی چیز تو نہیں؟''

میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ''تھوڑی بہت تو ہے۔''

''کل دوپہر تم کہاں کہاں گئے تھے؟''

''پہلے گرانڈ ہوٹل پھر تار دینے کے لیے بڑے ڈاک خانے۔'' میں نے ہچکچا کے کہا۔ بعد کی

مصروفیات کا میں اسے کیا بتاتا۔

''کہیں اور تو نہیں۔ یاد کرو، تم یہاں بہت دیر سے آئے تھے، غالباً شام کے وقت؟''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''مطلب ہے، کہیں تم نے کسی سے اپنے پاس موجود رقم کا ذکر تو نہیں کیا۔ ذرا سوچو، کس کس سے ملے تھے تم؟''

''کسی سے نہیں لیکن...... لیکن ہاں۔ میں نے احتیاطاً ایک معقول رقم ہوٹل میں جمع کرائی تھی۔ یہ رقم بھائی کے کپڑے بدلتے وقت ان کی جیب سے نکلی تھی۔ سفر میں عموماً بھائی اچھی رقم ساتھ لے کے چلتے ہیں۔''

''ہوٹل والوں نے تمہیں کوئی رسید دی تھی؟''

''جی، جی ہاں۔'' میں نے جیب ٹٹولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ رقم ہوٹل میں ہے تو پھر......'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟'' میں نے تذبذب سے پوچھا۔

''تم کہتے ہو، تمہیں اس شہر میں کوئی نہیں جانتا۔''

''جی ہاں، بس کل اتفاقاً ایک صاحب سے ملاقات ہوگئی تھی۔ ان کا نام اکبر علی خاں ہے۔ وکیل ہیں اور یہاں کسی کالج میں قانون پڑھاتے ہیں۔ وہ نہایت عمدہ آدمی ہیں۔ شاید آتے ہوں ابھی۔ رات بھی آئے تھے، گھر سے کھانا لے کے۔ پولیس والوں سے رات ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔'' مجھے یاد آیا، کل شام ڈاکٹر رائے بٹھل کو دیکھنے آیا تھا تو اکبر علی خاں موجود تھے۔ میں نے کہا۔ ''وہی صاحب جو کل شام کمرے میں میرے ساتھ تھے۔ شاید آپ بھول گئے۔''

''رات کو جو پولیس والے آئے تھے، تمہیں یقین ہے وہ پولیس والے ہی تھے؟''

''انہوں نے شناخت نامے دکھائے تھے۔''

''تم نے دیکھے تھے؟''

''نہیں، انہوں نے جیب سے نکالے تو میں مطمئن ہوگیا۔''

''دیکھے نہیں۔''

''ہاں، دیکھے تو نہیں مگر آپ......؟''

''وہ کوئی اور بھی ہوسکتے ہیں، بہروپیے۔'' میری وضاحت سے پہلے اس نے قیاس آرائی کی۔ ''تاڑ بھاڑ لینے آئے ہوں، ہوسکتا ہے بعد کو رات گئے آنے والوں کا ان سے کوئی تعلق ہو۔''

میں نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ میرے لیے چپ ہوجانا ہی بہتر تھا۔ تائید سے مراد یہ تھی کہ جس نہج پر ڈاکٹر رائے سوچ رہا ہے، میں اسے مہمیز کروں۔ تردید کے لیے ایک حجت لازم ہوجاتی۔ مجھے حیرت تھی، اس نے کسی طرح تال میل پیدا کرلیا کہ رات کو آنے والے کہیں میری جستجو میں نہ آئے ہوں۔ ڈاکٹر رائے کو تو پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس کے ہونٹ پھیل گئے۔ ''دیکھتے ہیں۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میں لپک کے چند قدم کے فاصلے پر موجود ایمی کے پاس پہنچا اور اس سے ممنونیت کا اظہار کرنا چاہا لیکن وہ بکھری بکھری سی نظر آرہی تھی۔ مجھے شک ہوا، رات دروازے پر دستک دینے والے حملہ آوروں کے بارے میں اپنے دیرینہ رفیق کار ڈاکٹر رائے کو بے خبر رکھنے کے تاسف اور ندامت سے زیر بار نہ ہو۔ مجھے کچھ پوچھتے ہوئے جھجک ہوئی۔ ''اب پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔'' میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا۔ ''تم نے سن لیا سسٹر! ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بھائی کی حالت میں بہتری نظر آرہی ہے۔ اور، اور شاید آپریشن کی ضرورت نہ پڑے۔''

میری کوشش کارگر ہوئی۔ ایمی کا بجھا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ ''ہاں، وہ پرامید نظر آرہے تھے۔''

''تم سے بھی کچھ کہا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''ڈاکٹر رائے قبل از وقت بڑی بات نہیں کرتے۔''

''اب تک انہوں نے ایک لفظ اطمینان کا نہیں کہا تھا۔ تمہیں کیا بتاؤں سسٹر! ڈاکٹر صاحب کی زبانی اتنا سننے کے لیے مجھ پر کیا عالم گزر رہے ہیں۔''

''بس اب ساری دھند چھٹ جائے گی، ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی، دیکھنا۔''

میری آواز میرے قابو میں نہیں رہی۔ میں نے تیزی سے ایمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور سینے سے لگا کے کہا۔ ''تم نے بہت احسان کیا ہے مجھ پر۔ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔''

''تم آدھے پاگل ہو۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''تم منع نہیں کرتے تو بھی میں سوچ سمجھ کے زبان کھولتی اور دیکھو...... یہ شکریہ اب مت ادا کرنا...... یہ اتفاق ہے کہ اسپتال کا کوئی آدمی ان لوگوں کو ہمارے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے نہ دیکھ سکا ورنہ میری خاموشی سے بھی کیا ہوتا۔''

میں نے کئی بار اس کا ہاتھ چوما، آنکھوں سے لگایا۔ مجھے اپنا وجود اب بہت ہلکا ہلکا سا لگ رہا تھا۔

نرس سیورین کے آجانے پر مجھے دعائیں دیتی ہوئی ایمی رخصت ہوگئی۔ اس دوران میں تین چار مرتبہ بٹھل کے بستر کی جانب گیا اور ہر مرتبہ اس کی بے آرامی کے خیال سے میں نے اسے آواز نہیں دی۔

ٹھیک گیارہ بجے اکبر علی خاں آگئے۔ میں نے سب سے پہلے انہیں یہی نوید سنائی کہ ڈاکٹر رائے نے صبح کے معائنے میں بٹھل کے لیے کیا کہا ہے۔ ان کی آنکھیں بھی چمکنے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ رات یہاں سے جاتے ہی انہوں نے کلکتے تار دے دیا تھا، ارجنٹ تار۔ عملے سے مستعدی کی درخوا[ست] بھی کر دی تھی پھر صبح احتیاطاً یہاں آنے سے ایک اور تار روانہ کر دیا ہے۔

سیورین کمرے میں تھی۔ میں اکبر علی خاں ک[و] داری میں لے آیا اور میں نے رات کا سارا و[اقعہ] انہیں سنایا تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ انہیں یقین ہی [نہیں] آرہا تھا کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ پھر میں نے ڈاکٹر رائے کے بارے میں انہیں بتایا کہ صبح کے سوال و جواب کی ایک آزمائش سے میں [کس] طرح گزرا ہوں۔ ڈاکٹر رائے پھر اس امکا[ن] اٹک گیا کہ رات آنے والے پولیس افسر اور کے بعد آنے والے حملہ آوروں میں کوئی تعلق ہوسکتا ہے۔

یہ سن کے اکبر علی خاں گم سم سے ہو گئے۔ بہر حال ایک وکیل تھے۔ نکتہ چینی روز و شب کا [کام] تھی۔ کہنے لگے۔ ''میاں! آپ کہہ رہے ہیں رات کے حیران کن واقعے کی تفتیش کے لیے صبح پولیس اسپتال آئی ہوئی ہے۔ فرض کیجیے، ڈ[اکٹر] رائے نے اپنے اس شبہے کا ذکر پولیس سے کر[دیا تو] پولیس تو آپ کی طرف بھی آسکتی ہے۔ پھر آپ[...] ہیں گے ان سے، رات آپ سے ملاقات کر[نے] والے پولیس افسر کون تھے؟''

مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ بن پڑا۔ میں تو [...] علی خاں کی صورت دیکھا کیا...... اس نکتے پر [...] نے سوچا ہی نہ تھا۔ بے شک ڈاکٹر رائے کو اپ[...] میں موجود تفتیش کاروں سے یہ کہنے میں کیا عا[ر] کہ گزشتہ رات اس کے زیر علاج، شہر میں ا[...] ایک مریض کے تیماردار بھائی کے پاس توقع [کے] خلاف دو پولیس افسر آئے تھے۔ اسپتال [میں] دھرنا دیے ہوئے پولیس والے رات کے وا[قعے] کے اندھیرے میں کسی کرن کی امید میں میر[ے] پاس آسکتے ہیں۔ پھر میں ان سے کیا کہوں گا[...] بتاؤں گا کہ ان کے نام کیا تھے، حلیے کیسے تھے ا[ور]

کا مقصد کیا تھا۔ یہ مسلسل کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ کیسا یہ جنجال ہے۔ ایک عذاب ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے جو مجھ سے جواب طلبی کی جارہی ہے۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے پولیس والوں کو سچ بتا دیا کہ رات کو ان کے ہم پیشہ، میدا استاد کے سلسلے میں آئے تھے تو میرا یہ اعتراف ڈاکٹر رائے تک منتقل ہو جائے گا۔

وہ مجھ پر دروغ گوئی کے الزامات عائد کرے گا۔ میری تو ہر بات اسے الٹی نظر آئے گی۔ نرس ایمی کی طرح، گزشتہ روز کی ساری روداد اسے سنا دیتا ہوں تو اس کا خلاق دماغ کیا کیا قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ بات پھر بہت دور جا سکتی ہے، فیض آباد، کلکتے، جانے کہاں کہاں۔

''کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا میاں۔'' اکبر علی خاں مجھ سے زیادہ فکر مند لگ رہے تھے۔ ''آپ کہیں کہ آپ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ رات آنے والے دو آدمی، جیسا کہ ان کا دعوا تھا، پولیس افسر ہی تھے۔ آپ کہیں کہ انہیں آپ کی شکل سے کوئی دھوکا ہو گیا تھا۔ بات صاف ہوگئی تو وہ معذرت کر کے چلے گئے، کچھ ایسی ہی ملھم انداز میں بات کرنا ہوگی۔''

''ظاہر ہے، بات تو بنانا ہی پڑے گی۔'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''آپ کی کوشش ہونی چاہیے کہ پولیس تفتیش کے دوران ڈاکٹر رائے موجود نہ ہوں۔''

''میری کوشش سے کیا ہوسکتا ہے۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔ ''میرا بس تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔''

اکبر علی خاں مجھے حوصلے کی تعلیم دینے لگے۔ حالاں کہ سر دست خود انہیں اس کی بڑی ضرورت تھی۔ میں نے چڑ کے کہا۔ ''ٹھیک ہے جو ہونے والا ہے، اس پر میرا اختیار ہے نہ آپ کا۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا، اور زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ رات آنے والے لوگ کس ارادے سے آئے تھے، کامیاب بھی ہوسکتے تھے۔ اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے۔''

''تو یہ کیجیے میاں۔ میں تو تصور بھی نہیں کرسکتا کہ وہ اتنا آگے جاسکتے ہیں۔ آپ ہی کہہ رہے تھے کہ یہ اڈے ٹھکانے والے ایسے بدعہد نہیں ہوتے۔ اب دیکھ لیا آپ نے۔''

''مجھے اب بھی یقین نہیں کہ انہیں میدا نے بھیجا تھا۔''

''پھر کس نے...... کون بھیج سکتا ہے انہیں اتنے بڑے اقدام پر...... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' اکبر علی خاں کی آواز کھنچ گئی۔

''وہ مرنے والے دھنوا کے قریبی ساتھی بھی ہوسکتے ہیں۔ میدا اپنے اڈے کے لوگوں کو باندھے رکھنے میں ناکام رہا ہے شاید۔ آپ کو یاد ہوگا، میں نے میدا کے اڈے پر کہا تھا کہ اڈے کے استاد کو اپنے آخری آدمی تک نگاہ رکھنی پڑتی ہے...... یا پھر وہ لوگ بھی ہوسکتے ہیں جو میدا استاد سے بڑی محبت وعقیدت رکھتے ہوں اور انہیں شبہ ہو کہ میدا سے اپنا چاقو واپس لینے کسی وقت بھی میں اڈے آسکتا ہوں۔ نتیجے میں ان کا محبوب استاد چوکی پر شاید قائم نہ رہ سکے۔ ایسے لوگ میدا کی محبت میں اسے بتائے بغیر میری طرف آسکتے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اکبر علی خاں کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ ''میرا جرائم پیشہ لوگوں سے بہت واسطہ رہا ہے لیکن اس قماش کے لوگوں سے کچھ کم بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ آپ کا یقین بھی بے سبب نہیں ہوگا۔ بہر حال اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ وہ کوئی بھی ہوں، میدا کے اشارے پر آئے ہوں یا اسے لاعلم رکھ کے۔ میں تو سوچتا ہوں...... خدانخواستہ......'' اکبر علی خاں کہتے کہتے رہ گئے۔ انہوں نے آنکھیں بھینچ لیں۔

"زندگی محض حادثہ ہے۔" میں نے کہا۔ "زندگی تو ہروقت، ہر لمحے کسی نہ کسی افتاد، کسی ناگہانی کی زد پر رہتی ہے، موت ایک مستقل حقیقت ہے۔ انسانی جسم کے ہزاروں کل پرزوں میں کوئی بھی کسی لمحے مشین کی طرح خاک ہوسکتا ہے اور یہ نہ ہو پائے تو آسمان سے بجلی گر جاتی ہے، چھت ڈھے جاتی ہے، زلزلہ آجاتا ہے۔ زندگی سے موت کا فاصلہ بس لمحے بھر کا ہے، کبھی یہ لمحہ طویل ہوجاتا ہے، کبھی بہت مختصر۔ زندگی ایک عجوبہ ہے۔ اتنی بلاؤں، آفتوں، اتنی دشمنیوں اور اتنی پیچیدگیوں کے باوجود آدمی بچا رہتا ہے تو ایک کرشمہ ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی دشمن موت ہے اور فتح ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے۔" میرے منہ میں جو آیا، کہتا گیا۔

اکبر علی خاں پلکیں جھپکائے بغیر سنتے رہے۔ میں چپ ہوا تو کہنے لگے۔ "آپ خاموش کیوں ہوگئے میاں! کبھی لگتا ہے، آپ نے بہت پختہ کاروں سے زیادہ زندگی برتی ہے اور معاف کیجیے، کبھی لگتا ہے، کوئی معصوم بچے ہیں آپ، جس نے ابھی کچھ دیکھا اور سمجھا ہی نہیں۔"

میں کیا تبصرہ کرتا۔ انہیں کیا بتاتا کہ گھر سے نکلنے کے بعد اب تک کتنی بار موت کندھا چھو کے گزر گئی ہے۔ میں زندہ ہوں، میں زندہ رہا ہوں، یہ محض ایک حادثہ ہے۔

میرے ہذیان سے اکبر علی خاں کی کسی قدر تشفی ہوئی۔ میں نے کہا۔ "آخری واقعہ تو موت ہے جناب! اس سے آگے، اس سے زیادہ کیا؟ اس سے زیادہ آدمی کی آزمائش کیا ہوسکتی ہے۔ اور آدمی موت کے لیے جس قدر آمادہ رہے، موت کی ہیبت اور اس کے مرحلے کی اذیت اتنی ہی کم ہوجاتی ہے۔ اصل میں آدمی تنہا ہو تو موت سے ایسا خوف زدہ بھی نہ ہو مگر آدمی تنہا کہاں ہوتا ہے۔ کوئی آدمی بھی تنہا نہیں ہوتا۔ جسمی تنہائی تو ایک گمان ہے۔ آدمی بہ ظاہر کتنا ہی تنہا ہو، اس کے پرسان حال، اس کے دوست، دشمن، اس کے حبیب اور اس کے رقیب جو اس کی نس نس سے پیوست ہوتے ہیں۔ وہ ساتھ نہ ہوتے ہوئے بھی ہروقت ساتھ رہتے ہیں۔ کوئی کسی کا رگ جاں نہ ہو، کوئی کسی کے جسم اور روح کا جزو نہ ہو...... سینے میں کوئی جتنا کھبا ہوتا ہے، موت اتنی ہی گراں بار ہوتی ہے۔ آدمی، دوسروں کے لیے بھی اپنی بقا کا خواہاں ہوتا ہے۔"

میں نے شاید کچھ زیادہ ہی یاوہ گوئی کردی تھی۔ اکبر علی خاں کچھ نہیں بولے۔ ان کی خاموشی سے مجھے پشیمانی ہوئی۔ وہ میرے مخاطب تھے لیکن میں بھی تو اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ آدمی خود کو بھی کچھ باور کرانا چاہتا ہے۔ اپنی تسلی کے لیے خود مجھے کسی توجیہہ و توضیح کی بڑی ضرورت تھی۔

"ہے نا کچھ ایسا ہی؟" میں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ان کی تائید چاہی۔

"ہاں میاں!" وہ گہری سانس لے کے بولے۔ "کچھ ایسا ہے لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ یہ زندگی بڑی ضدی ہے۔ انجام معلوم ہونے کے باوجود اپنے ہونے پر اصرار کرتی رہتی ہے۔ ٹوٹتی ہوئی سانسوں میں اپنی فتح کی امید سے کنارہ کش نہیں ہوتی۔ اسے ڈھٹائی کہیے یا کچھ اور۔ ہر شخص ختم ہوجاتا ہے مگر کوئی ایسا نہیں چاہتا۔ چیونٹی بھی اپنی سلامتی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی نظر آتی ہے۔ قدرت کا عجیب نظام ہے بھائی۔ موت یقینی بھی... ہے اور زندگی کی حرص اور ہوس بھی خوب ودیعت کی ہے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔

"معلوم نہیں، یہ کیا ہے اور کیوں ہے۔" میری آواز ڈھلکی ہوئی تھی۔ بے خبری میں ایسی ہی ناتوانی ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔ "ہر جان دار موت کے تجربے کے بغیر موت سے کیوں گریزاں رہتا ہے۔ شاید اس لیے کہ موت سب سے بڑا اندھیرا ہے۔ اسے اس اندھیرے میں اپنی بے چارگی، حبس، دم گھٹنے اور چھوٹے موٹے حادثوں کے تجربے تو

مسلسل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اسے شبہ ہے کہ موت کے بعد احساس کی بھی موت ہوجاتی ہے، جسم ختم ہوجانے کے بعد روح بھی موجود نہیں رہتی۔ اسے بتایا گیا ہے کہ جسم کے ساتھ روح نہیں مرتی۔ روح باقی ہے تو احساس باقی ہے۔ کچھ تو ہے کہ ہر ذی نفس موت سے ہیبت زدہ رہتا ہے۔"

ہم راہ داری میں یہاں سے وہاں تک گھومتے رہے پھر چلتے چلتے راہ داری کے اس حصے میں آگئے جہاں سے عام اسپتال کا راستہ نکلتا تھا۔ اسپتال کے عملے کی چہل پہل رفتہ رفتہ بڑھتی دیکھ کے ہمیں حیرت ہوئی۔ ہم اور آگے چلے آئے۔ مرکزی عمارت کے سامنے پھیلے سبزہ زار میں بہت سے لوگ یا تو بیٹھے یا کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ اکبر علی خاں نے ایک ملازم کو روک لیا اور اس سے اس اجتماع کا سبب معلوم کیا۔ درمیانی عمر کے اس شخص نے دل دوز آواز میں بتایا کہ انتھونی کا تابوت اٹھایا جانے والا ہے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ انتھونی اسپتال کے عملے کے اقامتی حصے میں رہتا تھا۔ چند مہینے پہلے اس کے بوڑھے باپ کی موت کے بعد اسے اسپتال میں ملازمت دی گئی تھی۔ باپ نے مرنے سے دو تین ماہ پہلے اپنی بساط سے بڑھ کے اس کی شادی کی تھی۔ بہو ایسی جنم جلی آئی کہ چند مہینوں کے لوٹ پھیر میں پہلے سسر گیا پھر شوہر۔ وہ بتا رہا تھا کہ انتھونی کی بیوی امید سے ہے۔ اب بچہ بھی بچے کہ نہیں۔ صبح سے وہ پچھاڑیں کھا رہی تھی، اب سکتے میں پڑی ہے۔ انتھونی گھر میں سب سے بڑا تھا اور دو چھوٹی بہنوں، ایک چھوٹے بھائی کا کفیل تھا۔ بڑا پھرتیلا اور جوشیلا، فرض شناس اور سعادت مند نوجوان تھا۔ ادھیڑ عمر آدمی رو پڑا۔ انتھونی کے باپ سے اس کی قدیم رفاقت تھی۔ اس کے بہ قول، انتھونی اسے اپنے بچوں کی طرح عزیز تھا۔ ہم دیکھتے رہ گئے۔ اسے انتھونی کی تدفین میں شرکت کی جلدی تھی۔ وہ آنسو پونچھتا ہوا چلا گیا۔

ہم موت اور زندگی ہی پر نوک جھوک کر رہے تھے۔ اکبر علی خاں اسپتال کے ادھیڑ عمر ملازم سے یہ سب کچھ سن کے دل گرفتہ ہوگئے۔ میں نے ان سے پوچھنا چاہا کہ انتھونی کی موت کا ذمے دار کون ہے۔ اس کی بدبخت بیوی، میدا، میں یا بٹھل، یا ٹرین کا حادثہ جس کی وجہ سے ہمیں پٹنا آنا پڑا؟ اکبر علی خاں جواب دیتے بھی تو کیا۔ اس لیے میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ موت کے کیسے بہانے ہوجاتے ہیں۔ یہ انتھونی بیچ میں کیسے آگیا۔ بمبئی میں ایک موٹر کے کل پرزے اچانک خراب ہوگئے۔ بھنڈی بازار میں موٹر روکے نہ رکی۔ فٹ پیری پر چڑھ گئی۔ وہاں چند بچے کھیل رہے تھے۔ تین ختم، چار پانچ زخمی ہوگئے۔ ان بچوں کا کیا قصور تھا۔ انہیں تو گناہ کا شعور بھی نہیں تھا۔ انہوں نے تو زندگی کی ابتدا ہی کی تھی۔ بس ایسے ہی موت کس وقت کسی کو بھی چن لیتی ہے اور کچھ نہیں دیکھتی کہ مرنے والے پر انحصار کرنے والے کتنے لوگ زندہ درگور ہوجائیں گے اور انحصار کرنے والے نہ ہوں تو لوگ ایک دوسرے سے محبت بھی تو کرتے ہیں، ایک دوسرے کے عادی ہوجاتے ہیں۔ میرے پاس بہت پیسے تھے۔ جی کرتا تھا، ابھی جا کے انتھونی کی بیوہ کو کچھ دوں لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اگرچہ اسی وقت تو اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ سب سے بڑا سہارا تو مال وزر کا ہوتا ہے۔ اکبر کی موت کا جہاں گیر کو ایسا صدمہ نہیں ہوا ہوگا۔

ہم پھر راہ داری میں آگئے۔ سیورین کمرے کے باہر کھڑی ہماری منتظر تھی۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ اکبر علی خاں آئے ہیں۔ ان سے کچھ چائے پانی کے لیے پوچھنا چاہیے۔ سیورین نے چائے منگوالی تھی۔ کمرے میں واپس آکے سبھی کچھ منتشر ہوگیا اور اچھا ہی ہوا۔ ہم دونوں جانے کس سمت بھٹک گئے تھے۔ یہ تو بڑی ان جان سمتیں ہیں۔ آدمی کب سے

اپنے آپ کو جاننے کی جستجو میں ہے۔ در ختم ہی نہیں ہوتے۔ سات در کے بعد خزانہ مل جاتا ہے۔ زندگی کے اسرار ورموز کون سے در میں چھپے ہوئے ہیں۔ آدمی در کے بعد در سر کرتا چلا جا رہا ہے اور اس کی حیرت کم نہیں ہوتی، بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

سیورین نے چائے کے برتن سلیقے سے میز پر رکھے اور ہم سے دودھ اور چینی کی مقدار پوچھ کے چائے بنائی۔ اکبر علی خاں ٹھیک ہی کہتے تھے۔ موت کتنی ہی اٹل ہو، زندگی کی ہٹ دھرمی اپنی جگہ ہے۔ زندگی موجود ہے تو آخری لمحے تک خوش فعلیاں، خوش گمانیاں جاری رہتی ہیں۔ موت فراموش کرتے رہنا ہی زندگی ہے۔ موت اور زندگی کی آنکھ مچولی میں زندگی جیت بھی تو جاتی ہے، جیتتی رہتی ہے۔ زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی جیتوں پر موت شاید ہنستی ہے۔ زندگی کو معلوم نہیں ہوتا کہ موت اسے ڈھیل دیتی ہے، اس سے کھلواڑ کرتی رہتی ہے اور کسی ایک دن پتنگ کاٹ دیتی ہے، کسی ایک دن پنجے میں بری طرح دبوچ لیتی ہے۔ یہی اس کا شیوہ ہے۔ ایک دن ضرور اس کا ہوتا ہے اور جو دن اس کے نہیں ہوتے، وہ بھی کچھ اس کی چشم پوشی، درگزری کے سبب سے۔

دوپہر تک پولیس کا کوئی آدمی نہیں آیا۔ بٹھل کی بیماری کے دوران پولیس کی تفتیش سے مجھ حواس باختہ کی وحشت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ کچھ یہی سوچ کے شاید ڈاکٹر رائے نے اپنا شبہ خود تک محدود رکھا ہو اور پولیس کو پہلے اپنے طور پر چھان بین کا موقع دیا ہو۔

ایک بجا ہی چاہتا تھا۔ اکبر علی خاں کا ملازم بڑا سا ٹفن لے کے آ گیا۔ ان سے کچھ کہنا کہ اس تکلف کا یہ محل ہے نہ اس کی ضرورت ہے، فضول تھا۔ گزشتہ رات کی طرح بھوک نہ ہونے کے باوجود میں نے رسم نبھائی۔ ہمارے اصرار پر سیورین بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے ایسے خوش ذائقہ کھانے شاید پہلی بار کھائے تھے، مسلسل تعریفیں کرتی رہی۔ اسے کھاتے دیکھ کے بے اختیار مجھے زریں اور فروزاں کی یاد آئی۔ وہ بھی کچھ اسی انداز سے کھانا کھاتی تھیں۔ کھانا پکانا ہی نہیں، کھانا کھانا بھی ایک ہنر ہے۔ نازک اندامی کو نازک خیالی اور نازک اطواری بھی لازم ہے۔ قدرت نے ایسا ریشم، ایسا پھول، اتنا سجل اور ترشا ہوا بنایا ہو تو دیگر شایستہ، نرم ولطیف حرکات وسکنات سے کیا مطابقت ہو جاتی ہے۔ غالباً تبھی تکمیل ہوتی ہے۔ کہتے ہیں، کسی شخص کے میزان کے لیے دسترخوان اور سفر سب سے کھری کسوٹی ہوتی ہیں۔ کلیے تو یوں بے شمار ہیں لیکن کلیوں پر زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔ ایک جیسے آدمی کبھی کبھی ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

کھانا کھاتے ہی اکبر علی خاں ٹفن لانے والے ملازم کو ساتھ لے کے رخصت ہو گئے۔ میں انہیں اسپتال کے مرکزی دروازے تک پہنچانے گیا۔ راستے میں انہوں نے بتایا کہ ان کی والدہ کی طبیعت سنبھلی نہیں ہے۔ ماں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آواز سوز وگداز سے مغلوب ہو جاتی تھی۔ میں نے کہا کہ والدہ کے پاس رہنے کی ضرورت سمجھیں تو شام کو یہاں آنے کی زحمت کیوں کریں اور براہ مہربانی یہ کھانے وغیرہ کا تکلف نہ کریں تو بہتر ہوگا۔ وہ مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگے اور بولے۔ ”زحمت کیسی برادرم۔ خدارا ایسی اجنبیت نہ برتیں۔ آپ کو معلوم ہے، خدا گواہ ہے، لگتا ہے، کوئی بچھڑا ہوا مل گیا ہے۔“

میں ان سے نہ کہہ سکا کہ میرا بھی کچھ یہی حال ہے۔ وہ یہاں آتے ہیں تو ڈھارس سی بندھ جاتی ہے۔ اس شہر میں کوئی ہے اپنا۔ وہ چلے جاتے ہیں تو دل گھبرانے لگتا ہے۔

انہیں رخصت کر کے واپس کمرے میں پہنچا تو بٹھل کے بستر کے اطراف ڈاکٹروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی، ڈاکٹر رائے اور کئی ڈاکٹر۔ ان میں گورا ڈاکٹر بھی تھا۔ سیورین بھی ان کے ساتھ مصروف تھی۔ میرے آنے کی آہٹ کسی کو نہ ہوئی۔ ان کے منتشر ہو جانے کے خیال سے کچھ دیر تو میں وہیں دروازے کے نزدیک کھڑا رہا۔ بٹھل پر ان لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ مجھ سے یہ دیکھا نہیں جاتا تھا اس لیے میں باہر چلا آیا۔ انہوں نے بہت دیر لگائی۔ کھڑے کھڑے پاؤں اکڑنے لگے۔ دماغ ہی پراگندہ ہو تو دل کیا، آنکھیں کیا اور پاؤں کیا، سبھی بے جان ہیں۔ یہ جسم تو دیکھنے کا ہے۔ وہی بات ہے، آدمی تو بس دماغ ہے، حاکم مطلق۔ باقی سارا جسم تو اس کا محکوم ہے۔ جتنی دیر ہو رہی تھی، میرا دل ڈوبا جاتا تھا دماغ ڈوبا جاتا تھا۔

اندر سے ڈاکٹر رائے کی آواز آئی تو میں نے جھانک کے کمرے میں دیکھا، ڈاکٹر بٹھل کے پاس سے ہٹ گئے تھے۔ میں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ ”اوہ میرے ناراض نوجوان دوست!“ ڈاکٹر رائے نے لہکتے ہوئے مجھے پکارا۔ ”کہاں ہو تم؟“

”میں...... میں یہیں تھا، باہر۔“ میری آواز بہکنے لگی۔

”تمہارے لیے ایک اچھی خبر! ہمارے معزز مہمان ڈاکٹر فرینکی نے ساری رپورٹیں دیکھ لی ہیں۔“ اس نے ستایش آمیز انداز میں پہلو میں کھڑے گورے ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ”شکر کرو کہ صرف اوپر کی جلد متاثر ہوئی ہے۔ وہیں سوجن ہے اور سر کھولنے کی ضرورت نہیں۔“

میں تو سن ہو گیا۔ اپنی سماعت پر مجھے شبہ ہوا اور میری دریدہ آنکھوں میں دریا امڈ آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں، کس طور ڈاکٹر رائے سے شکر گزاری کروں۔

”تمہارا بھائی دوائیں رد نہیں کر رہا۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔“ گورے ڈاکٹر نے سنجیدگی سے ڈاکٹر رائے کی تائید کی۔ ”یہ سر کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے نوجوان!“

میں نے مضطربانہ سر ہلایا۔

”اور سنو!“ ڈاکٹر رائے نے مجھے متنبہ کیا۔ ”بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ سرجری سے جلد نتائج برآمد ہو جاتے ہیں اور جلد نتائج کے لیے سرجری نہیں کی جاتی تاوقتیکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، سمجھے۔“

”جی، جی ہاں۔“ میں نے بدحواسی سے کہا۔

”مریض کے بارے میں نہیں معلوم لیکن اس کا یہ چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی میں خود سے زیادہ شامل ہے۔“ میرا بازو تھام کے ڈاکٹر رائے نے گورے ڈاکٹر سے کہا۔

”اور اسی لیے میں کہتا ہوں، مشرق میں آدمی موجود ہے۔ مغرب میں تو کہیں کھو گیا ہے۔“ ڈاکٹر فرینکی نے پر تمکنت تپاک سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ”تم سے مل کے خوشی ہوئی۔“

میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ جکڑ لیا۔

”امید ہے، جلد ہی تم اپنے محبوب بھائی کو صحت یاب دیکھ سکو گے۔“ گوروں کے مزاج اور لہجے کی طرح ڈاکٹر فرینکی کی مسکراہٹ بھی محتاط تھی۔

اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میری آواز بھر آئی۔

”شام کو ملیں گے۔“ ڈاکٹر رائے منمنا کے بولا اور اس نے ہاتھ پھیلا کے گورے ڈاکٹر کو چلنے کا اشارہ کیا پھر یکایک رک کے مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”پولیس تو نہیں آئی یہاں؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“ میرے شانے سیدھے ہو گئے۔ ”کیوں؟“

”آسکتی ہے کسی وقت۔ ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں وہ۔ یہ جاننے کے لیے کہ رات آنے والے اسپتال میں زیر علاج مریض یا اس کے کسی نگہ دار کی کھوج میں تو نہیں تھے۔“

”آ جانے دیجیے۔“ میں نے بے نیازی ظاہر کی۔

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ میری کیسی

رائے سے وہ منتشر ہو سکتے تھے۔ اچھا ہے، وہ خود ہی ہاتھ پاؤں ماریں...... دیکھتے ہیں بہرحال......''
مبہم انداز میں یہ کہتا ہوا ڈاکٹر رائے اپنے ساتھی ڈاکٹروں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا تھا کہ ان سے معذرت کر کے پھر دروازے کی طرف پلٹا اور سرگوشی میں اس نے مجھے مشورہ دیا۔ ''میں سمجھتا ہوں، گزشتہ رات غلط فہمی میں آنے والے پولیس افسران کا ذکر تم بھی ان سے کیوں کرو۔ یقین سے کچھ کہا بھی تو نہیں جا سکتا، کون تھے وہ۔''
میرے کوئی جواب دینے سے پہلے وہ مجھ سے دور ہو گیا۔
میں نے بہ ظاہر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اسے جلدی تھی۔ اس نے مجھے موقع بھی نہیں دیا۔ اس کے جانے کے بعد دیر تک میں طرح طرح کے واہموں میں گھرا گم کھڑا رہا اور جیسے کسی نے مجھے ٹوکا۔ اس مشفق ڈاکٹر نے ایک اور بات بھی تو کہی ہے۔ جس کے آگے تمام دور دراز اندیشے ثانوی ہیں۔ دوسرے لمحے میرے پاؤں بٹھل کے بستر کی جانب اٹھ پڑے۔ بٹھل کے چہرے پر سکون کے آثار تھے۔ میں نے بہت دھیمی آواز میں اسے پکارا۔ اس کی پیشانی تنگ اور پلکوں میں جنبش ہوئی۔ ادھر سیورین نے آہستگی سے میرا شانہ تھپک کے مجھے منع کیا۔ مجھے اس کی مداخلت بہت بری لگی اور میں پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ کوئی اور سامنے ہوتا تو شاید میں اس سے جھگڑ پڑتا مگر وہ سیورین تھی، شاخ گل کے مانند، ذرا تیز آواز میں بات کرتے ہوئے ڈر لگے، شاخ ٹوٹ نہ جائے، پھول کمھلا نہ جائے۔
وہاں سے ہٹ کے میں صوفے پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد اپنے کاموں سے نمٹ کے وہ بھی میرے پاس آ کے بیٹھ گئی۔ لمحوں تک چپ رہی پھر ہمک کے بولی۔ ''آج تو آپ سے کوئی بات ہی نہیں ہو پائی۔''
میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس شیشہ احساس نے یہ رعایت غنیمت جانی، پہلو بدل کے دل گیر لہجے میں بولی۔ ''کل رات اسپتال میں یہ کیا ہو گیا۔ انتھونی بے چارہ مارا گیا۔''
''تم جانتی تھیں اسے؟'' میں نے پوچھا۔
''اسپتال میں سبھی اسے جانتے تھے۔'' اس نے یاس بھری آواز میں بتایا۔ کل رات ہی تو ملا تھا۔ ڈیوٹی ختم کر کے جا رہی تھی کہ آمنا سامنا ہو گیا۔ بہت منع کیا، نہیں مانا، بڑے دروازے تک مجھے پہنچانے گیا۔ بڑا دل چسپ، زندہ دل نوجوان تھا وہ۔ میری اس کی اچھی دوستی تھی، یوں یہاں وہ سبھی کا دوست تھا۔ ہر کسی کے کام کے لیے تیار، ہر وقت ہنستا، مسکراتا رہتا۔ کل رات وہ اتنا ہی زندہ تھا جتنا کوئی صحت مند اور خوش باش شخص ہو سکتا ہے...... ایک رات میں یہ کیا ہو گیا؟''
''ایک رات کیا، دوسرے پل کی خبر نہیں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''بس یہی کچھ ہے۔ کوئی ہم سے پہلے چلا جائے گا، کسی سے پہلے ہم چلے جائیں گے۔ پہلے کون، بعد کو کون۔ کچھ نہیں معلوم۔''
انتھونی کی بیوی شیری میری رشتے دار ہے۔ خوب صورت، بڑی اچھی لڑکی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور دونوں کے خاندانوں میں نزدیک و دور کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔'' سیورین آہ بھر کے بولی۔
''کیسی کہانی؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔
''شیری کا باپ تھامس عجیب ضدی طبیعت کا آدمی تھا۔ شیری کے بچپن میں اس کی ماں مر گئی تھی۔ باپ نے اپنی اکلوتی بیٹی کی پرورش کی اور دوسری شادی بھی نہیں کی۔ حسین ہونے کے ساتھ شیری پڑھی لکھی اور بڑی سمجھ دار تھی۔ چھوٹی عمر میں اس کے رشتے آنے لگے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ تھامس بیٹی کو جدا کرنا نہیں چاہتا تھا، رشتے مسترد کرتا رہا۔ اس دوران ایک نوجوان شیری سے کچھ قریب ہو گیا

تھا۔ شیری بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ وہ تھامس کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ شیری سے شادی کے لیے اس نے باقاعدہ درخواست کردی تھی اور تھامس نے انکار نہیں کیا تھا لیکن اچانک ایک روز نوجوان ایسا غائب ہوا کہ آج تک نام و نشان نہیں ملا۔ اس کے والدین گیا شہر میں رہتے ہیں۔ اب تو کئی سال ہوگئے ہیں۔ سنا ہے، آج تک بیٹے کی واپسی کی راہ تک رہے ہیں۔"

"گیا شہر کا تھا وہ؟ کیا نام تھا؟"

گیا کے نام سے میرے ہڑبڑا جانے پر سیورین نے چونک کے پوچھا۔ "آپ کا تعلق بھی گیا سے ہے؟"

کیا ضروری تھا کہ میں اقرار کروں۔ میں نے اچٹتی آواز میں کہا کہ گیا شہر میں میرے عزیز رہتے تھے۔

سیورین ایک صاف دل لڑکی تھی، تکرار نہیں کی اور مجھے بتایا کہ اس نوجوان کا نام کلی فرڈ جون تھا۔ سب اسے جونی کہتے تھے۔

مجھے شبہہ ہوا تھا کہ میرے اسکول اور کالج کے وقت کا کوئی ساتھی نہ ہو۔ وہاں بہت سے عیسائی طلبہ تھے۔ جانے کیوں مجھے اس کا نام جاننے کی بے چینی ہوئی تھی۔ مجھے تو گیا چھوڑے ہوئے زمانہ ہوگیا تھا۔ میری دخل اندازی سے سیورین الجھ سی گئی۔

"پھر نہیں ملا وہ؟ یہاں پٹنے میں کیوں رہتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے اسے یہاں داخلہ ملا تھا۔ یہ اسپتال بھی تو اسی کالج سے وابستہ ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر تھامس کے چچازاد بھائی کے بیٹے کا رشتہ آیا۔ اس رشتے کے لیے تھامس پر بڑا دباؤ تھا۔ لڑکا اچھا تھا، تعلیم یافتہ، خوش شکل۔ خاندان بھی ایک ہی تھا، شیری اپنے ہی دوسرے گھر جاتی۔ تھامس ہاں یا ناں میں جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ شاید سردی کی ایک رات لڑکے کے گھر میں آگ لگ گئی۔ آس پاس کے کئی مکان لپیٹ میں آگئے۔ لڑکے کے بھرے پرے خاندان میں صرف اس کی ماں بچی جو بری طرح جھلس گئی تھی۔ چھ سات مہینے موت سے لڑتی رہی اور نہیں بچ پائی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کوئی شہادت نہیں تھی کہ تھامس اتنا ہولناک اور سفاک بھی ہوسکتا ہے، وہ بھی اپنے ہی خاندان کے لیے لیکن لوگوں کو وہم ہوگیا تھا اور شیری کے رشتے آنے بند ہوگئے۔ تھامس سے لوگ کنارہ کش ہونے لگے۔"

مجھے چپ دیکھ کے سیورین کو میری گراں خاطری کا احساس ہوا۔ وہ ٹھٹک سی گئی۔ "میں کیا داستان لے بیٹھی۔" وہ شرمندگی سے بولی۔ "آپ بھی کیا کہتے ہوں گے۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "پھر شیری، انتھونی کو کس طرح ملی؟"

"وہ تو بہت بعد کی بات ہے۔" سیورین اداسی سے بولی۔

میں نے حیرت کا اظہار کیا تو میری غیر دلچسپی کی بدگمانی کہیں اس کے دماغ سے دور ہوئی۔ میں اس سے کیا کہتا کہ میں سن بھی رہا تھا اور جانے کہاں کہاں بھٹک بھی گیا تھا۔

"بس کیا ہوا۔" وہ کہنے لگی۔ "ریاست رام پور کا کوئی نواب زادہ کسی کام سے پٹنا آیا تھا۔ شیری اس وقت کالج میں پڑھتی تھی۔ نواب زادے نے کہیں اسے دیکھ لیا۔ شیری کے کوائف حاصل کرنا نواب کے لیے کیا مشکل ہوں گے۔ کسی طرح اس نے تھامس سے رابطہ کرلیا۔ یہ رابطہ دیکھتے دیکھتے گہرے مراسم میں بدل گیا۔ تھامس کی خوشنودی کے لیے نواب نے تحفے تحائف کی بارش کردی تھی۔ تھامس اتنا خوش حال تھا نہ ایسا بدحال۔ ایک زمانے

سے وہ کسی بڑے گورے افسر کا معتمد تھا۔ سنا ہے، گورا افسر اس کی ذہانت اور دیانت کا بڑا قائل تھا، حد سے زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے پٹنا کے نواح میں تھامس کو بڑھاپے میں گزر بسر کے لیے کچھ زرعی زمین مل گئی تھی۔ افسر کی ترقی ہوگئی اور وہ کلکتے چلا گیا۔ اس نے تھامس کو بھی ساتھ لے جانا چاہا۔ تھامس نے معذرت کرلی۔ پٹنا اس کا آبائی شہر تھا۔ اپنے گھر سے اس کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں اس کی عزیز ترین بیوی رہتی تھی۔ ادھر شیری تعلیم حاصل کررہی تھی۔ کلکتا شہر کی گنجانی اور افراتفری اس کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ اسے اپنی شیری کا بھی خیال تھا، کلکتے میں وہ کہیں گم نہ ہوجائے۔ شیری اس کی زندگی تھی۔

نواب زادے کے پاس کیا کچھ نہیں تھا۔ سنا ہے، اس کی جاہ و حشمت اور اثر و رسوخ سے تھامس بہت متاثر ہوگیا تھا۔ دونوں سیر شکار کو جانے لگے تھے۔ نواب زادہ باپ بیٹی کو اپنی ریاست اور زمینوں پر لے گیا۔ شیری کے کالج کی چھٹیاں انہوں نے رام پور اور نینی تال وغیرہ میں گزاریں۔ شیری نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا باپ نواب کی بہت عزت کرتا تھا مگر ایک دن نواب نے شیری کے لیے اپنے بے پناہ جذبات کا اظہار کردیا اور منت کی کہ زندگی بھر کے لیے وہ شیری سے رفاقت کا آرزومند ہے۔ نواب کو اس حقیقت کا علم تھا کہ تھامس اپنی بیٹی کی جدائی کے خیال سے آزردہ ہوجاتا ہے۔ نواب نے تھامس کو اپنے ساتھ رہنے، شیری کے لیے ایک الگ گھر، محل جیسا ایک گھر بنانے کی پیش کش بھی کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ یہی اس کی پہلی اور آخری شادی ہوگی۔ تھامس کی کوئی شرط ہو یا وہ کچھ اور تحفظ چاہتا ہو تو کھل کے بتائے۔ مہذب، نفاست پسند، خوش لباس، رفتار گفتار میں خوش ذوق، مصوری اور موسیقی کا دل دادہ، بے اندازہ دولت کا مالک اور نہایت منکسر مزاج نواب زادے نے آکسفورڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور مشرق کی محبت میں ڈوب کے ولایت سے واپس آیا تھا۔ وجیہہ اور دل کش شخصیت کا حامل تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس کی رفاقت پر ناز کرتی۔ نواب سے وابستگی ہر اعتبار سے بہتر زندگی کی ضمانت تھی۔ نواب کا حال یہ تھا کہ وہ شیری اور اس کے باپ کے آگے بچھا بچھا جاتا تھا۔ اتنی نوازشیں، اس قدر تپاک سے کوئی سنگ دل سے سنگ دل بھی پگھل جاتا۔"

سیورین نے رک کے ایک نظر میری طرف دیکھا اور جیسے میرے انہماک سے مطمئن ہو کے ڈوبی ڈوبی آواز میں کہنے لگی۔ "شیری کو توقع تھی کہ اس بار اس کا باپ شاید انکار نہ کرسکے۔ تھامس نے یہ معقول عذر کیا کہ وہ عیسائی ہے اور رتبے میں بھی نواب زادے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ نواب نے کہا کہ اس کے مذہب میں عیسائی عورت سے شادی کی اجازت ہے اور وہ کوئی ایسا کٹر مذہبی آدمی بھی نہیں۔ شیری کو اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے میں کوئی اجنبیت نہ ہوگی۔ اسے شیری کے مذہبی معاملات و مشاغل سے بھی کوئی غرض نہیں ہے۔ اسے شیری چاہیے۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو وہ اپنی ساری دولت شیری کے نام کرنے کے لیے تیار ہے۔ نواب زادے کی تمام تر یقین دہانیوں اور ضمانتوں کے باوجود تھامس لیت و لعل کرتا رہا۔ صاف انکار بھی اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ جتنا نواب سے کترانے کی کوشش کرتا، نواب کی شدت اتنی بڑھتی جاتی تھی۔ تھامس ان دنوں بہت پریشان رہنے لگا تھا۔"

سیورین کہہ رہی تھی۔ "شیری نے اسے بتایا تھا۔ نواب چاہتا تو کسی اور طرح اس کے باپ کو مجبور بھی کرسکتا تھا۔ نواب کی ریاست، اس کے محل میں قیام کے دوران شیری اس کے زور و اثر کی شاہد تھی۔ خدام کی ایک فوج اس کے اشاروں کی منتظر رہتی تھی۔ نواب نے ایسی کوئی کاروائی نہیں کی۔ کچھ

اس وجہ سے بھی وہ نواب کا احترام کرنے لگی تھی۔ شیری کے بہ قول، اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی نواب کے ساتھ آنے والے دنوں کے خواب دیکھنے شروع کردیے تھے مگر اس کا باپ جانے کیا چاہتا تھا۔ شیری کے لیے جانے اس نے کیا سوچ رکھا تھا۔ دنیا کا دستور ہے، بیٹیوں کا گھر ماں باپ کا گھر نہیں ہوتا۔ پھر ایک روز تھامس کو کیا سوجھی۔ وہ شیری کو ساتھ لے کے کلکتے چلا گیا اور چند روز بعد واپس آگیا۔ کلکتے سے آنے کے بعد اس نے نواب سے ہاں کہہ دی اور شیری کا تعلیمی سال مکمل ہوجانے تک کی مہلت مانگ لی۔"

"پھر نواب باقی نہیں رہا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

سیورین کی بڑی بڑی آنکھیں پھیل گئی۔

"آپ کو معلوم ہے؟"

"یوں ہی...... پچھلا سارا کچھ سننے کے بعد......" میں نے سرد لہجے میں کہا۔" اب یہ مت کہنا کہ ایسا ہی ہوا۔"

"مگر یہی ہوا۔" سیورین بجھی بجھی آواز میں بولی۔"نواب کو اس کی زمینوں والے مکان میں کسی نے گولی ماردی۔ یہاں تو خبر بھی نہیں آتی لیکن پٹنے میں نواب کے چند دوست تھامس اور اس کے روز افزوں مراسم سے واقف تھے۔ تحقیقات کرتے کرتے پولیس تھامس کے پاس آگئی۔ نواب کی موت کے وقت تھامس، پٹنے میں تھا۔ پولیس نے خاصا وقت صرف کیا اور کچھ حاصل نہ کرسکی۔ نواب زادے کا قصہ جلد ہی پرانا ہوگیا۔"

"پھر یہ انتھونی؟...... اس صورت حال میں انتھونی کس طرح؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"سمجھیے، شیری نے اپنے آپ سے ناتا توڑ لیا۔" سیورین کی آواز اور دھندلا گئی، کہنے لگی کہ شیری نے بالکل اپنے آپ کو ترک کردیا تھا۔ وہ خاموش خاموش رہنے لگی نوجوان لڑکیاں بہت خواب دیکھتی ہیں۔ شیری نے ساری کھڑکیاں دروازے بند کرلیے تھے۔ چپ چپ کالج جاتی اور گھر واپس آجاتی۔ کسی سے کوئی رسم وراہ نہ رکھتی۔ کالج کے ساتھی جو بھی اس کی ایک نگاہ خوش انداز کے لیے بے قرار رہتے تھے، کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ حسین لڑکیوں کے یوں بھی فسانے بن جاتے ہیں۔ آدمی نگاہوں کی زبان زیادہ سمجھتا ہے۔ کالج سے گھر، گھر سے کالج تک گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے لوگوں کی نگاہوں سے واسطہ تو پڑتا ہی تھا۔ نواب کی موت کے بعد شیری کئی روز تک کالج نہیں گئی تھی لیکن گھر بھی اسے کاٹ کھانے دوڑتا تھا، تعلیمی مصروفیات کا کوئی بہانہ تو بہر حال تھا۔

دن گزرتے گئے۔ اور ایک روز انتھونی دیوار کی طرح سامنے آکے کھڑا ہوگیا۔ دلیر، بے باک، سرپھرا انتھونی مالی اعتبار سے کم تر تھا لیکن دل کا بڑا امیر۔ سینیر کیمبرج کے بعد گریجویشن کے لیے اسے شیری کے کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ یہاں اس نے پہلی بار شیری کو دیکھا اور پاگل ہوگیا۔ یقیناً اس کے ساتھیوں نے اسے شیری سے دور رہنے کی تلقین کی ہوگی۔ انتھونی کی وارفتگیاں شیری کو متاثر نہ کرسکیں۔ شیری اپنے آپ سے بھی تو ڈرنے لگی تھی۔ جواں سال انتھونی کو وہ اپنی بدقسمتیوں اور محرومیوں کا حصہ بنانا نہیں چاہتی تھی۔ انتھونی میں دل داری کی بڑی خوبیاں تھیں۔ شیری کی مسلسل پہلو تہی، حد سے زیادہ بے حسی پر دل برداشتہ ہونے کے بجائے وہ کچھ اور دیوانہ ہوا۔ شیری نے ایک بار تو اسے بری طرح دھتکار دیا تھا۔ حالاں کہ یہ تلخی وتندی اس کے مزاج کے برعکس تھی۔ ثابت قدم انتھونی، شیری کو زندگی میں واپس لانے کی کوششوں میں جتا رہا۔ شیری کو خود پر مسلط کیے ہوئے جبر سے تنہائی تو بہت محسوس ہوتی ہوگی۔ جبر شعوری تھا۔ غیر شعوری طور پر کسی پناہ کسی سہارے کی ضرورت تو اسے محسوس ہونی چاہیے۔ انتھونی اپنے گداز، اپنے التفات

پروانہ وار نثار کرتا رہا۔ شیری کب تک اپنے آپ سے روٹھی رہتی۔ انکار کو بھی ایک تاب استقامت چاہیے۔ وہ تو ایک دل گیر، ایک ناتواں لڑکی تھی۔ اس نے انتھونی کے آگے سپر ڈال دی۔

سیورین کہہ رہی تھی کہ شیری کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ناکام ہونے کے لیے انتھونی نے اس کی جانب پیش قدمی نہیں کی ہے اور وہ دوسرے نوجوانوں کی طرح نہیں ہے، وہ تو کچھ اور ہے مگر جیسا کہ لوگ کہتے تھے، شیری کا باپ، اس کا مشفق باپ! کوئی شہادت نہیں تھی کہ اس کا باپ ہی اس کی آرزوؤں اور خوابوں میں رکاوٹ بنا رہا ہے۔ یہ محض ان ہونیوں کا ایک سلسلہ بھی تو ہوسکتا ہے۔ اس کا باپ ایک تجربہ کار، ہوش مند اور پڑھا لکھا شخص ہے۔ شیری کی ماں بچپن میں اسے چھوڑ گئی تھی۔ اس کے باپ نے اسے پیروں چلنا سکھایا، وہ تو شیری کے لیے ایک سایہ، کوئی ستون بنا رہا ہے۔ شیری کی قسمت خراب ہے تو اس کے باپ کا کیا قصور۔ کوئی باپ، اور تھامس جیسا باپ اپنی بیٹی کے لیے کیا برا چاہ سکتا ہے۔ بے شمار تسلی آمیز جوازوں کے باوجود شیری کو چین بھی نہیں آتا تھا۔ اس نے انتھونی سے گزارش کی کہ بہتر یہی ہوگا کہ ان کے مراسم کے احوال سے تھامس بے خبر رہے۔ انتھونی کے لیے یہی کیا کم تھا کہ اس کی کوشش رائیگاں نہیں گئیں۔ شیری کا پتھر کسی طور پگھلا تو سہی۔ بالآخر اس کے اندھیرے وجود میں کوئی جوت جگی تو سہی۔

وہ ایک دوسرے سے ملتے رہے اور انہوں نے جانا کہ وہ دونوں تو ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں، وہ تو کب سے ایک دوسرے کی تلاش میں تھے۔ وہی تو ایک دوسرے کی منزل ہیں۔ وہ انتھونی ہی تھا جسے شیری ڈھونڈ رہی تھی اور وہ شیری ہی تھی جس کے بغیر انتھونی ادھورا تھا۔ یوں سوچیے تو ہر اکیلا آدمی ادھورا ہوتا ہے اور کوئی دوسرا ہی اس کا وجود مکمل کرتا ہے اور وہ دوسرا قسمت سے کسی کسی کو ملتا ہے۔ کبھی کسی کو کوئی نہیں مل پاتا اور زندگی یوں ہی اندھیرے پن میں گزر جاتی ہے۔

شیری بھی سیورین کے کالج میں پڑھتی تھی۔ شیری نے بہت بعد کو کالج میں داخلہ لیا تھا۔ دونوں خاندانوں کا رسمی خاندانی تعلق تھا۔ شیری کے کالج میں آجانے کے بعد وہ ایک دوسرے سے بہت قریب آگئی تھیں۔ نواب کے سانحے کے بعد شیری، سیورین سے کنارہ کش رہنے لگی تھی۔ سیورین نے اس کی دل جوئی کی کوشش کی تو شیری سر جھکا کے رہ گئی۔ سیورین نے پہلے تعلیم مکمل کرلی تھی۔ کالج سے رخصت ہونے کے بعد وہ ایک دوبار شیری سے ملنے اس کے گھر گئی لیکن شیری نے بس جیسے پرانے تعلق کی رسم نبھائی اور سیورین نے اس کے گھر جانا بند کردیا۔ وہ تو جب شیری، انتھونی سے وابستہ ہوئی تو اسے سیورین سے اپنی بے وضعی، بے سلوکی کا احساس ہوا۔ وہ خود سیورین کے گھر آئی اور دونوں میں جوش اور جذبے سے پرانا تعلق بہ حال ہوا۔

انتھونی نے شیری کی خواہش کے مطابق ہر ممکن احتیاط کی تھی لیکن کب تک! ایک روز توقع کے خلاف شیری کی تعلیمی رپورٹ لینے کے لیے تھامس اپنے دوست، کالج کے پرنسپل کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایسے وقت کالج پہنچا جب چھٹی ہونے والی تھی۔ شیری اسے وہاں نظر نہیں آئی۔ دن کی آخری کلاس میں اسے کلاس میں ہونا چاہیے تھا۔ پرنسپل سے ملاقات کے بعد تھامس اسے تلاش کرتا ہوا کالج کے اس گوشے میں جانکلا جہاں شیری اور انتھونی ایک دوسرے میں گم تھے۔ تھامس نے دور سے انہیں دیکھ لیا تھا مگر وہ ان کے قریب نہیں گیا۔ شیری اور انتھونی کو کچھ احساس نہ ہوسکا کہ تھامس ان کا نگراں ہے۔ کوئی اور باپ ہوتا تو وہاں سے چلا جاتا لیکن وہ تھامس تھا۔ وہ ان دونوں کے باہمی روابط کا اندازہ کرنے لیے اپنی جگہ ٹھیرا رہا پھر آہستہ آہستہ ان کے پاس گیا۔ اسے سر پہ کھڑا دیکھ کے دونوں ہڑبڑا

گئے۔ تھامس نے ان سے کچھ نہیں کہا، ایک لفظ بھی۔ وہ شیری کو ساتھ لے کے گھر چلا گیا۔ شیری نے بھی اس سے کوئی کلام نہیں کیا۔ دونوں باپ بیٹی نے ایک دوسرے بھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ دوسرے دن تھامس نے شیری کو کالج جانے نہیں دیا لیکن خود کالج جا کے پرنسپل سے انتھونی کو کالج سے نکال دینے کا مطالبہ کیا۔ یہ بات ایسی نہیں تھی کہ انتھونی کو کالج سے نکال دینے کا جواز بنتی۔ پرنسپل نے انتھونی کو متنبہ کرنے کا وعدہ کیا۔ تھامس نے پھر خود شیری کے ساتھ کالج آنا جانا شروع کردیا۔ وہ کالج کھلنے اور بند ہونے تک آس پاس منڈلاتا رہتا۔ عین وقت پر شیری کو گھر لے جانے کے لیے کہیں سے نمودار ہوجاتا۔ اس نے شیری کو پھر نڈھال کردیا تھا۔ شیری نے کسی ذریعے سے کچھ عرصے کے لیے انتھونی کو دور دور رہنے کی ہدایت کردی تھی۔ انتھونی کچھ دنوں تک تو برداشت کرتا رہا پھر اس نے جرأت کی اور ایک شام تھامس کے گھر پہنچ گیا اور اس نے کسی ردوقدح کے بغیر شیری سے شادی کا دعوا کردیا۔ تھامس نے تمام تر بردباری اور تحمل سے سنا اور کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ انتھونی نے اسے جتلایا کہ شیری کی مرضی بھی یہی ہے۔ ان دونوں نے ہمیشہ ساتھ رہنے کا عہد کیا ہے اور وہ شیری کے حصول کے لیے کچھ بھی کر گزر سکتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ تھامس ان دنوں کی خوشی کی خاطر ہاں کردے۔ انتھونی کا تیور سرکشانہ تھا۔ تھامس کو یقیناً ناگوار ہوا ہوگا۔ جواب میں اس نے متانت سے کہا کہ اسے سوچنے کا وقت دیا جائے۔ انتھونی کے پاس کیا چارہ تھا۔ وہ چھرے اور تمنچے سے تو تھامس سے اقرار نہیں کراسکتا تھا، دوبارہ آنے کا کہہ کے ناشاد و نامراد واپس چلا آیا۔

شیری بہت خوف زدہ تھی کہ اس کے باپ نے ایک بار پھر مہلت طلب کی ہے۔ خدا خیر کرے۔ اس نے اپنی رازداں سیورین کے توسط سے انتھونی کو اپنا خیال رکھنے کی تاکید اور سردست خاموش رہنے کی عاجزی کی۔

انتھونی نے اس کے بعد صبر آزما وقت گزارا۔

تھامس عرصے سے سرکاری ملازمت میں تھا اور اپنے گورے افسر کا کلکتے تبادلہ ہوجانے کے بعد اس نے طویل رخصت لے لی تھی۔ پولیس اور دیگر سرکاری محکموں میں اس کا اچھا اثر و رسوخ تھا۔ سبھی واقف تھے کہ پٹنے میں ایک مدت سے تعینات گورے افسر کا وہ کس قدر پسندیدہ ماتحت تھا۔ تھامس نے انتھونی کو کالج سے نکلوانے کی کوشش جاری رکھی اور ناکام ہوتا رہا، البتہ پرنسپل کو مجبور کرکے شیری اور انتھونی پر طرح طرح کی سختیاں، پابندیاں عائد کروانے میں کام یاب ہوگیا۔ پرنسپل نے دونوں کو خبردار کردیا تھا کہ آیندہ شیری کے باپ تھامس کو کوئی شکایت ہوئی تو دونوں کو کالج سے فارغ کردیا جائے گا۔ دونوں دور دور سے بس ایک دوسرے کی صورت دیکھتے اور دیکھتے رہ جاتے۔ بات کرنا تو دور کی بات ہے، وہ قریب بھی نہیں آتے۔ ان کے گہرے ربط ضبط پر تلملا جانے والے کالج کے بعض شورہ پشت طالب علم ساتھیوں کو انہیں ستانے اور زچ کرنے کا ایک موقع ہاتھ آگیا تھا۔ دونوں کی تعلیم متاثر ہونے لگی۔ کالج میں ان سے ہم دردی رکھنے والے دوست بھی تھے۔ ان کے ذریعے برائے نام نامہ و پیام کا سلسلہ ممکن ہوگیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو آزمائش کا یہ وقت گزر جانے کا آسرا دلاتے اور اپنے عزم، اپنے عہد کا اعادہ کرتے رہتے تھے۔ ان کی ناقص درسی کارکردگی پر ایک دن پرنسپل نے دونوں کو الگ الگ طلب کرکے سخت سست کہا لیکن دونوں کا کہیں دل نہیں لگتا تھا، کلاس میں، کتابوں میں، گھر میں، کہیں بھی۔ دونوں کو گرد و پیش کا کچھ ہوش ہی نہ رہا تھا۔ دور ہوجانے کے بعد وہ ایک دوسرے کے اور قریب ہوگئے تھے۔ چھٹیاں ہوئیں تو اور قیامت

آ گئی۔ شیری گھر میں بند ہوگئی۔ کالج میں دید و باز دید کی ایک رعایت تھی، وہ بھی نہ رہی۔ ناچار انتھونی نے شیری کے گھر کے گرد چکر کاٹنے شروع کردیے۔ کہیں کسی کھڑکی، روزن، کسی اوٹ سے شیری کی جھلک دکھائی دے جائے۔ انتھونی، محلے والوں کی نظروں میں آ گیا تھا۔ تھامس کی شکایت پر پولیس اسے تھانے لے گئی۔ پولیس کو جواز تراشنے کا ہنر آتا ہے اور سو خون بھی معاف ہوتے ہیں۔ کئی دن تک وہ جور و ستم کی مشق کرتے رہے، کئی دن تک انہوں نے انتھونی کو روکے رکھا اور ایسی حالت کردی کہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں کئی دن لگ گئے۔

انتھونی اپنے آپ سے مجبور تھا۔ اس نے پھر حوصلہ کیا۔ اتنے آزار اور رسوائیوں کے بعد تھامس اسے اپنے گھر دیکھ کے حیران و پریشان تو ضرور ہوا ہوگا لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھا اور سنجیدگی و سرد مہری سے پھر انکار کردیا۔ اس مرتبہ اس نے وجہ بھی بتائی کہ انتھونی اس کی ماہ جمال بیٹی کے لیے کسی طور اہل نہیں ہے۔ پہلے وہ کچھ کرکے دکھائے، تعلیم مکمل کرے۔ اچھی ملازمت یا کوئی معقول کاروبار کرے تب تھامس کے پاس آئے، تھامس ہم دردی سے غور کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ بڑی کڑی شرطیں تھیں۔ دیوانوں سے کہا جائے کہ وہ ایسے ہی دیوانگی چھوڑ دیں۔ دیوانگی کا سبب بھی تو پہلے دیکھا اور دور کیا جائے۔ مایوسی میں انتھونی ہوش و حواس سے اور بے گانہ ہونے لگا۔ بیٹے کی دگرگوں حالت دیکھ کے اس کے باپ نے تھامس کی خدمت میں خود حاضری دی اور تھامس کو راضی کرنے کے لیے پٹنا کے کئی بااثر لوگوں کو بھی بیچ میں ڈالا۔ وہ لوگ تھامس کے پاس گئے اور انتھونی کی شرافت، سچائی، دیانت، جواں سالی اور شیری سے اس کی والہانہ شیفتگی اور شیدائیت کے واسطے دیے۔ تھامس ٹس سے مس نہ ہوا۔

کالج کھلنے پر انتھونی اور شیری نے کالج جانا شروع کردیا تھا۔ تھامس کا وہی معمول تھا۔ صبح بیٹی کو کالج پہنچانے جانا اور کالج بند ہوجانے پر ساتھ لے جانا۔ شیری اور انتھونی کی حالت سے متاثر ہوکے ان کے چند قریبی دوستوں نے کالج کے اوقات کے دوران دونوں کی ملاقات کا بندوبست کردیا۔ شیری اور انتھونی بہت سہہ چکے تھے۔ اب انہیں ایک دوسرے سے جدا ہونے کا یارا نہیں تھا۔ ساتھیوں کے تعاون سے وہ کسی طرح ایک دن کالج سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

پھر تیسری بار انتھونی، شیری کے ساتھ تھامس کے گھر گیا اور اس نے بتایا کہ انہوں نے چرچ میں شادی کرلی ہے۔ بہتر ہے، تھامس خوش دلی سے انہیں قبول کرلے۔ شیری تو اب انتھونی کے ساتھ اس کے گھر جارہی ہے، اپنے گھر، جو اب اس کا اصل اور مستقل گھر ہے۔ ماں باپ کے گھر سے ہر لڑکی کا تعلق عارضی ہوتا ہے۔

تھامس گنگ رہ گیا، کچھ نہ کہہ سکا، یاس بھری، حسرت بھری نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا کیا۔ شیری کی خاموشی اس کے لیے اور تازیانہ ہوگی۔ شیری، انتھونی کے گھر آ گئی۔ دونوں کو توقع تھی کہ اب تھامس کی باری ہے، وہ ان کے پاس ضرور آئے گا اور آخر کار ان پر اپنی شفقتیں ارزاں کرے گا۔ وہ نہیں آیا۔ دو تین روز ہی گزرے ہوں گے انہیں معلوم ہوا، تھامس ختم ہوچکا ہے۔ اس نے خود کو آگ لگالی تھی۔ اس کے ساتھ مکان کا کچھ حصہ بھی جل گیا ہے۔ جس وقت پڑوسی پہنچے، مکان تو انہوں نے بچالیا، تھامس کو نہ بچا سکے۔

شیری کو اپنے باپ سے ایسی سفاکی کی امید نہیں تھی۔ وہ تو ڈھیر ہوگئی۔ وصیت کے مطابق، آبائی مکان، زرعی زمین، نقدی کی شکل میں عمر بھر کی جمع پونجی، شیری کی ماں کے زیورات، سارا کچھ چرچ کے نام، چرچ کی نذر کردیا گیا تھا۔ پادری کو علم تھا

کہ شیری، تھامس کی اکلوتی اولاد، وہی اس کی جائیداد کی اصل وارث ہے اور شیری کے سسرال کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں ہے، شیری کچھ بھی ساتھ لے کے سسرال کے گھر نہیں گئی ہے۔ اسے اختیار تھا وہ تھامس کا عطیہ قبول کرلے یا مسترد کردے۔ اس نے آدھی ملکیت شیری کو واپس کرنا چاہی۔ شیری نے پادری کی پیش کش منظور نہیں کی۔ پادری نے اپنے نائبین سے صلاح و مشورہ کرکے تمام تر جائیداد شیری کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیری نے اسے بھی مسترد کردیا اور انتھونی کے ساتھ عسرت کی زندگی کو ترجیح دی۔ اب انتھونی کے جانے کے بعد گھر میں صرف ایک مرد رہا ہے، انتھونی کا چھوٹا بھائی، اور وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔

مجھے کیا کہنا چاہیے تھا، کچھ نہیں معلوم تھا۔ سیورین کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی۔ آنسو بڑی راحت ہوتے ہیں۔ میری آنکھیں تو آنسوؤں سے بھی عاری تھیں۔ ایسا لگتا تھا، جیسے سیورین نے جان بوجھ کر مجھے کچھ جتلانا چاہا ہو۔ میں اس سے کیا کہتا، ایک انتھونی اور ایک شیری کیا، جانے کتنے ایسے ہی بس ایک آدمی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک آدمی، وہی مقصد، وہی محور، وہی منزل۔ ہر راستے میں انہیں وہی ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ ایک آدمی نہ ملے تو کیا مال و زر، کیا طاقت و اقتدار، کیا علم و ہنر، سب ہیچ، سب پتھر، سب مٹی ہے۔ ایک آدمی ہی کبھی کسی کے لیے سب سے بڑا خزانہ ہوتا ہے۔ وہ خزانہ مل جائے تو اسے اپنی زندگی مل جاتی ہے، اسے دنیا مل جاتی ہے۔ ایک آدمی، ایک آدمی کا حاصل، باقی سارا کچھ بے معنی، بے جواز، لاحاصل۔ ایسا کیوں ہے اور کیا ہے یہ سب کچھ۔ یہ کچھ وہی بتا سکتا ہے جو اپنے مطلوب کے زنداں کا اسیر ہے اور مطلوب اس کے زنداں کا۔ وہ جو دو آدمی، الگ چہروں، الگ رنگوں کے نظر آتے ہیں، وہ تو ایک ہی ہوتے ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل، پہلا بھی نامکمل، دوسرا بھی نامکمل۔ ان کی تکمیل یک جائی کی صورت ہی میں ممکن ہوتی ہے۔''

''شیری تو مر جائے گی۔'' سیورین بلکتی آواز میں بولی۔ ''اس کا تو اب کوئی نہیں رہا۔ وہ تو لٹ گئی ہے۔''

''تم ...... تم اس کے پاس جاؤ تو کہنا کہ زندگی یہی تماشا، یہی شعبدہ بازی کرتی رہتی ہے۔ کچھ نیا نہیں ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔''

''تمہیں تو زیادہ سے زیادہ اس کے پاس ہونا چاہیے۔''

''میں چلی بھی جاتی لیکن ڈاکٹر رائے...... وہ بہت سخت آدمی ہیں۔ کچھ بھی ہوجائے، زمین ہل جائے، آسماں پھٹ پڑے، ان کا حکم ہے کہ ڈیوٹی پر حاضر رہو۔'' سیورین ناتوانی سے بولی۔ ''اور ان سے اجازت لے بھی لیتی تو وہاں جاکے کیا کرتی، شیری سے کیا کہتی، اسے کیا دلاسا دیتی کہ انتھونی واپس آجائے گا۔''

''کوئی واپس نہیں آتا مگر جو لوگ موجود ہیں، جو اپنے ہیں، وہی دکھ درد بٹاتے ہیں۔ ان کی موجودگی بھی دلاسا ہوتی ہے۔ اور ڈاکٹر رائے ایسے سخت آدمی بھی نہیں ہیں۔''

''مگر میں...... مجھ سے شیری کی حالت دیکھی نہیں جائے گی۔ میں نے وارڈ بوائے سے پوچھا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ تو کچھ بولتی ہے نہ سنتی ہے، نہ پلکیں جھپکاتی ہے۔ کسی کو پہچان نہیں رہی ہے، وہ تو......'' سیورین پھر سسکنے لگی۔ ''یہ انتھونی...... کیا ضرورت تھی اسے ان لوگوں کا پیچھا کرنے کی...... بالکل پاگل...... پاگل آدمی تھا وہ۔''

میں چپ رہا۔

''شیری کے لیے انتھونی، تھامس کو پسند نہیں تھا۔ جو تھامس کو پسند نہیں آتا تھا، اس کا یہی انجام

ہوتا تھا۔ تھا مس کی روح تو بے کل ہوگی۔"

سیورین نے سارا الزام روح پر ڈال دیا تھا۔ یہ روح کا عذر بھی انسانوں نے خوب وضع کرلیا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا، نرس ایمی جانتی تھی کہ وہ لوگ، رات کے آخری پہر آنے والے لوگ کس ارادے اور کس تعاقب سے آئے تھے۔ انتھونی تو چارا بن گیا۔ میں اسپتال میں نہ ہوتا تو وہ لوگ اس طرف کا رخ کیوں کرتے۔ انتھونی میں بڑا جوش اور جذبہ تھا۔ اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔

"تم شیری کے پاس جاؤ تو......"

میری بات پوری ہونے سے پہلے سیورین ڈولتی آواز میں بولی۔ "ہاں میں جاؤں گی اس کے پاس...... مجھے جانا ہی ہوگا۔"

"اس سے کہنا کہ انتھونی واپس نہیں آسکتا۔ انتھونی کی دو بہنوں اور بھائی کی ذمے داری ہے اس پر۔ وہی اب گھر سنبھال سکتی ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ اور......"

"مگر شیری کے پاس اب کیا رہا ہے۔" سیورین مایوسی سے بولی۔ "کچھ بھی نہیں بچا۔"

"ایک بات کہوں تم سے؟" میں نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں ہاں۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"ایک صورت ممکن ہوسکتی ہے۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں، اسے غور سے سننا اور پہلے سن لینا، پھر کچھ کہنا۔"

"کیا بات ہے؟" وہ ہڑبڑا سی گئی۔

"شیری کو زندگی گزارنے، یہ برا وقت ٹالنے کے لیے اتنی رقم دی جاسکتی ہے کہ اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔ یہ اسپتال کا مکان بھی اس سے چھن جائے گا۔ کیوں کہ انتھونی کے چلے جانے کے بعد وہ یہاں زیادہ دیر نہیں رہ سکتی۔ وہ نیا مکان خرید لے۔ کم از کم آیندہ پانچ سال تک کے لیے اس کی بہتر گزر بسر کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ اس مدت میں وہ یقیناً اس قابل ہوجائے گی کہ اپنے آپ بھی کچھ کرسکے، اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرسکے۔ انتھونی کے چھوٹے بھائی کی تعلیم، اس کی بہنوں کی شادی کرسکے۔ یہ مالی قسم کے سہارے بڑی تسلیم ہوتے ہیں۔ ذرا اس کی حالت سنبھلے تو اسے یہ بتادینا اور میرا نام کسی طور نہ آئے تو مناسب ہوگا۔ یہ رقم کسی وقت بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ باقی شیری اور اس کے خاندان کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو کسی ذریعے سے مجھے مطلع کیا جاسکتا ہے۔ میرے دوست اکبر علی خاں پٹنے ہی میں رہتے ہیں، وہی جن کے ساتھ دوپہر ہم نے کھانا کھایا تھا۔ وہ ایک بڑے وکیل ہیں اور بہت نفیس آدمی۔ میری درخواست پر وہ شیری اور اس کے گھر کی خبر گیری کرسکتے ہیں، اگر تم اس معاملے سے الگ رہنا چاہو۔"

سیورین مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"مجھے شبہ ہے، ایک خود دار لڑکی کو یہ سارا کچھ قبول کرنے میں تامل ہوگا مگر اسے یقین دلانا تمہارا کام ہے کہ میری کوئی غرض اس سے وابستہ نہیں ہے۔ میں تو یہاں رہوں گا بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ آمادہ ہوجائے تو مجھے خوشی ہوگی۔ اس بدنصیب سے کہنا کہ کوئی بھی ایسی اعانت انتھونی کے نقصان کی تلافی نہیں کرسکتی مگر اب انتھونی نہیں ہے۔ اس کے بغیر زندگی تو گزارنی ہے۔ اور سنو! شیری سے ہم دردی اپنی جگہ ہے لیکن یہ میرے اپنے اطمینان، اپنے سکون کی بات ہے۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" سیورین سراسیمہ انداز میں بولی۔

"تم نے جو سنا، وہی میں نے کہا۔" میں نے نپی تلی آواز میں کہا۔

سیورین آگے کچھ نہ بول سکی اور مجھ سے بھی کچھ نہ کہا جاسکا۔

اس سے پہلے کہ سیورین مجھ سے غیر ضروری سوال کرتی، ایک نظر بٹھل کو دیکھ کے میں کمرے سے باہر آگیا اور اسپتال کے مرکزی عمارت تک چلا گیا۔ شام کو مریضوں سے ملاقات کا وقت شروع ہوچکا تھا۔ صدر دروازے سے مریضوں کے دوست اور اعزا کے دستے اسپتال میں داخل ہورہے تھے۔ عمارت کے سامنے کے سبزہ زار میں دوپہر جیسی بھیڑ نہیں تھی۔ انتھونی کی تدفین میں شریک ہونے والے اب وہاں نہیں تھے۔ انتھونی کا جنازہ اٹھایا جاچکا ہوگا۔ ممکن ہے، انہوں نے اسے خاک کے سپرد بھی کردیا ہو۔ مجھے یاد نہیں، کہیں پڑھا تھا، جو کچھ اس دنیا میں نظر آتا ہے، سب مٹی کی شکلیں ہیں۔ اپنی عمر پوری کرنے کے بعد ساری شکلیں مٹ جاتی ہیں اور سب مٹی ہوجاتا ہے۔ اور کسی نے کہا تھا، آدمی کی ساری زندگی فریب کی زندگی ہوتی ہے، زندہ رہنے کا فریب، دیکھنے، سننے اور بولنے کا فریب۔ جس کا انجام فنا ہے، اس کا دیکھنا، سننا اور بولنا کیا معنی رکھتا ہے۔ سب سنا ہوا مٹی، سارا دیکھا ہوا مٹی، سارا بولا ہوا مٹی ہے۔ انتھونی مرگیا۔ نوجوانی میں مرگیا۔ کچھ اور وقت زندہ رہتا تو بھی مرجاتا۔ لوگ اسے دفنا کے قبرستان سے لوٹ رہے ہوں گے۔ انہیں جلدی بھی ہوگی زندگی کی طرف لوٹنے کی۔ جانے کتنے ادھورے کام یاد آرہے ہوں گے۔ قبرستان سبھی کو برا لگتا ہے حالاں کہ سارے راستے اسی کی طرف جاتے ہیں، قبرستان یا شمشان گھاٹ یا برج خموشاں یا کوئی اور۔ وہی ایک سوال، آدمی پیدا کیوں ہوتا ہے کہ مرجاتا ہے۔ کسی کے پاس اس کا جواب نہیں۔ موت پر سب کا اختتام ہو، اس زندگی پر کیا ناز، کیسا افتخار، کس بات کی تمکنت۔ زندگی سے بڑا طلسم شاید کوئی نہیں، اور کوئی طلسم مستقل نہیں ہوتا۔

مرکزی عمارت سے دائیں طرف راہ داری میں جاتے ہوئے مجھے چند پولیس والے بھی نظر آئے۔ وہ ابھی تک اسپتال کے کونے گوشے ٹٹول رہے ہوں گے۔ کتے ان سے زیادہ چست ہوتے ہیں، بو سونگھ تو لیتے ہیں۔ ان کی نظروں میں آنے سے میں نے پہلو تہی کی اور ادھر ادھر گھومتا رہا۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ جانے کیوں، جیسے میں کچھ بھول رہا ہوں، مجھ سے کوئی چوک ہورہی ہو، کچھ ہونے والا ہے جیسے۔ دھوپ کے آثار رہ گئے تھے کہ میں کمرے میں واپس آگیا اور یہ دیکھ کے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ڈاکٹر رائے اور ایک نوجوان ڈاکٹر بٹھل کے بستر کے گرد موجود تھے اور بٹھل بیٹھا ہوا تھا۔ بستر کے سرہانے، تکیوں سے ٹیک لگائے، آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، سیورین چمچے سے اسے کوئی مشروب پلا رہی تھی۔ میں جھپٹتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔ بٹھل نے نگاہیں گھما کے ایک ثانیے کے لیے مجھے دیکھا اور نقاہت سے نظریں جھکالیں۔ میرے جی میں آیا، ڈاکٹر رائے کے ہاتھ چوم لوں، کس طرح اس سے ممنونیت کا اظہار کروں۔ ڈاکٹر رائے بٹھل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور تمتماتی آواز میں اس کی استقامت کی داد دے رہا تھا۔ معاً اسے خیال آیا اور اس نے ہندوستانی میں کہا۔ "تم ایک اچھا لڑیا (جنگ باز) ہے، بہت اچھے، بہت اچھے۔ اپنے بھائی کو دیکھا؟ اسے اب بھی شبہ ہے۔" آخری جملہ اس نے پھر انگریزی میں کہا۔

بٹھل کو جواب دہی کا یارا نہیں تھا لیکن اس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سب کچھ سن رہا اور دیکھ رہا ہے۔ نرس سیورین بہت توجہ اور نفاست سے اسے مشروب پلا رہی تھی۔

"کیا حال ہے اب؟" میری آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ بٹھل نے سن لیا تھا، آنکھوں آنکھوں سے اطمینان کی تلقین کی۔ "ٹھیک تو ہو تم؟" میں نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

بٹھل نے ڈاکٹر رائے کو اشارہ کیا تھا یا ڈاکٹر بٹھل کو کسی اضطراب سے دوچار کرنا نہیں چاہتا تھا، میرا بازو پکڑ کے وہ مجھے اس کے بستر سے دور لے

آیا۔ ڈاکٹر کی ناراضی کے خیال سے میں نے بہ جبر تعمیل کی۔
ڈاکٹر رائے دروازے کے پاس آ کے رک گیا اور اس نے پلٹ کے سیورین کو ہدایت کی کہ وہ بھُل کو دوبارہ لٹا دے۔
سیورین نے پہیا گھما کے بستر کا سرہانا نیچے کر دیا۔
ڈاکٹر رائے پھر میری طرف متوجہ ہوا اور اچٹتی آواز میں بولا۔ ''کہاں تھے تم اتنی دیر سے؟''
''کہیں نہیں، یہیں اسپتال میں۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسے ہی اسپتال کا ایک چکر لگا کے آ گیا...... کیا حال ہے اب ان کا ڈاکٹر صاحب؟''
''تم نہیں دیکھ رہے؟'' وہ مسکرا کر بولا۔
''مجھے تو...... مجھے تو......'' میں نے بے ربطی سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب آپ فرشتہ آدمی ہیں۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ میں......''
''تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔'' وہ میری بات کاٹ کے بولا۔
''آپ کو معلوم نہیں، میں...... میں کس قدر......''
اس نے پھر مجھے کچھ کہنے نہیں دیا۔ ''دیکھ رہا ہوں تمہیں اچھی طرح اچھے لڑکے۔''
اس نے عادت کے مطابق میری کمر تھپکی۔
''رات کو آؤں گا پھر...... اور سنو! تمہیں پہلے سے بہتر دیکھنا چاہتا ہوں ورنہ تمہیں بھی انجکشن لگانا پڑے گا۔''
''ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب! آپ کچھ دیر بیٹھیے نا۔'' میں نے وارفتگی سے کہا۔
''نہیں، مجھے جانا ہے، اسپتال میں سب سہمے ہوئے ہیں، مجھے معمول سے زیادہ وقت دینا پڑ رہا ہے اور انتھونی! اس نوجوان کے گھر بھی جانا ہے۔ سنا ہے، اس کی بیوی ٹھیک نہیں ہے، وہ حاملہ ہے، دیکھتے ہیں، اسے شاید اسپتال میں داخل کرنا پڑے۔ بے چارہ انتھونی۔'' ڈاکٹر رائے افسردگی سے بولا۔ ''تم نہیں جانتے، وہ کتنا پیارا لڑکا تھا۔''
مجھ سے سر اٹھایا نہیں گیا۔ ڈاکٹر رائے اپنے نوجوان ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔
اس کے جاتے ہی سیورین کسی موج کی طرح میری طرف لپکی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، شگفتہ آواز میں مبارک باد دینے لگی۔ مجھے نہ جانے کیا ہوا، اپنا اختیار ہی نہیں رہا۔ میں نے بڑھ کے ہاتھ پھیلائے اور اسے گلے سے لگا لیا۔ دوسرے ہی لمحے سیورین کی کسمساہٹ سے مجھے احساس ہوا۔ میرے بازو اینٹھنے لگے اور میں فوراً اس سے جدا ہو کے پیچھے ہٹ گیا۔
سیورین کے چہرے پر اچانک آگ سی بھڑک اٹھی تھی اور اس کا دھان پان سراپا لہرا گیا تھا۔ مجھے بڑی خفت ہوئی اور سلیقے سے معافی بھی نہ مانگی جا سکی۔
وہ ایک اعلاظرف لڑکی تھی، مسکرا کر رہ گئی اور مجھے ندامت سے بچانے کے لیے کہنے لگی۔ ''کیا خیال ہے، گرما گرم کافی پی جائے؟''
میں نے کسی پاگل کی طرح بے تابانہ سر ہلا کے اقرار کیا۔
نرس امی وقت پر آ گئی تھی۔ سیورین چلی گئی، امی کی آمد کے خاصی دیر بعد بھُل کے دن بھر کے احوال، ڈاکٹروں کی آمد اور ہدایات، دواؤں کی تبدیلی سے آگاہ کرنے کے بعد۔ چلتے وقت اس نے مجھ شرمسار کو خدا حافظ کہا اور اپنا خیال رکھنے کی رسمی نصیحت بھی کی۔ میں خالی بیٹھا تھا، اسے صدر دروازے تک پہنچانے کا خیال آیا تھا لیکن میرے قدم کسی نے روک لیے۔
آٹھ بجے، رات پوری طرح کھل چکی تھی۔ امی جھٹ پٹ اپنے کاموں سے نمٹ کے میرے پاس آ کے بیٹھ گئی اور نکیلی آواز میں بولی۔ ''کیا حال ہے

اب؟''
میرا حال کیا، میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کیا ہوا ہے۔'' میں نے بھُل کی طرف ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ''حال تو ان صاحب کا دیکھو، ان سے پوچھو۔''
''تمہارا حال اس سے بندھا ہوا ہے۔'' وہ چہک کے بولی۔ ''تم دونوں ہم زاد ہو نا۔''
''تو پھر پوچھتی کیوں ہو۔'' میں نے مصنوعی ترشی سے کہا۔
''میں نے سارا کچھ دیکھ لیا اور سیورین نے مجھے بتایا ہے، سب ٹھیک چل رہا ہے۔'' امی محتاط انداز میں باتیں کرتی تھی، کہنے لگی۔ ''اب اور بہتری کی امید کی جا سکتی ہے۔''
''شکر ہے، تم بھی پرامید ہو۔'' میں نے مسکرا کے کہا۔
''تم نے ایسا کیوں کہا۔'' اس کی تیوری پر بل آ گئے۔ ''تم سے میں نے کہا تھا، میں ہمیشہ پرامید رہتی ہوں۔''
''مگر اظہار میں خاصی کنجوس ہو۔'' میں نے ازراہ لطف کہا۔
''اوہ...... اوہ، تم شرارتی بچے۔ اب تم کیسی بدلی بدلی باتیں کر رہے ہو۔'' وہ میرے شانے پر آہستہ سے مکا مارتے ہوئے بولی اور اچانک سنجیدہ ہو گئی، کہنے لگی۔ ''معلوم ہے، دن بھر میں پریشان رہی ہوں۔ رات کا واقعہ کیسا ہولناک تھا۔ دن بھر تمہارا خیال رہا، پھر تم کسی مصیبت میں نہ گھر جاؤ۔ آتے ہی میں نے سیورین سے خیریت دریافت کی۔ اس نے ایسا ویسا کچھ نہیں کہا تو سکون آیا۔ تم بتاؤ، پھر کوئی ادھر آیا تو نہیں؟''
''ابھی تک تو نہیں، اسپتال میں پولیس بیٹھی ہوئی ہے اور خاک چھان رہی ہے۔'' میں نے تندی سے کہا۔
''تمہارے پاس تو نہیں آئے وہ؟'' امی نے فکرمندی سے تکرار کی۔
''نہیں آئے تو آ جائیں گے۔ اس طرف، ان خاص کمروں کی طرف رخ کرتے ہوئے ان کے قدم اکڑتے ہوں گے۔''
''تم نے سیورین کو تو کچھ نہیں بتایا؟''
''اسے کیوں پریشان کرتا، وہ تو تمہاری وحشت دور کرنے کے لیے تمہیں سارا ماجرا بتانا پڑا۔''
''تم نے اچھا کیا ورنہ کیسے کیسے وسوسوں، وہم و گمان میں گھری رہتی۔ امی کو جھرجھری آ گئی۔
''دن بھر سوچتی رہی، اگر مجھ سے غلطی ہو جاتی، دروازہ کھول دیتی میں؟''
''نہیں کھولتیں تم۔''
''اتنے یقین سے تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''
''چوں کہ میں جاگ رہا تھا۔''
''اور اگر دروازہ کھلا ہوتا؟''
''وہ ایسے اندر نہیں آ جاتے، پہلے پوچھتے ضرور۔ ان کی نیت مجرمانہ تھی۔ ایسی صورت میں پھونک پھونک کے قدم اٹھایا جاتا ہے۔''
''لیکن...... لیکن......'' امی کی آواز پر خوف غالب تھا۔ ''بس خداوند نے کرم کیا، میں تو یہی کہتی ہوں۔'' اس نے سینے پر کراس بنایا۔
''چھوڑو بھی اب، کچھ مت سوچو۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔ ''آگے کی طرف دیکھو۔''
''آگے کی طرف!'' امی کا چہرہ اور گمبھیر ہو گیا۔ ''آگے کا ہی تو سوچ سوچ کے دل ہولتا ہے۔''
''اور کیا اختیار ہے ہمارا آگے پر؟''
''ظاہر ہے، نہیں ہے۔'' امی اضطراری انداز میں بولی۔ ''تو فکر کاہے کی، ہم اپنی طرف سے احتیاط کی پوری کوشش کریں گے۔ یہی کر سکتے ہیں۔''
''تم بہادر بچے ہو۔''

''بہادر وہادر کیا۔ ہتھیلی پر جان تو یوں بھی ہر ایک کی رہتی ہے، میری تمہاری، سبھی کی۔ تمہیں یقین ہے کہ کل تم موجود رہوگی؟''

اس کی آنکھیں بجھ گئیں۔

''تو پھر کیا......'' میں نے بے زاری سے کہا۔

وہ چپ ہوگئی اور دیر تک چپ رہی، پھر اس نے خود کو مجتمع کیا کہ سردست تو زندگی حاوی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک بحال ہوئی اور وہ پختہ کار عورتوں کی طرح ترچھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ تم نے سیورین پر کیا جادو کر دیا؟''

''کیسا جادو؟'' میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

''خبر ہے، وہ کیا کہہ کے گئی ہے۔ کہہ رہی تھی، یہاں دو مریض ہیں۔ حکم دے کے گئی ہیں کہ مجھے دونوں کا خیال رکھنا ہے۔ دونوں پر نگاہ رکھنی ہے، اور بتاؤں کیا کہہ رہی تھی وہ......!'' ایمی کہتے کہتے رک گئی۔

''کیا کہہ رہی تھی؟ میری شکایت کر رہی ہوگی، مجھ سے بھول ہوگئی۔'' میں نے پشیمانی سے کہا۔

''کیسی بھول؟'' اس نے چونک کے پوچھا۔

میں کیا کہتا۔ اس کا مطلب تھا کہ سیورین نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میں چپ رہا کہ خاموشی ہی سب سے موثر جواب تھی۔

''کیا بتلاؤں، کہہ رہی تھی کہ تم بہت الگ لڑکے ہو، بہت پیارے اور دل کے بڑے۔ وہ کسی کے بارے میں ایسی رائے کم دیتی ہے۔ کافی عرصے سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ بہت سنبھلی ہوئی رہتی ہے وہ۔''

''وہ ایک مہربان لڑکی ہے...... سمجھ دار، ہر اعتبار سے اچھی۔''

''اور میں! میں بری لڑکی ہوں؟'' وہ ہنس کے بولی۔

''تم......!'' مجھے بھی ہنسی آگئی۔ ''تم ایک بہت پیاری بچی ہو، گڑیا جیسی۔''

اسی وقت دروازے پر اکبر علی خاں نمودار ہوئے۔ کسی لمحے بھی میں ان کی آمد کی توقع کر رہا تھا۔ آتے ہی انہوں نے جیسے نعرہ بلند کیا۔ ''مجھے یقین ہے، کچھ اچھی خبریں سننے کو ملیں گی۔''

میں صوفے سے اٹھ گیا اور لپک کے ان کے پاس جا کے میں نے ان کے ہاتھ جکڑ لیے۔ اور جلدی جلدی ساری روداد سنائی کہ ابھی شام کو ڈاکٹر آیا تھا تو اتنے دنوں میں پہلی بار بٹھل اٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کچھ مشروب وغیرہ بھی نوش کیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے میری آواز ڈگمگا گئی۔ اکبر علی خاں نے مجھے بازوؤں میں بھر لیا اور میرا حوصلہ فزوں کرنے کے لیے طرح طرح کے لفظ وضع کرتے رہے۔ اکبر علی خاں کے ساتھ ان کا ملازم لڑکا بھی ٹفن اٹھائے ساتھ آیا تھا۔

''آنے میں ذرا یوں ہوئی کہ امی جان کی طبیعت شام کو کچھ بہتر ہوگئی۔'' اکبر علی خاں کی آواز سے مسرت جھلک رہی تھی۔

''یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی آپ نے۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔

''بس بٹھا لیا پاس اپنے۔ میں بھی منتظر تھا کہ کسی طرح ان کی طبیعت کچھ بہتر ہو تو ایک معاملے میں ان کا عندیہ معلوم کروں۔''

''کیسا عندیہ؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

ایمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''بتاؤں گا، میرا خیال ہے، کھانا گرم ہے کیوں نہ پہلے ٹفن کشائی کی جائے......اور آپ اطمینان رکھیں، آج زیادہ کھانا نہیں ہے۔ نزہت کہہ رہی تھیں، سارا تو واپس آجاتا ہے۔''

''آپ یہ زحمت کیوں کرتے ہیں۔''

''واہ صاحب، آپ نے پھر وہی غیریت والی بات کر دی۔ ایسا مت کہیے، دل بوجھل ہو جاتا ہے۔''

میں نے معافی چاہی اور عذر کیا کہ گھر میں

والدہ کی بیماری کی حالت میں یہ تکلفات مناسب نہیں لگتے۔ یہاں اسپتال میں کھانے پینے کے اچھے انتظامات ہیں۔

''ہوا کریں لیکن گھر موجود ہوتے ہوئے آپ باہر کا کھانا کھائیں خواہ کتنا ہی اچھا ہو۔ کم از کم مجھے گوارا نہیں ہے۔''

میرے پاس سر جھکانے کے سوا کیا رہ جاتا تھا۔

''دوپہر آپ نے سادہ میٹھے چاولوں سے رغبت کا ذکر کیا تھا۔ میں نے نزہت سے کہا۔ ان سے بس کہنے کی دیر ہوتی ہے......شاید آپ کو پسند آئیں۔''

مجھ سے غلطی ہوئی دوپہر کسی وقت ایسے ہی میٹھے چاولوں کی بات میرے منہ سے نکل گئی تھی۔

''آپ جانیں، نزہت اختراعات کی ماہر ہیں، سادہ چاولوں میں زعفران کی آمیزش کر دی ہے۔ شکر پسند ہو تو شکر کے ساتھ، ورنہ شہد بھی ہے۔ دودھ اور بالائی تو ہے ہی ایک چمچہ لیا تھا میں نے۔ واقعی، شہد اور بالائی کے ساتھ ذائقہ ہی کچھ اور نکھر آیا۔''

''پھر تو خاصے کی چیز ہوگی لیکن ڈاکٹر رائے نے کہا تھا، رات کو بھی آئیں گے۔ ان کے آنے کے بعد ہی اگر......''

''کوئی مضائقہ نہیں۔'' وہ کشادہ دلی سے بولے۔ ''اصل میں لڑکا، رات کو اپنے گھر واپس چلا جاتا ہے، اسے واپس بھیج دیتے ہیں۔ یہ ٹفن میں لے جاؤں گا۔''

''آپ کیوں لے جائیں گے، ٹفن صبح بھی واپس جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

ایمی بٹھل کے بستر کے نزدیک چیزوں کی درستی میں مصروف ہوگئی تھی۔ اس نے کچھ دیر کے لیے ہم سے باہر جانے کی درخواست کی۔ یہ معمول کی بات تھی۔ میں اور اکبر علی خاں باہر آگئے۔ ایمی نے کمرا بند کر کے دروازے پر پردہ کھینچ دیا۔ ہم دونوں راہ داری میں ٹہلتے رہے اور اکبر علی خاں شہر کے کشیدہ

حالات کے بارے میں بتانے لگے۔ ''شہر پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ جانے کیوں لوگ سہمے سہمے سے نظر آتے ہیں یا یہ میرا گمان ہے۔'' انہوں نے بھاری آواز میں کہا۔ ''میں ہی شاید کچھ زیادہ محسوس کر رہا ہوں، شاید اس وجہ سے کہ شہر میں جگہ جگہ پولیس کی ٹولیاں گھوم رہی ہیں۔ بازار بھی آج جلد بند ہوگئے۔ قسم قسم کی چہ میگوئیاں شہر میں گشت کر رہی ہیں۔ شہر میں عموماً ایسا کچھ ہوتا نہیں، قتل وخون کے واقعات بے شک کبھی کبھار ہو جاتے ہیں لیکن اس بار لوگ کچھ ہراساں سے، حیرت زدہ سے نظر آتے ہیں۔ انتھونی کی موت کا بڑا شہرہ ہے۔ شہر میں عیسائیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے لیکن یہ نوجوان انتھونی کچھ زیادہ ہی مقبول تھا۔ کچھ اس کی مقبولیت، کچھ اس کی جاں بازی، اس کی دردناک موت کی نوعیت سے لوگوں کو بڑی ہم دردی محسوس ہوئی۔ سنا ہے، اس کے جنازے میں سبھی شریک تھے، کیا ہندو، عیسائی اور کیا مسلمان۔ افواہوں کا تو آپ جانتے ہی ہیں، پر لگے ہوتے ہیں اور سر پیر نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں افواہ طرازی سب سے مرغوب مشغلہ ہے۔ ناواقفیت، جہالت اور افواہ کا شاید کوئی گہرا تعلق ہے۔''

میں سنتا رہا۔ جب تک ایمی نے باہر آ کے ہمیں اجازت نہ دی، ہم راہ داری میں گھومتے رہے۔ کمرے میں آ کے صوفے پر بیٹھے ہی تھے کہ باہر ہل چل ہوئی ہم دونوں کھڑے ہوگئے۔ ایمی بھی سیدھی ہوگئی۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی تھے۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ادھیڑ عمر ڈاکٹر گوکھلے بھی تھا۔ اسپتال میں پہلی رات میری اس سے اچھی شناسائی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر رائے نے پرتپاک انداز میں اکبر علی خاں سے مصافحہ کیا۔ جواباً اکبر علی خاں نے میری جانب سے بٹھل پر اس کی خاص توجہ کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر رائے ہنس کے بولا، الٹا وہ اکبر علی خاں کا شکر گزار ہے کہ اس اجنبی شہر میں ان کا ساتھ میرے لیے

استقامت کا باعث بنا رہا۔ دونوں میں چند لمحے نوک جھوک اور خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر رائے نے اکبر علی خاں سے فراغت میں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کی دعوت ایسی رسمی نہیں تھی۔

ڈاکٹر رائے نے بٹھل کا شانہ جھنجوڑ کے اسے بیدار کیا۔ بٹھل کسی قدر راکراہ کے بعد گو کھلے اور ایمی کے سہارے اٹھ کے بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر رائے نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور گرم جوشی سے حال دریافت کیا تو بٹھل نے سر کی ہلکی جنبش سے جواب دیا۔ اس نے بدبداتے ہوئے کچھ کہا بھی۔ یہ دیکھ کے میں اور اکبر علی خاں اس کے بستر کے پاس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر کے خیال سے ہم نے فاصلہ رکھا۔ میں بٹھل سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس بار ڈاکٹر گو کھلے آڑے آ گیا۔ بٹھل نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے آنکھیں بند کر کے اس نے مجھے صبر وضبط کی تاکید کی ہے۔

ڈاکٹر رائے کے اشارے کے لیے تیار کھڑی ایمی نے بٹھل کا سینہ رومال سے ڈھانپ دیا اور بستر کے پہلو میں رکھی کھلی الماری سے پیالہ اٹھا کے چمچہ بھر بھر کے اسے کوئی چیز پلانے لگی۔ مجھے تو گو کھلے نے وہاں سے ہٹا دیا۔ اکبر علی خاں نے بھی گو کھلے کا ساتھ دیا، میری کمر سہلاتے ہوئے وہ مجھے بٹھل کے بستر سے دور لے آئے۔

سب توازن کی بات ہے۔ ایک ذرا توازن منتشر ہو جائے تو آدمی کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ آدمی بچہ ہو جاتا ہے، آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے، آدمی معذور ہو جاتا ہے، آدھا آدمی، پونا آدمی، دیکھنے کا آدمی۔ آدمی ہے اور آدمی نہیں بھی۔ آدمی کا اپنا اختیار نہ رہے تو پھر آدمی ہی کیا ہے۔ بیماری سے بڑی مفاہمت شاید کوئی نہیں ہے۔ کہتے ہیں، سب سے بڑی ذلت غربت ہے لیکن یہ بیماری بھی کچھ کم ذلت نہیں۔ اور ایسی بیماری کہ آدمی بے دست وپا ہو کے رہ جائے۔ آدمی کی اس سے بڑی توہین کیا ہو سکتی ہے۔ بٹھل کو کیا محسوس ہو رہا ہوگا، یہ کچھ وہی جانتا ہوگا۔

''آج رات گہری نیند لینے کا ہے، سمجھا کچھ؟''

میرے کانوں میں ڈاکٹر رائے کی آواز آئی۔ وہ حاکمانہ انداز میں بٹھل سے مخاطب تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کل سے دوائیاں کچھ بدل دی جائیں گی اور کچھ کم بھی کر دی جائیں گی۔ اب بٹھل کو آہستہ آہستہ غذا کی طرف لوٹنا ہے کیوں کہ غذا سے بڑی توانائی کوئی نہیں ہوتی۔ زیادہ سوچنا نہیں، وہ خاطر جمع رکھے کہ اس کا محبوب بھائی ہر وقت اس کے پاس ہے۔ یہ شہر کا بہترین اسپتال ہے۔ اسپتال کی تجربہ کار نرسیں اس کی خدمت پر مامور ہیں اور ماہر ڈاکٹر بھی دور نہیں ہیں۔ ڈاکٹر رائے نے مسکراتے ہوئے کہا کہ بٹھل کی بیماری کے دوران دنیا میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور اس کی صحت یابی تک وہ اپنے محور سے ہٹ نہیں جائے گی۔ ادھورے کام آنے والے کل پورے ہو جائیں گے۔ زندگی کے سارے معاملات تن درستی سے مشروط ہیں۔ ڈاکٹر رائے نے وہی کچھ کہا جو کل رات ہم، میں اور اکبر علی خاں باتیں کر رہے تھے کہ زندگی سے موت کا فاصلہ بہت قریب ہوتا ہے۔ موت ہر لمحے وار کرتی رہتی ہے اور یہ کیا کم ہے کہ بٹھل زندگی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

بٹھل نے منہ پھیر لیا تو ایمی نے بھی ہاتھ روک لیا اس دوران ڈاکٹر رائے مسلسل بٹھل سے مخاطب رہا اور ایسے ایسے کلمات تراشتا رہا جو بظاہر دواؤں سے زیادہ جاں فزا تھے۔ اس کی ہدایت پر ایمی نے بٹھل کے بازو میں سوئی گھونپ دی اور ڈاکٹر رائے اس وقت تک ٹھہرا رہا جب تک ایمی نے بٹھل کا...... سرہانا نیچے نہیں کر دیا اور بٹھل کی آنکھیں مندیا نے نہ لگیں۔ پھر وہ ایک لمحے بھی وہاں نہیں ٹھہرا۔ اکبر علی خاں نے ازراہِ وضع اسے کھانے میں شرکت کی دعوت دی۔ ڈاکٹر نے شکریہ ادا کر کے معذرت

چاہی کہ اسے ابھی آں جہانی انتھونی کی بیوی شیری کو دیکھنے جانا ہے۔ اس کی حالت نہایت شکستہ ہے۔

ڈاکٹروں کی زندگی بھی کیا زندگی ہوتی ہے۔ انہوں نے مسیحائی کا جیسے ٹھیکا لیا ہوتا ہے۔ آندھی ہو یا طوفان، مریض دہائیاں دیتے ہیں، فرض اور انسانیت کا واسطہ دیتے ہیں، ڈاکٹروں کو آنا پڑتا ہے، ڈاکٹر بھی دوسرے جیسے پیشہ ور ہوتے ہیں مگر کسی پیشے میں ایسا جبر نہیں ہوتا یا ایسی مجبوری نہیں ہوتی یا ایسا استحقاق جتایا نہیں جاتا۔

ڈاکٹر رائے کے جاتے ہی اکبر علی خاں نے ٹفن کھول دیا۔ ایمی نے کسی وارڈ بوائے کو بلا کے رکابیاں وغیرہ میز پر رکھوانے کا اہتمام کیا۔ کھانا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وارڈ بوائے کھانا گرم کر لایا۔ میں نے اسے کچھ روپے کی بھینٹ کی تو اس نے صاف انکار کر دیا مگر ایمی کی سفارش پر آمادہ ہو گیا۔ پھر تو اس کا انداز ہی بدل گیا۔ پیسے کی کیا کرامت ہوتی ہے۔ آدمی موم بن جاتا ہے، آدمی بجلی بن جاتا ہے، آدمی دہرا ہو جاتا ہے۔ ایمی گھر سے کھانا کھا کے آئی تھی۔ اکبر علی خاں کے اصرار پر ساتھ بیٹھ گئی اور دوپہر جس طرح سیورین پر حیرت طاری ہوئی تھی، ایمی بھی چند لقموں کے بعد تکلف کی متحمل نہ ہو سکی۔

اکبر علی خاں کا ملازم لڑکا کب کا جا چکا تھا۔ دس بج چکے تھے۔ ان کے بہ قول شہر کے حالات کشیدہ تھے، میں نے ان سے کہا بھی کہ اب وہ گھر چلے جائیں، رات بہت ہو گئی ہے، کچھ وقت راستے میں لگے گا لیکن وہ نہیں مانے، کہنے لگے۔ ''نزہت سے کہہ کے چلا تھا، دیر ہو سکتی ہے۔''

ایمی نے ان کے لیے کافی منگوائی اور باہر سبزہ زار میں کرسیاں لگوا دیں۔ سبزہ زار میں خوش گوار خنکی تھی۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ رات کی رانی کی مہک سبزہ زار میں کھلی ہوئی تھی۔ اکبر علی خاں گہری گہری سانسیں لے کر تازہ خوشبو دار ہوا سینے میں بھرنے لگے۔ ایمی نے کافی بنائی۔ کافی بنا کے وہ کمرے میں چلی گئی تو اکبر علی خاں کسمساتے ہوئے بولے۔ ''اب آپ نے کیا سوچا ہے۔ آگے سفر کریں گے یا......'' وہ رک گئے اور میری شکل دیکھنے لگے۔

''ابھی کچھ طے نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے گھر واپس چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔ آگے سفر کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔''

''ہاں مناسب تو یہی معلوم ہوتا ہے۔'' انہوں نے تائید کی۔ ''لیکن میری بات مانیں تو کچھ عرض کروں۔''

''ضرور، ضرور۔'' میں نے کہا۔

''بھائی صاحب کی طبیعت بحال ہو جائے تو سفر کرنے کے بجائے کیوں نہ کچھ دنوں کے لیے غریب خانے پر قیام کریں۔ یہ میری خواہش بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں، کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ آپ کو گھر جیسا آرام ملے گا، ظاہر ہے، احتیاطاً کچھ عرصے اسپتال سے قریب ہی رہنا چاہیے۔ گھر میں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔''

''آپ کی محبت اور مہربانی۔'' میں نے جھجک کے کہا۔ ''دیکھتے ہیں بھائی صاحب کی مرضی کیا ہے۔''

''ہاں، ہاں، بے شک، بے شک۔''

''آج رات یا کل صبح کلکتے سے ضرور کوئی آ جائے گا۔ تار سے وہ کھٹک تو گئے ہوں گے لیکن شاید بٹھل بھائی یا میری طبیعت کے بارے میں ان کے ذہن میں کچھ نہ آئے۔''

''یہ کون لوگ ہیں؟ آپ کے عزیز یا دوست؟''

''کیا کہوں، اس سوال کا جواب مشکل ہے۔'' میں نے کسمسا کے کہا۔ ''وہ عزیزوں اور دوستوں سے کہیں بڑھ کے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''کیا بتاؤں آپ کو۔''

"کچھ تو...... اگر مناسب ہو۔"

"پھر بھی......" میں نے بے چارگی سے کہا۔

ان کی آنکھوں میں حیرت ہویدا ہوئی اور انہوں نے حجت نہیں کی، کہنے لگے۔ "بہر حال......"

"آپ کیا کہنا چاہتے تھے۔" میں نے ان کا دھیان بٹانے کے لیے کہا۔ "آتے وقت آپ نے کہا تھا، آپ بعد میں کچھ بتائیں گے۔" خیر تو ہے؟

"ہاں ......" ان کا لہجہ بدل گیا، اداسی سے بولے۔ "آپ سے ایک ذاتی کچھ گھریلو قسم کے معاملے میں بات کرنا تھی۔ کچھ عجب سی کشمکش ہے۔"

"کیا بات ہے؟ مجھے بتائیے۔"

"دو ایک دن کی ملاقات میں جانے کیا کرشمہ ہوا۔ سچ تو یہ ہے، مجھے آپ سے کوئی غیریت محسوس نہیں ہوتی۔ اتفاق سے کل ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ بات تو دنوں سے چل رہی تھی لیکن کل ان کا تقاضا آ گیا۔" وہ چپ ہو گئے جیسے کھو سے گئے ہوں۔

"کیا تقاضا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

ان کا چہرہ بھاری ہو گیا۔ آواز بھی۔ انہوں نے بتایا کہ بھوپال کے ایک صاحبِ حیثیت اور با اثر نواب خاصے عرصے سے پٹنے میں مقیم تھے۔ کسی تقریب میں نواب کے خاندان والوں نے ان کی بڑی بیٹی سطوت کو دیکھ لیا تھا۔ نواب نے اپنے بیٹے کا رشتہ مانگ لیا۔ ادھر حیدر آباد میں مقیم ان کے بڑے بھائی بھی اپنی بھتیجی کو بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں۔ بڑے بھائی کے بیٹے کو انہوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہے۔ برس گزرے، وہ حیدر آباد گئے تو بھتیجا تعلیمی سلسلے میں علی گڑھ تھا۔ کہنے لگے کہ انہیں بھتیجے کے مزاج اور عادت اطوار کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔ بڑے بھائی بھی اب غیروں کی طرح ہیں۔ وقت گزر جاتا ہے، ملاقات نہیں ہو پاتی۔ وہ ادھر آتے نہیں اور اکبر علی خاں کا بھی جانا نہیں ہوتا۔ ان کی والدہ کچھ وقت کے لیے بڑے بیٹے کے پاس حیدر آباد گئی تھیں۔ جی نہیں لگا تو جلد ہی واپس پٹنے آ گئیں۔

وہ اپنے گھر کے اتنے ذاتی معاملے پر مجھ تازہ شناسا سے بات کر رہے تھے۔ مجھے سوچ سمجھ کے کوئی ذمہ دارانہ مشورہ دینا چاہیے تھا۔ میں نے دبی آواز میں پوچھا۔ "تو آپ کے خیال میں کہیں اور رشتہ منظور کر لینے سے بھائی صاحب ناراض ہو سکتے ہیں؟"

"یہ ممکن ہے، حالاں کہ بھتیجے کا حال احوال دیکھے بھالے بغیر، چاہے وہ کتنا ہی اپنا خون کیوں نہ ہو، مجھے رشتہ کسی طور منظور نہیں ہے۔ اور یہ... بھائی صاحب کی خواہش ہے، ضروری نہیں کہ ان کے فرزند بھی آمادہ ہوں۔"

"تو اس میں ایسی الجھن کیا ہے۔" میں نے شائستگی سے کہا۔ "آپ پہلے بڑے بھائی صاحب کو ترجیح دیجیے کیوں کہ بہر حال وہ آپ کے بھائی ہیں۔ حیدر آباد جا کے بھتیجے کے طور اطوار سے تسلی کر لیجیے۔ تشفی نہ ہو تو پھر نواب صاحب کے رشتے پر غور کیجیے۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے میاں!" وہ مایوسی سے بولے۔ "میں نے آپ کو پوری بات ابھی کہاں بتائی ہے۔ صرف اتنا تو نہیں ہے، دو جگہ سے لڑکی کے رشتے آئے اور کسی ایک کو منظور کر لیا یا مسترد کر دیا، مسئلہ تو اپنے گھر کا بھی ہے۔"

"اپنے گھر کا؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

"بھائی! فریق تو ہم دونوں ہیں۔ ہمیں خود کو بھی تو دیکھنا ہے۔ اپنے گھر، گھر کے مزاج، اپنی بیٹی کی پسند ناپسند، رجحان طبع وغیرہ کو۔ میری بیٹی سطوت عام لڑکیوں سے الگ ایک لڑکی ہے بلکہ ہمارا سارا گھر ہی، ہزاروں لاکھوں، بہت سوں سے مختلف گھر ہے۔ اور یہ سطوت، یہ تو بڑی ذہین اور حساس بچی ہے۔ معلوم ہے، ہمیشہ اول آتی رہتی ہے۔ اس سے بات کر کے دیکھو، لگتا ہے، کوئی ہیروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہے کچھ، نظر کچھ اور آتی ہے۔ ایسی کچی عمر میں اتنی گہری باتیں...... اور بتاؤں آپ کو، وہ بڑی سریلی ہے۔ میں نے اس کے ہاں سر کی ایسی فراوانی، قوت اور لگن دیکھی ہے کہ خدا کی پناہ...... اس کا ذوق و شوق دیکھ کے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کے لیے ایک استاد کا بندوبست کر دیا تھا۔ کمرا بند کر کے، آس پاس میں سرکاز ہر رسانہ ہو سکے، ایک سنگیت سمراٹ اسے تربیت دیتا رہا مگر روز اس کے گھر آنے جانے سے محلے والے کھٹک گئے۔ انہوں نے جستجو..... شروع کر دی۔ یہ ملازم وغیرہ بھی اچھے خاصے غیبت گو ہوتے ہیں۔ خبر پھیل گئی کہ اکبر علی خاں کی بیٹی موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ ایک ہندو پنڈت روزانہ آتا ہے۔ بس صاحب، لاکھ عذر پیش کیے، ایک ہنگامہ ہو گیا۔ استاد کا سلسلہ فوراً بند کر دیا۔ کیا بتاؤں، موسیقی کا شوق کیا ہوا، زندگی اجیرن ہو گئی۔ کیا موسیقی سے رغبت ایسی بری بات ہے؟"

"جو برا سمجھتے ہیں، ان کے لیے تو برا ہی ہوتا ہے۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

"آپ نے بالکل سچ کہا۔ یہی بات تو نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ رہنا تو ہمیں اپنے محلے اور انہی لوگوں کے درمیان تھا۔ بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ معاملہ دب گیا۔ جیسے واقعی یہ کوئی غیر معمولی مسئلہ تھا۔ آدمی کو یہاں انفرادی آزادی نہیں ہے۔ ہم اپنی پسند، اپنی مرضی کی زندگی نہیں گزار سکتے۔"

"شاید کہیں بھی نہیں۔" میں نے زیر لبی سے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ بے قرار سے ہو گئے۔ "بے شک، کہیں بھی نہیں لیکن اتنا اور ایسا بھی نہیں ہوتا۔ ولایت میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ وہاں بڑی انفرادی آزادی ہے لیکن مادر پدر نہیں۔ وہاں بھی اپنی روایتیں ہیں اور گورا تو بڑا روایت پرست، قدامت پسند ہوتا ہے لیکن یہ روایتیں آدمی کو اتنا مجبور نہیں کرتیں، اپنی فکر، اپنی رائے، اپنی طرز کی زندگی کی رعایت۔ وہاں ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایسی توجہ نہیں دی جاتی۔ وہ لوگ کام کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ایک دنیا پر ان کی حکم رانی ہے۔"

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" میں نے انہیں ٹوکا۔ وہ باتوں باتوں میں بہت دور نکل گئے تھے۔

"معاف کرنا میاں! اتنی باتیں بھری ہوئی ہیں دماغ میں، کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ آئی ایم ساری۔" وہ پشیمانی سے بولے۔ "آپ نے اچھا کیا، مجھے ٹوک دیا۔ میں کہہ رہا تھا، ابھی تو سطوت تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ یہ رشتے وغیرہ کی بات تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد ہی مناسب ہو گی۔ لیکن ایک مسئلہ اور بھی ہے۔" وہ پژمردگی سے بولے۔

کوئی سوال کرنے کے بجائے میں خاموش رہا۔

کچھ توقف کے بعد وہ خود ہی بولے۔ "اصل میں خوش شکل بچیوں کے رشتے، آپ جانتے ہیں، ان کے رشتوں کی کمی نہیں مگر ہمارے گھر کے معاملے میں ایسی صورت حال نہیں ہے۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھیے کچھ عجب معاملہ ہے میں نے آپ سے کہا نا کہ ہمارا گھر اپنی خاص بود و باش بلکہ اپنی فکر، سوچنے کے انداز سے اجنبی ہو گیا ہے۔ خاندان برادری والے ہم سے ملنے میں کتراتے ہیں۔ کچھ آزاد خیال سمجھتے ہیں، کچھ کو ہمارے طور طریقے پسند نہیں، میری اور نزہت کی تعلیم، ولایت میں ہمارا قیام، بے پردگی وغیرہ۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ان کے درمیان رہتے ہوئے بھی ہم ان سے دور ہو گئے ہیں۔ بس ایک رسمی سا تعلق رہ گیا ہے۔ اور بات یہ ہے، ہمیں بھی یہ لوگ پسند نہیں۔ ایک تو ان

کی طرف سے کوئی رشتہ آنے سے رہا، دوسرے ہم خود بھی نہیں چاہتے کہ ان کی طرف سے ایسا سلسلہ جنبانی ہو۔ ایسے لوگوں میں بیٹی بیاہی جائے؟ ان گھروں میں تو بچی گھٹ کے رہ جائے گی۔ سطوت کا اپنا ایک وجود ہے، شادی، مرد کی حکم رانی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ کیا ہے۔ شادی کے بعد ایک عورت پر مرد کا تسلط ہو جائے۔ نکاح کے دو بولوں سے عورت کا ثابت و سالم وجود کسی ایک مرد کی قلم رو میں شامل ہو جائے یا اس کے زیرنگیں ہو جائے۔ نہیں صاحب، ہمیں قبول نہیں۔'' اکبر علی خاں کی آواز تمتما گئی، کہنے لگے۔ ''یہ تو آپس میں محبت باٹنے، دکھ سکھ میں ساتھ رہنے، ایک دوسرے کا خیال رکھنے، ایک کو دوسرے کی جائز خواہشوں، رغبتوں کو آواز دینے کا تعلق ہے۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ شادی کی تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجنی چاہیے۔''

''مگر کوئی بھی گھر ہو، بالکل آپ جیسا تو نہیں ہوگا۔ دوسرا گھر تو دوسرا ہی ہوتا ہے۔ لڑکیوں کو نئے گھر سے مفاہمت تو کرنی پڑتی ہے۔'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''صرف لڑکی ہی کیوں؟ لڑکے اور اس کے گھر والوں کو بھی گھر میں نو وارد لڑکی کے مزاج اور مرضی کا لحاظ رکھنا چاہیے۔'' ان کے لہجے میں ترشی آ گئی پھر اداسی سے بولے۔ ''اصل میں کچھ غلطی ہماری بھی ہے۔ جہاں سارے پڑھے لکھے ہوں، وہاں ایک جاہل، بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جہاں سارے جاہل ہوں، وہاں ایک پڑھا لکھا عجوبہ بن جاتا ہے۔ سارے امیر ہوں تو ایک غریب خود کو کیسا ناہنجار و نابکار محسوس کرتا ہے۔ سارے غریب ہوں تو ایک امیر اپنے لوگوں سے کٹ جاتا ہے۔ عجب گورکھ دھندا سا ہے۔ شاید ہم اپنے خاندان برادری والوں سے آگے نکل گئے ہیں یا پیچھے رہ گئے ہیں۔ سوچا ہی نہیں کہ گھر میں بچیاں بھی ہیں اور بڑی بھی ہو رہی ہیں اور انہیں مستقل ہمارے ساتھ نہیں رہنا۔ ایک گھر میں لڑکے، لڑکیوں اور خود اپنے لیے الگ الگ روش تو ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔''

''پھر آپ کو اپنی طرح، اپنے ماحول اور لوگوں، میرا مطلب ہے، ایسی جگہ رہنا چاہیے جہاں آپ کے ہم ذوق رہتے ہوں اور اس مغائرت کا احساس نہ ہو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''بے شک، یہی ایک حل تھا اور ہے۔'' انہوں نے کسی قدر جوشیلے انداز میں کہا۔ ''ہم ولایت میں بھی رہ سکتے تھے لیکن گوروں کا رہن سہن ہمیں گوارا نہ ہوا۔ ہم میاں بیوی کو مشرق ہی پسند ہے لیکن جس مخصوص قسم کے مشرقی ماحول میں ہم نے آنکھ کھولی ہے، یہ لوگ تو...... میں کہوں گا، انہوں نے مشرق کو جانا ہی نہیں، سمجھا ہی نہیں۔ مشرق میں تو بہت رنگ ہیں۔ انہوں نے ہماری کشادہ نظری کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا۔ سمجھ رہے ہیں آپ......؟'' وہ الجھے الجھے لہجے میں بولے۔

''جی، جی۔'' میں نے کئی بار سر ہلایا۔

''اسی لیے آپ کے سامنے زبان کھولی ہے۔''

''میرا خیال ہے، اگر آپ اجازت دیں تو کچھ کہوں۔''

''ہاں ہاں، کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔''

''آپ کو سکونت ترک کر کے بمبئی بنگلور جیسے کسی شہر میں بس جانا چاہیے۔ وہاں شاید آپ کو ایسی گھٹن کا احساس نہ ہو۔ یہ ہجرتیں کوئی نئی بات نہیں، مسلسل ہوتی رہتی ہیں، کچھ تو ضرورۃً اور کچھ اپنی مرضی سے بھی۔ عموماً صاحبِ حیثیت اپنی پسند کے گھر، محلے اور شہر منتخب کر لیتے ہیں۔ میرا بہت سے شہروں میں آنا جانا ہوا ہے اور میں نے دیکھا ہے، بڑے شہروں کے تنگ مکانوں کے باوجود لوگ کھلے کھلے رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی تاکا جھانکی نہیں کرتے، غالباً اس لیے بھی کہ انہیں فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن ایک اور بات بھی ہے۔ محلوں اور شہروں سے اتنا نہیں، جتنا ان لوگوں سے فرق پڑتا ہے، جن کے درمیان آپ رہتے ہیں اور یہ لوگ ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ کبھی قسمت سے، کبھی تلاش کر کے۔''

''آپ تو میری زبان بول رہے ہیں میاں۔'' وہ مسکرا کے بولے۔ ''اسی لیے تو میں کہتا ہوں، میرا کوئی ہم نفس، ہم زباں، کوئی بچھڑا ہوا مل گیا ہے۔ یقیناً میاں! ہم کہیں بھی رہ سکتے تھے۔ سال میں دو ایک ماہ یہاں سے اکتا کے، کچھ منہ کا مزاہ بدلنے کے لیے بھی، ہم ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔ لیکن کئی باتیں ہیں جو لوٹ کے یہاں آنا پڑتا ہے۔ یہ میرا آبائی شہر ہے۔ ایک خاص لگاؤ ہونا چاہیے مجھے اس شہر سے، پھر والدہ صاحبہ کا دل کہیں نہیں لگتا۔ یہاں انہوں نے ساری زندگی گزاری ہے۔ بچے یہاں پڑھ رہے ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے تک میں بھی یہیں وکالت کر رہا تھا۔ وکالت پڑھاتا تو اب بھی ہوں۔ نزہت بھی یہیں پڑھاتی ہیں۔ بھائی صاحب تو حیدر آباد جا کے ہر چیز سے بری الذمہ ہو گئے۔ آبائی زمینیں، جائیداد، اور وہ بھی اچھی خاصی۔ سب کچھ یہیں ہے۔ ان کا انتظام، پھر...... کیا بتاؤں آپ کو۔ ابا جان مرحوم کے زمانے سے بہت سے گھرانے ہمارے گھر سے وابستہ ہیں۔ یہ غریب لوگ، زمینوں پر کام کرنے والے اور ہمارے مکانوں میں رہنے والے۔ ان کی شادی بیاہ، تعلیم، خوشی اور غم، یوں سمجھئے، دادا پردادا کے وقت سے ان کی نگہ بانی ہمارا کام ہے۔ گاؤں میں بچوں کی تعلیم کے لیے ہم نے اسکول بھی کھولا ہے۔ نزہت ہر پندرہ بیس دن بعد وہاں جاتی ہیں...... لمبی کہانی ہے میاں...... کبھی اردگرد کے لوگوں کے رویوں سے تنگ آ جاتے ہیں تو باہر نکلنے کی سوچتے ہیں اور یہ زنجیریں...... زنجیریں ہی ہیں میاں، یہ ...... یہ کوئی فیصلہ، حتمی فیصلہ کرنے ہی نہیں دیتیں۔''

میں کیا رائے زنی کرتا، چپ رہا۔

''چھوڑیے ان باتوں کو۔'' وہ مایوسی سے بولے۔ ''سردست تو مسئلہ نواب صاحب کا ہے، انہیں کیا جواب دیا جائے۔ ان کا گھرانا شہر میں بڑا باعزت گھرانا ہے۔ بہ ظاہر انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ میں نے ساری روداد آپ کو اس لیے سنائی کہ نواب کے گھر میں دنیا کی ہر آسائش میسر ہو گی لیکن سطوت کی شخصی بالیدگی کہیں مرجھا نہ جائے۔ وہ تو رنگوں سے کھیلتی ہے، سروں سے، کتابوں سے کھیلتی ہے۔ وہ تو بہت خواب دیکھتی ہے اور وہ تو سب سے آگے نکل جانے کی جستجو میں رہتی ہے، اور اسے دولت وغیرہ کی کوئی حرص و ہوس نہیں۔ اپنی اولاد کی بات نہیں کہ ہر ایک کو اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے۔ میں تو حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ وہ تو ایک مثال ہے۔ نواب صاحب کے محل دو محلوں میں کہیں...... یہ نواب لوگ بڑے روایتی ہوتے ہیں۔ دولت مندی سے مراد روشن فکری نہیں ہے۔ جس طرح روشن فکری سے مراد آوارگی نہیں ہے۔ وہاں جا کے قریب سے ان کے طور طریقے دیکھے بغیر ہاں، کیسے کی جا سکتی ہے اور سطوت کو بھی تو اپنے ہونے والے زندگی بھر کے رفیق کو پرکھنے کا موقع ملنا چاہیے۔ پرکھنے کا نہیں تو کم از کم دیکھنے، اندازہ لگانے کا۔ میری باتیں آپ کو عجیب لگ رہی ہوں گی لیکن کیا ان میں معقولیت نہیں ہے؟ بتائیے۔''

''نہیں بالکل نہیں، پر یہاں ایسا کہاں ہوتا ہے۔''

''نہیں ہوتا، ہونا چاہیے۔ نواب زادے کو بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کے ایک ایسی لڑکی سے زندگی بھر کے رشتے کے لیے آمادہ نہیں ہونا چاہیے جسے اس نے کبھی دیکھا اور تھوڑا بہت سہی، جانا بوجھا نہ ہو۔ کہتے ہیں، شادی دو خاندانوں کے درمیان ہوتی ہے لیکن اصل فریق تو دو افراد ہوتے ہیں۔ ان افراد کی نہ بنے تو خاندان والے کیا کر سکتے ہیں۔ یہی ہوتا ہے نا؟''

"ہاں، ہوتا ہے یہی کچھ۔" میں نے کہا۔ "مگر ضمانتیں تو مشکل ہی سے ملیں گی۔ شادی سے پہلے کی پسندیدگی بعد کو ناپسندیدگی میں بھی تو بدل سکتی ہے۔"

"کوئی ضمانت نہیں، بے شک کوئی نہیں۔" اکبر علی خاں تلخی سے بولے۔ "دوستوں کے درمیان کاروباری معاہدے میں بل آجاتا ہے۔ شادی کے معاہدے میں بھی تمام تر اطمینان کے باوجود کشیدگیاں اور کدورتیں ہوجاتی ہیں۔ پھر تو انجام علیحدگی کی صورت برآمد ہوتا ہے یا ساری زندگی کے عذاب کی شکل میں لیکن یہ ملال تو نہیں رہتا کہ فریقین نے ایک دوسرے کو سمجھا بوجھا، دیکھا بھالا نہیں تھا۔ شادی جوے کا کھیل نہیں ہے۔"

"اس صورت میں تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نواب صاحب کو انکار کردیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ ہوتے تو ضرور کہہ دیتے۔ آپ ایک جرأت مند آدمی ہیں، آپ وہ آدمی ہیں جو میں نے ہونا چاہا تھا اور میں ہونا چاہتا ہوں۔ آپ نے استاد میدا کے ٹھکانے پر جانے کا فیصلہ چٹکی بجانے کے دورانیے میں کرلیا تھا۔ نواب صاحب سے مروت کا ایک سلسلہ برسوں سے قائم ہے۔ ان کے گھر سے رشتہ آئے اور منع ہوجائے۔ یہ ان کے لیے بڑی سبکی کی بات ہے۔ جس طرح بھی کہوں، محسوس کرلیں گے۔ وہ ایک بااثر آدمی ہیں۔ بااثر آدمی کے دل میں کینہ جلدی بیٹھتا ہے......اور سوچتا ہوں، اس شہر سے تو پھر سطوت کے رشتے آنے سے رہے۔ نزہت کے ستار بجانے کا شوق، ان کی اعلا تعلیم، لڑکوں لڑکیوں کے مشترکہ کالج میں درس وتدریس۔ میری ان کی شادی کی بھی ایک داستان ہے۔ یہاں سبھی واقف ہیں۔ وہ یہاں کی نہیں ہیں۔ شادی کے بہت دنوں کے بعد تو آس پاس کے لوگوں نے ان سے بات چیت شروع کی تھی۔"

"انکار کی صورت میں کیا آپ کو نواب صاحب کی جانب سے کسی نقصان کا اندیشہ ہے؟"

"سب سے بڑا نقصان تو تعلق خاطر کا ہے میاں۔"

"کچھ تو آپ کو بھگتنا ہی ہوگا۔ عذر تو بہت سے کیے جاسکتے ہیں اور کیا غلط ہوں گے۔ کہہ دیجیے کہ آپ کو کچھ وقت چاہیے۔ آپ کے بڑے بھائی نے بھی خواہش ظاہر کی تھی۔ پہلے ان کی جانب سے بات صاف ہوجائے۔ ادھوری تعلیم کا بھی عذر کیا جاسکتا ہے کہ سطوت بی بی پہلے تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہیں۔"

"نواب صاحب ایک جہاں دیدہ آدمی ہیں، سمجھ جائیں گے۔"

"سمجھا کریں۔ وہ کوئی بادشاہ سلامت ہیں کیا۔ ناآمادگی میں ایسے ہی عذر کیے جاتے ہیں۔ انہیں تسلیم کرنا چاہیے۔ نواب زادے کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہوگی۔ آپ کو اختیار ہے۔ ہر باپ کو اختیار ہے کہ وہ جہاں چاہے، اپنی بیٹی کے بہتر مستقبل کا فیصلہ کرے۔ رہی پٹنا شہر میں آپ کے خاندان برداری والوں کی طرف سے رشتے آنے کی ناامیدی، تو کیا ہوگا۔ سطوت پڑھتی رہیں، پڑھتی رہیں۔ اس دوران کوئی نہ کوئی انہیں خود بھی پسند آسکتا ہے......مگر پھر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا؟"

"بالکل نہیں جناب، قطعاً نہیں۔ ہم سنجیدگی اور کشادہ دلی سے غور کریں گے۔ ہمیں خاندان ذات برادری سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں تو سطوت کے پسند کیے ہوئے فرد سے غرض ہوگی کہ وہ کیسا ہے اور سطوت کی پسند ایسی ویسی نہیں ہوگی۔"

"اور کیا شادی ایسی ہی ضروری ہے؟" میری زبان بہک گئی۔

اکبر علی خاں چونک پڑے اور کچھ توقف کے بعد بولے۔ "ہاں میاں، یہ بھی غور طلب بات ہے۔"

یہ شادی وادی کا رواج تو ابھی ابھی کا ہے۔ زندگی تو کروڑوں سال کی ہے۔ ہماری تو دس ہزار سال پہلے کی آگہی، وہم وقیاس، آثار وقرائن کی بنیاد پر ہے۔"

"مگر شادی غالباً یوں ضروری ہے کہ اس زمانے کا دستور ہے۔ ہر زمانے کا اپنا ایک دستور ہوتا ہے۔ اور وہی بات ہے، آدمی نہ ماضی میں رہ سکتا ہے نہ مستقبل میں۔ وہ تو محض اپنے حال میں رہتا ہے۔ ہر موجود زمانہ اس کا حاکم ہوتا ہے۔ اس کے قواعد، قوانین، ضابطوں اور مطالبوں کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ ہر موجود زمانے کے اپنے لہجے، زبان، لباس اور اپنا ایک رہن سہن ہوتا ہے۔ ہر موجود زمانے کی اپنی ایک منطق ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ جو کچھ جس عہد میں ہے، وہی منطق ہے۔"

آپ نے خود ہی سوال اٹھایا اور خود ہی جواب دے دیا میاں۔" وہ شگفتگی سے بولے۔ "یہ فکر ہی آدمی کو بھٹکاتی ہے اور فکر ہی راستہ دکھاتی ہے۔ بہر حال آپ کا مشورہ صائب ہے۔ مجھے بوجوہ یہ دونوں رشتے منظور نہیں ہیں تو کوئی عذر تو پیش کرنا ہی ہوگا۔ آپ سے بات کر کے میرا سینہ ہلکا ہوا اور مجھے حوصلہ ملا۔"

انہوں نے کافی کے چند ہی گھونٹ لیے تھے اور اپنی باتوں میں گم ہو گئے تھے۔ کافی ٹھنڈی ہو گئی۔ بہت دیر بعد ایمی نے سبزہ زار کا رخ کیا تو اس نے ہم دونوں کو دوبارہ گرم کافی بنا کے دی۔ مجھے کافی ایسی مرغوب نہیں تھی لیکن اکبر علی خاں کے سامنے منع نہ کیا جا سکا۔ شبنم اب محسوس ہونے لگی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور راہ داری میں وقفے وقفے سے قدموں کی آہٹ گونجتی اور خاموشی میں ڈوب جاتی۔ میرا کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ اکبر علی خاں کو گھر واپسی کا کچھ خیال ہی نہیں تھا۔ کافی ختم کرنے کے بعد جیب سے انہوں نے کڑھا ہوا ریشمی کپڑے کا بٹوا نکالا۔ "بن دھنیے سے شوق کریں گے؟ پان مجھے اچھا لگتا ہے لیکن نزہت کو پسند نہیں......اور انہیں نہیں تو مجھے بھی......" انہوں نے بٹوا میرے آگے کر دیا۔ "یہاں تو اسے بن دھنیا کہا جاتا ہے، کئی چیزوں کا مرکب ہے، منہ میں خوشبو بکھر جاتی ہے۔ معلوم نہیں، آپ اسے کیا کہتے ہیں؟"

میں نے ایک دو چٹکیاں لیں۔ عموماً شادی کی تقریبات میں جو مہمان پان نہیں کھاتے، انہیں یہ مسالا پیش کیا جاتا ہے۔ واقعی خوش ذائقہ تھا۔

"کیسا لگا؟" انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"دل چسپ ہے۔"

"دل چسپ کی خوب کہی۔" وہ ہنس پڑے۔ "یہ نزہت میری بیوی کے علاوہ، میری نگراں بھی ہیں۔ ایسا خیال رکھتی ہیں کہ خود پر میرا اعتماد متزلزل ہو گیا ہے۔ ہر وقت انہیں یہ خدشہ رہتا ہے کہ مجھ سے کوئی چوک ہو جائے گی، اور ہوتی بھی ہے۔"

"آپ بھی کیا کم ان کا خیال رکھتے ہوں گے۔"

"بھئی سچی بات یہ ہے، بڑے جتن کر کے انہیں حاصل کیا ہے۔ مشکل سے حاصل کی ہوئی چیز کی قدر بھی بہت ہوتی ہے، پھر نزہت تو ہیں ہی قابل قدر، قابل ستائش۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ میرے لیے انہوں نے بڑی دیواریں پھلانگی ہیں انہیں لگتا ہے کہ میرے بغیر وہ، اور ان کے بغیر میں، ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔"

"ایسا کم کم ہوتا ہے۔" میں نے تعجب سے کہا۔ "اس لحاظ سے آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اپنا کوئی مطلوب مل گیا۔ کسی کو اس کا اپنا مطلوب مل جائے تو دنیا مل جاتی ہے۔"

"میں واقعی خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں۔"

"خدا کرے، آپ دونوں میں یہی یگانگت رہے۔" مجھے شاید یہی کہنا چاہیے تھا۔

"ہاں۔" ان کا لہجہ حسرتی سا ہو گیا۔ "بس دعا کریں، ایسے ہی سارا کچھ بنا رہے۔"

"انہوں نے دستی گھڑی دیکھی اور انگڑائی سی لے کے بولے۔ "میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا چاہیے، آج میں سوچ کے آیا تھا کہ دیر تک آپ کے پاس بیٹھوں گا مگر سچ پوچھیے تو جی بھرا نہیں۔"

"تو بیٹھیے نا کچھ دیر اور۔" میں نے بہ ظاہر تکلفاً کہا، خود میرا جی بھی ان کی باتوں میں لگ رہا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد تو مجھے اپنے ساتھ ہی رہنا تھا اور جانے کیوں میں اپنا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"آپ تو اپنے بارے میں کچھ بتاتے نہیں۔ میں ہی فضول گوئیاں کرتا رہتا ہوں۔" ان کے شکایتی لہجے میں ناز برداری بھی شامل تھی۔

"کیا جاننا چاہتے ہیں آپ؟"

"بہت سے سوال دماغ میں اٹھتے ہیں۔"

"مثلاً کیا کیا؟"

"یہی کہ میاں۔ اب ایسی بھی آپ کی عمر نہیں ہے۔ ماشاءاللہ نوجوان ہیں مگر ایک عجب تپش سی، ایک تلاطم سا کچھ میں نے آپ کے چہرے پر محسوس کیا ہے۔"

"میں......میں کیا کہہ سکتا ہوں اس خامی پر۔"

"نہیں جناب، یوں نہیں، ایسے مت ٹالیے۔ یہ اضطراب بے سبب تو نہیں ہوگا۔ ہو سکے تو کچھ بتایئے، اور اگر ناگواری کا باعث ہو تو بخدا بالکل نہیں۔ آپ سے میرا تعلق آپ کے بارے میں میری واقفیت سے بندھا ہوا نہیں ہے۔"

"یہ تو آپ کی بڑائی ہے۔"

"بڑائی کیا۔" وہ بے بسی کے سے انداز میں بولے۔ "کوئی اچھا لگ جائے، پھر اور کیا رہ جاتا ہے۔ اچھا لگنے نہ لگنے کا معاملہ تو دل کا ہے، دماغ کا نہیں۔ اور کچھ جاننے کا اشتیاق تو فطری ہے لیکن لازم نہیں، کم از کم میرے لیے۔"

"کیا بتاؤں؟" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"کچھ نہ بتائیں۔" انہوں نے سر جھٹک کے کہا۔ "جانے دیجیے۔"

"بتانے کو کچھ اچھا نہیں ہے۔"

"برا بھی نہیں ہوگا۔"

"شاید اسی کو حسن ظن کہتے ہیں۔"

"نہیں، یقین ہے، برا کچھ نہیں، مختلف ضرور ہوگا۔ کچھ الگ ہوگا صاحب۔" ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "میں تو کہوں گا، میں نے آپ جیسا نوجوان نہیں دیکھا......اور ایسا نہیں کہ دنیا نہیں دیکھی، دنیا کو بھی اچھا خاصا دیکھا، پڑھا اور سنا ہے۔ وکالت میں تو آئے دن حیران کن واقعات سامنے آتے رہتے ہیں۔ لیکن......"

میں چپ رہا اور سوچتا رہا، انہیں کیا بتاؤں، کیا نہیں۔

"یہ آپ کے سفر کا مشغلہ بے جواز تو نہیں ہونا چاہیے۔" میری خاموشی پر انہوں نے جیسے مجھے تنکا چبھویا۔

"سیر و تفریح بھی تو ایک جواز ہوتی ہے۔"

"تو کیا بس یہی......؟ نہیں صاحب نہیں۔"

"کسی کی تلاش ہے۔" میں نے سانس بھر کے کہا۔

"تلاش؟" ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

"ایک صاحب کی......ان کا نام مولوی محمد شفیق ہے۔"

"مولوی محمد شفیق!" انہوں نے تجسس سے دہرایا۔ "کس وجہ سے؟"

"ان کے پاس ایک امانت ہے۔"

"امانت......! روپے پیسے کی تو نہیں ہوگی۔"

ان کے وثوق پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے سر ہلا کے تائید کی۔

"کب سے......وہ کھوئے ہوئے ہیں۔؟"

"دس سال سے اوپر ہو گئے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اور ......اور دس سال سے آپ انہیں ڈھونڈ رہے ہیں؟''

''نہیں......کوئی تین چار سال سے۔ سات سال میں نے جیل میں گزارے تھے۔ اس لیے انہیں تلاش نہیں کر سکتا تھا۔''

''جیل میں؟'' ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''کیا، کیا کہہ رہے ہیں میاں آپ......؟ کس جرم میں؟ سات سال کا مطلب ہے کوئی بڑا جرم......؟''

ان کی آواز بدل گئی۔

''دہرے قتل کے جرم میں۔'' میں نے سر جھکا لیا۔

ان کا جسم بل کھا گیا۔ ''آپ مذاق کر رہے ہیں۔''

میں نے قتل کی وجہ اور سزا کاٹنے کے بارے میں مختصراً انہیں بتانا شروع کیا تو ان کے چہرے کا رنگ بدلتا رہا اور وہ گنگ بیٹھے رہے۔ میں نے تفصیل سے اجتناب کیا تھا لیکن ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ گم سم مجھے دیکھا کیے۔ ''آپ کا تعلق کیا شہر سے ہے؟'' انہوں نے مضطرب آواز میں پوچھا۔

''کبھی تھا۔ اب تو کئی شہروں سے ہے۔ اور گھر میں رہنے کا موقع تو کم ہی ملتا ہے۔ بس گھومتے رہتے ہیں، شہروں شہروں، گلی گلی......اور مولوی صاحب کے نام کی صدائیں لگاتے پھرتے ہیں۔''

میری آواز بیٹھنے لگی۔

''اوہ، اوہ۔'' انہوں نے جھرجھری لی۔

''اور......اور ان کا کوئی نام و نشان نہیں ملا؟''

''کئی جگہ، مراد آباد، جیسلمیر، حیدر آباد، ریاست رام پور کے قصبے نگر یا سادات......بس آنکھ مچولی سی ہوتی رہی۔ جہاں جہاں بھی ہم پہنچے اس جگہ سے وہ جا چکے تھے۔ حیدر آباد میں یہ اندازہ ہوا کہ وہ مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔ ملنا چاہتے تو ان کے لیے مجھ تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے کئی جگہ اپنا پتا چھوڑا ہے۔ کلکتہ جیل سے بٹھل بھائی تک اور وہاں سے مجھ تک......وہ آسانی سے مجھ تک پہنچ سکتے تھے مگر وہ یہ چاہتے ہی نہیں ہیں۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ میں سزا یافتہ......میں اب اس کے لائق نہیں رہا......اور اب وہی اس کے سب کچھ ہیں......بہر حال کسی دن ہم ان تک پہنچ ہی جائیں گے یا خود ہی تھک کے وہ میرا رخ کریں گے۔ جیسلمیر میں مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس کا نام بدل کے نرجس بانو رکھ دیا ہے اور اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ وہ تنہا زندگی گزارتے رہے تھے۔ ظاہر ہے، اتنے عرصے اسے اپنی چھاؤں، اپنی پناہ میں رکھنے کے بعد اس سے جدائی کا تصور ہی ان کے لیے عذاب ہوگا۔ کون انہیں بتائے کہ مجھ سے اس کا ملنا، اپنی بیٹی سے ان کی دوری نہیں ہے۔ ان کا تو بڑا احسان ہے کہ وہ اتنے عرصے تک اس کی پاس بانی کرتے رہے۔ وہ اس وقت اس کے سر پر ہاتھ نہ رکھتے تو اس کا کیا حال ہوتا۔ وہ تو شاید زندہ نہ رہتی، پھر میں بھی کہاں جاتا۔ مولوی صاحب اچھی طرح یہ بات جانتے ہیں۔ ان کی نگرانی اور ایثار اپنی جگہ، وہ تو میرے آسرے پر زندہ رہی ہے۔ وہ مسلسل میری تلاش کے بہانے بناتے رہے ہوں گے لیکن کب تک......ایک دن......انہیں سمجھنا چاہیے، ایک دن اس کی امید ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ جس دن ایسا ہوا، تب تب......'' میری آواز حلق میں پھنس گئی اور میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔

''نا نا......نا میاں۔'' اکبر علی خاں کرسی سے اٹھ کے بے تابانہ میرے پاس آ گئے اور انہوں نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر پا لیا۔ ''میرے پیارے، میری جان! آپ تو، آپ تو بہت باہمت نوجوان ہیں۔ یہ کیا، یہ کیا......نہیں میاں، بالکل نہیں یہ آنسو آپ کو زیب نہیں دیتے۔''

ان کی تسلی دلاسے میری آنکھیں اور دھندلانے لگیں۔

انہوں نے راہ داری میں امی کی موجودی کا احساس دلانے کے لیے مجھے کہنی ماری۔ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا۔ مجھے خود پر قابو ہی نہیں رہا۔

"کچھ نہیں، کوئی بات نہیں۔" وہ میری کمر ٹھونکتے ہوئے بولے۔" دیکھنا، ایک دن بہت جلد...... انشااللہ جلد ہی آپ کی مراد برآئے گی۔ آپ کی لگن سچی ہے، آپ کا ایک عزم ہے تو...... یہ عزم رائگاں نہیں جائے گا میاں۔"

"مگر یہ سفر میں، جگہ جگہ، بار بار یہ رکاوٹیں جو آجاتی ہیں۔ ہم کسی سے سروکار نہیں رکھنا چاہتے مگر اچانک دیواریں کھڑی ہوجاتی ہیں۔ جیسے یہاں، بتائیے میرا کیا قصور تھا...... کیا کیا بتاؤں آپ کو...... کہاں کیسے کیسے حادثوں، ان ہونیوں سے واسطہ پڑا ہے۔"

"کچھ نہ بتائیے اب...... پھر سہی، کل سہی۔ بخدا مجھے اندازہ نہیں تھا، یہ ذکر آپ کے لیے کتنا تکلیف دہ ہوسکتا ہے۔ یہ سارا کچھ سن کے میری حالت اضطرابی ہے۔ آپ پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اب میری سمجھ میں بہت کچھ آچکا ہے۔ خدا آپ کو سکون دے۔ میرا قیاس غلط نہیں تھا۔ آپ کی آنکھوں اور چہرے پر یہ غبار خالی از علت نہیں ہوگا۔ لیکن اتنا کچھ...... میرے سان و گمان میں نہ تھا۔ کاش میرے پاس کوئی مداوا ہوتا، میں کچھ کرسکتا مگر...... مگر ہاں، یہ ممکن ہے کہ اب میں بھی آپ کے ساتھ چلوں جیسے بھائی صاحب آپ کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں بھی جگہ جگہ، شہر شہر، گلی گلی انہیں تلاش کروں گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ایک سمت جائیں، میں دوسری...... نزہت کو میں یہ سارا کچھ بتاؤں گا تو وہ بھی مجھے نہیں روکیں گی بلکہ حوصلہ افزائی کریں گی۔"

میں بھری ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔

امی نے آکے بتایا کہ ایک بج چکا ہے۔ اس کا اشارہ واضح تھا۔ اکبر علی خاں نے دستی گھڑی دیکھی اور اضطراری لہجے میں بولے۔" مجھے اب چلنا چاہیے۔ جانے کو جی تو نہیں چاہتا۔ دیر کا کہہ کے آیا تھا، نہ آنے کا کہہ کے آتا تو بات دوسری ہوتی۔ خاصی رات ہوگئی ہے۔ کل صبح جلد ہی آجاؤں گا۔ صبح تک کھلتے سے بھی کوئی نہ کوئی آجائے گا۔ بھائی صاحب بھی، اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ہو رہے ہیں۔ اب تشویش کی کوئی بات نہیں۔ کل آپ کو کچھ فراغت ہوجائے گی، پھر بیٹھیں گے اور سوچیں گے۔ میں اچھا منتظم بھی ہوں۔ دیکھیے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔" ان کے ساتھ میں بھی کھڑا ہوگیا۔ وہ مجھے سکون کی تلقین کررہے تھے لیکن خود ان پر ہیجان سا طاری تھا۔ حرکات و سکنات میں بڑی بے قراری تھی۔ وہ منع کررہے تھے لیکن صدر دروازے تک مجھے ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ راستے میں ان کی دل جوئی کے لیے میں نے کہا۔" آپ یہاں، گردوپیش کے ماحول کے بارے میں شکوہ کررہے تھے، اس وقت میں کہتے کہتے رہ گیا، چند دنوں کے لیے سہی، آپ بھابھی صاحبہ اور بچے فیض آباد آئیں۔ وہاں ہماری حویلی میں شاید وہ لوگ مل جائیں جن کی آپ کو تلاش ہے۔ وہاں آپ کا دل ضرور لگے گا۔"

میری کوشش کامیاب ہوئی، انہوں نے جوشیلے انداز میں ہامی بھری۔

میں نے کہا۔" وہاں ایک گھر ہے، بہت سے گھروں سے الگ۔ یوں سمجھیے کہ خود بہ خود ایسا کچھ بس گیا یا ہوگیا ہے۔ وہاں ایک زریں ہے۔ میں کہتا رہتا ہوں کہ پھولوں کے خمیر سے اس کا جسم بنا ہے اور نس نس میں اس کی شہد سمایا ہوا ہے۔ اور وہاں ایک زریں ہی نہیں، چھوٹا بھائی جہاں گیر بھی ہے، خانم ہیں اور نیساں ہے۔ دونوں بہت اچھا گاتی ہیں۔ اور سلمٰی ہے، زہرہ ہے، اور فروزاں،

یاسمین ہیں۔ سب کی اپنی ایک داستان ہے۔"

"کیا نام لیا آپ نے؟ آخری نام؟" وہ چلتے چلتے رک گئے۔

مجھے یاد آیا، فروزاں اور یاسمین کے باپ پٹنے ہی سے آسن سول گئے تھے اور درس و تدریس ہی سے وابستہ تھے۔" شاید آپ جانتے ہوں۔ وہ پہلے اسی شہر میں رہتی تھیں۔ ان کے باپ یہاں پروفیسر تھے۔"

"ہاں ہاں میاں۔ آپ جمال الدین سیفی کی بیٹیوں کی بات تو نہیں کررہے۔ ان کے والد ایک جید عالم تھے، فارسی اور مشرقی علوم کے ماہر۔ ان کے گھر تو ہمارا خوب آنا جانا تھا۔ ان کی دو پیاری، بہت پیاری بچیوں سے اپنی بچیوں کا بڑا میل ملاپ تھا مگر وہ آپ کے ہاں، فیض آباد میں......" وہ جز بز ہونے لگے۔

"ہم انہیں آسن سول سے فیض آباد لے آئے ہیں، بہت لمبا قصہ ہے۔ آپ کو دیر ہو رہی ہے، کل بتاؤں گا۔"

"پروفیسر صاحب کا تو آسن سول میں انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے دوست سید محمود علی انہیں آسن سول لے گئے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی میں بھی ایک دو روز کے لیے سید صاحب کے مہمان خانے میں مہمان رہا ہوں، کیا مہمان خانہ ہے۔ بہت متواضع آدمی ہیں وہ، بڑے مرنجاں مرنج۔"

"اسی نے اپنے دوست فروزاں اور یاسمین کے باپ کو ختم کردیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ان کی ماں خانم فرخ سے شادی کرلی اور اسے بھی ختم کردیا۔"

وہ اچھل سے گئے اور ان کی آواز میں تندی آگئی۔" کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ مجھے پوری بات بتائیے۔"

"کل صبح، آپ کو بہت دیر ہوگئی ہے۔"

"مجھے اب نیند نہیں آئے گی میاں۔"

کچھ بتائے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں نے تو ان کی دھند دور کرنے کے لیے حویلی کا ذکر چھیڑا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ وہ فروزاں اور یاسمین سے واقف ہوں گے۔ میں نے سرسری طور پر آسن سول میں پیش آنے والا احوال بتا کے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اس اختصار سے وہ اور بے چین ہوگئے۔ میں نے کہا۔" اب کوئی بات نہیں جو ہونا تھا، ہوچکا ہے۔ پہلے فروزاں اور یاسمین کو سید محمود علی کے چنگل، اس کے زنداں سے نکالنا ضروری تھا۔ اس لیے اسے کچھ مہلت مل گئی۔ اس کا حساب باقی ہے اور ہمیں دوبارہ جانا ہے۔ پروفیسر کے اثاثوں کا حساب لینا ہے کہ وہ فروزاں اور یاسمین کا حق ہے۔ عدالتی کارروائی کی ضرورت پڑی تو فروزاں، یاسمین اور نصیر بابا کے علاوہ کچھ اور شہادتیں حاصل کرنا ہیں۔ سید محمود علی کو اس کے انجام تک نہیں پہنچایا تو فروزاں اور یاسمین سے ناانصافی ہوگی۔ اب وہ ہماری ذمے داری ہیں۔"

دیکھنے، سننے، بولنے اور سوچنے کی ایک استطاعت ہوتی ہے۔ آدمی اتنی حیرتیں ہی برداشت کرسکتا ہے جتنی اس کی سمائی ہے۔ فروزاں اور یاسمین کا واقعہ مستزاد تھا۔ اکبر علی خاں شدید کش مکش سے دوچار نظر آتے تھے۔ اب انہیں سوال کرنے کا بھی یارا نہیں تھا۔ انہیں مجھ پر یقین تھا کہ میں ان سے کچھ غلط نہیں کہوں گا۔ مجھ پر ان کا یہ یقین ان کے لیے مزید رنج اور اضطراب کا باعث ہونا چاہیے تھا۔ کسی جھوٹ اور مبالغے کا شائبہ ہوتا تو آدمی اتنا حیران و پریشان نہیں ہوتا۔

میری گزارش پر کہ ہم دوبارہ بھی ملیں گے اور کل صبح ہی، انہوں نے صدر دروازے کا رخ کیا اور پھر کچھ نہیں کہا۔ ان کی خاموشی کا تلاطم اور شور میری آنکھیں دیکھ رہی اور میرے کان سن رہے تھے۔

صدر دروازے کے اندر دروازے کے بیچوں

بیچ وردی پوش دربان مونڈھے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دور سے اس نے ہماری آہٹیں سن لیں۔ سٹ پٹا تا اٹھ کھڑا ہوا، سیلوٹ کے انداز میں سلام کیا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے باہر پولیس کا پہرا تھا۔ بائیں طرف بینچوں پر چار دیواری سے کمر ٹکائے اوندھے اوندھے بیٹھے ہوئے چند سپاہی بھی مستعد ہوگئے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ارد گرد کی عمارتیں بھی جیسے سو رہی ہوں، کچھ فاصلے پر دو تانگے موجود تھے۔ ایک کو میں نے آواز دی تو دوسرا بھی بیدار ہوگیا۔ آس پاس چھائے سکوت سے مجھے گھبراہٹ ہوئی اور میں نے اکبر علی خاں سے کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلتا ہوں۔ انہیں گھر پہنچا کے اسی تانگے میں واپس آجاؤں گا۔ انہوں نے انکار کردیا، اعتماد سے بولے۔ ''یہ میرا شہر ہے میاں۔'' مجھ سے گلے مل کے تانگے میں بیٹھنا چاہتے تھے کہ رک گئے اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک قدم دور لے گئے اور سرگوشی میں کہنے لگے۔ ''ایک بات کہنی تھی آپ سے، بس یوں ہی۔ صبح تک کلکتے سے تو کوئی آہی جائے گا...... کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میدا کے ٹھکانے پر جانے کا خیال ہی چھوڑ دیں۔ میری درخواست ہے یہ......''

''مگر میرا چاقو اس کے پاس ہے۔ اسے واپس لینا ہے۔ یہ اڈوں کی روایت ہے وہ لوگ کیا سمجھیں گے۔'' میری آواز بیٹھ گئی تھی۔

''کوئی اور صورت نکال لیجیے۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ سوچ لیجیے۔''

''نہیں آپ کو میری ناکامی کا اندیشہ تو نہیں...... بے شک یہ بھی ہوسکتا ہے لیکن جانا تو ہے، جانا تو چاہیے...... اور ایسا کچھ نہیں ہوگا، آپ اطمینان رکھیں۔''

''ہوسکے تو نظر ثانی کیجیے، میری التجا ہے۔''

''آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، صبح بات ہوگی۔ کسی دوسری صورت پر غور کریں گے۔ انہوں نے میرے گال تھپکے اور تانگے میں بیٹھ گئے۔ سناٹے میں تانگے کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ جب تک تانگا نظروں سے اوجھل نہ ہوگیا، میں وہیں کھڑا رہا۔

امی جاگ رہی تھی اور میرا انتظار کررہی تھی۔ کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی ناراض ہونے لگی۔ ''اب تم بھی کچھ دیر آرام کرلو، میں دیکھ رہی ہوں، تم اپنے آپ سے بہت زیادتی کررہے ہو۔ نوجوانی کو اتنا زیر بار نہیں کرتے میرے پیارے بچے۔''

صوفے پر بیٹھ کے میں نے پیر پھیلا دیے اور میرا جسم بکھر سا گیا۔ امی بھی میرے پاس بیٹھ گئی اور اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''سر میں درد تو نہیں؟'' اس کی آواز سے شفقت چھلک رہی تھی۔

''نہیں، بس کچھ تھکن سی ہورہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ہوگی نا۔ گوشت پوست ہی کے بنے ہو۔ تم ایسے نہیں آرام کرو گے۔ میں تمہیں نیند کی گولیاں دیتی ہوں، تمہیں ایک گہری نیند کی ضرورت ہے۔''

جبری آرام، آرام تو نہیں ہوا۔'' میں نے ہنس کے کہا۔

جو بچے کہنا نہیں مانتے، انہیں اسی طرح قابو میں کیا جاتا ہے۔ اب سیدھی طرح اٹھ کے اپنے بستر پر جاؤ...... چلو اٹھو۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اٹھا دیا اور بستر تک لے آئی۔ میں بستر پر دراز ہوا تو اس نے میرے پیر چادر سے ڈھانپ دیے اور سرہانے بیٹھ کے میری پیشانی اور بال سہلانے لگی۔ مجھے امی کی یاد آگئی۔ کبھی کبھی بستر پر لیٹا میں چھت اور دیواریں تکتا رہتا تھا۔ رات کو میری کھلی آنکھیں دیکھ کے امی بھی کچھ اسی طرح میرے سرہانے آکے سر دبانی اور ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی تھیں۔ اسی میں مجھے نیند آجاتی تھی۔ آج بھی یہی ہوا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی، کب آنکھ لگی اور کب امی سرہانے سے اٹھی۔

صبح ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ نیند کا دورانیہ زندگی میں کیوں شمار کیا جاتا ہے۔ نیند تو نصف موت ہے۔ صبح کمرے میں وارڈ بوائے کی کھٹ پٹ سے میری آنکھ کھلی۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر آیا تو امی نے ناشتہ تیار رکھا تھا۔ آٹھ بج رہے تھے۔ ابھی تک جامو، جمرو اور زورا میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ شاید انہیں وقت پر تار نہیں مل سکا ہو۔ بہر حال صبح بٹھل کی حالت کچھ اور بہتر نظر آرہی تھی۔ میری آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ میں نے دانستہ اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر رائے کو آنا ہی تھا۔ میں نے بٹھل کو بتانا چاہا تھا کہ کلکتے تار دے دیا ہے، وہاں سے کوئی نہ کوئی آنے والا ہی ہوگا لیکن اس کے دماغ پر زور پڑنے کے خیال سے میں رک گیا۔

ڈاکٹر رائے ٹھیک دس بجے آیا۔ اس کے ساتھ دو نوجوان ڈاکٹر بھی تھے۔ جانے کیوں اس نے کچھ دیر کے لیے مجھے کمرے سے باہر چلے جانے کی ہدایت کی۔ کسی ایک سوال کا محل نہیں تھا، میں خاموشی سے باہر آگیا اور میرے نکلنے کے بعد امی نے کمرے کا دروازہ بند کردیا۔

میں راہ داری کے ساتھ بچھے سبزہ زار پر آکے بیٹھ گیا۔ اکبر علی خاں کسی وقت بھی آسکتے تھے۔ رات انہوں نے کہا تھا کہ ساتھ ہی ناشتہ کریں گے۔ ڈاکٹر رائے کو کمرے میں ٹھیرے پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ راہ داری کے کونے پر اکبر علی خاں کا ملازم لڑکا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور وہ خاصا بدحواس نظر آرہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور میں فوراً کرسی سے اٹھ گیا۔ لڑکا کمرے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ دروازہ بند دیکھ کے منتشر ہوا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور اس نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں بتایا۔ ''بڑے صاحب کا خون ہوگیا۔'' یہ کہتے ہی وہ رونے اور بلکنے لگا۔

مجھے اپنے ہوش وحواس پر شبہ ہوا، لیکن لڑکے نے وہی کہا تھا جو میں نے سنا تھا اور وہ وہی لڑکا تھا جو اکبر علی خاں کے ساتھ آتا رہا تھا۔

''بڑے صاحب کا خون ہوگیا صاحب!'' وہ بلک رہا تھا اور میری ٹانگوں سے لپٹ کے اس نے واویلا شروع کردیا تھا۔

''کیا...... کیا......؟'' میں نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا، ''کیا بک رہے ہو؟ کون بڑے صاحب؟''

اس سے پہلے کہ میں اسے ٹھوکر مار کے خود سے دور کرتا، اپنے پیروں سے اٹھا کے اسے طمانچے مارتا، اس نے ہذیانی انداز میں بتایا کہ صبح نماز کے وقت مسجد جانے کے لیے لوگ باہر نکلے تو انہوں نے مسجد اور اکبر علی خاں کے گھر کے نزدیک باغیچے کی باڑ میں ان کی لاش دیکھی، خون میں لت پت...... لڑکے کی زبان اکڑ گئی اور وہ میرے قدموں پر سر پٹکنے لگا۔

وہ جانے کیا کہتا رہا، میں گنگ کھڑا اسے دیکھا کیا۔

''آپ چلو صاحب ابھی۔ بیگم صاحب کی حالت بہت خراب ہے۔'' اس نے گھگھیا کر کہا۔

میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میری رگوں میں خون جم گیا تھا اور آنکھوں پر اندھیرا چھانے لگا تھا۔

اسی لمحے نرس امی کمرے کے دروازے سے مجھے پکارتی ہوئی باہر نکلی اور میرے پاس آکے ٹھٹک گئی۔ اس کی آمد پر لڑکے نے میری ٹانگیں چھوڑ دیں اور مجھ سے دور ہوگیا۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

''کیا...... کیا بات ہے؟'' امی نے ہڑبڑا کے پوچھا۔

میں اسے کیا بتاتا۔ میری خاموشی پر وہ لڑکے کا

کندھا جھنجھوڑنے لگی۔ ''کیا ہے؟ کیا بات ہے؟ تم روتا کیوں ہے؟''

لڑکے نے پہلے میری طرف دیکھا پھر سسکتی آواز میں ایمی کی سماعت کو آزمائش سے دوچار کیا۔

''کا...... کا بولتا ہے؟'' ایمی سراسیمگی سے بولی۔ ''ایسا کیسے؟ نہیں، نہیں۔''

لڑکا سر جھکائے روتا رہا۔ ایمی نے مجھے ٹہوکا دیا اور تصدیق چاہی۔ میری جانب دیکھ کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ عمر رسیدگی سے برداشت مشروط ہے۔ اس نے لڑکے کی کمر تھپکی، اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور آدھی انگریزی، آدھی ہندوستانی میں تسلی دلاسے دینے لگی۔ اس نے لڑکے کو گھر واپس جانے کی ہدایت کی۔ لڑکے نے مجھ سے کچھ پوچھنا چاہا۔

''تم ابھی ایدر سے جاؤ۔'' ایمی نے حکمیہ انداز میں کہا، ''جاؤ ابھی۔''

لڑکا کچھ دیر شاید میرے کچھ کہنے کے انتظار میں کھڑا رہا۔ میرا دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا کہ ایمی نے میرا ہاتھ جکڑ کے مجھے روک لیا اور لڑکے کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔

''اپنے کو سنبھالو۔'' خود اس کی آواز بکھری ہوئی تھی۔ ''ایسا کیسے ہوگیا، ابھی رات کو تو وہ...... نہیں نہیں۔'' وہ سر جھٹکنے لگی۔ ''ایسا کیسے۔''

میں پتھرائی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بے ربطی سے انگریزی میں کہا۔ ''ڈاکٹر رائے تمہیں اندر بلا رہے ہیں۔ تمہارے بھائی کی حالت اس وقت خاصی بہتر ہے۔ اس نے ڈاکٹر سے کچھ باتیں کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ تم ابھی اندر چلو مگر...... مگر تمہارا اس وقت اندر جانا...... میں ڈاکٹر سے کیا کہوں؟'' وہ بری طرح بدحواس نظر آرہی تھی۔ ''ٹھیک ہے، میں اندر جا کے دیکھتی ہوں۔ کہیں جانا مت...... کہیں بھی نہیں۔ سمجھے۔''

مجھے تنہا چھوڑ کے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے کی طرف گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوتے اس نے کئی بار مجھے مڑ کے دیکھا۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے وہیں راہ داری کے چبوترے پر بیٹھنا چاہا لیکن دوسرے لمحے دو تین ڈاکٹروں کے ساتھ ڈاکٹر رائے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا اور میری جانب لپکتا ہوا آیا۔ ''کیا...... کیا کہتی ہے یہ ایمی؟'' اس نے وحشت آمیز لہجے میں کہا اور ایک سانس میں جانے کیا کچھ کہتا اور پوچھتا رہا۔

میں نے کچھ سنا، کچھ نہیں اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' اس نے جھپٹتی آواز میں پوچھا۔

ایمی بھی کمرے سے آگئی تھی۔ اسکی دخل اندازی پر ڈاکٹر رائے نے پھر مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ایمی ہی اس سے کچھ کھسر پھسر کرتی رہی۔ کچھ لمحوں تک ڈاکٹر خاموش رہا پھر میرا بازو تھام کے مجھے کمرے میں لے جانا چاہتا تھا کہ لوٹ پڑا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کے اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو آگے چلے جانے کی تاکید کی اور تیز قدموں سے راہ داری میں چلتا ہوا کچھ دیر بعد ایک کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک مختصر اور صاف ستھرا کمرا تھا۔ وہاں موجود نرس اور ڈاکٹر کھڑے ہوگئے۔ ڈاکٹر رائے کے تیور سے انہوں نے اس کا عندیہ سمجھ لیا اور سٹ پٹاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میز کے اطراف رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر مجھے بٹھا کے ڈاکٹر رائے میرے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''مجھے معلوم ہے، یہ سن کے تم پر کیا گزر رہی ہوگی۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا ''لیکن یہ ایسا واقعہ نہیں جو تم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو۔ مجھے بتاؤ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟''

''کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب!'' میں نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ ''مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''مجھ سے ذرا ہوش میں آکے بات کرو۔'' ڈاکٹر رائے کا لہجہ ترش ہوگیا۔ ''رات کو کتنے بجے تک وکیل صاحب تمہارے ساتھ تھے؟''

''وہ ایک بجے کے بعد یہاں سے اٹھے تھے۔''

''ایک بجے کے بعد؟'' وہ جز بز ہو کے بولا۔

''نرس ایمی نے آکے ہمیں ٹوکا تھا کہ ایک بج چکا ہے۔ وہ فوراً اٹھ گئے، لیکن اس کے بعد بھی وہ کوئی بیس پچیس منٹ بعد اسپتال سے رخصت ہوئے تھے۔ اس دوران صدر دروازے کے راستے میں وہ رک رک کر باتیں کرتے رہے۔ یہاں سے جانے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر گھر کہہ کے نہیں آئے تھے وہ۔ صدر دروازے پر میں نے ان سے کہا بھی میں ساتھ چلتا ہوں، اسی تانگے سے واپس آجاؤں گا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے، یہ میرا شہر ہے میاں، بہت اعتماد تھا، انہیں اپنے......'' میری آواز سسکنے لگی۔

''پھر تم اپنے کمرے میں واپس آگئے؟''

''جی ہاں، رات بہت ہوگئی تھی۔ کچھ دیر میں جاگتا رہا، پھر نیند آگئی۔''

ڈاکٹر چند لمحے چپ رہا، پھر بولا، ''انہوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ اس شہر کے مشہور وکیل تھے، یہیں کے رہنے والے، بہت خاندانی آدمی۔ کون ان کا دشمن ہوسکتا ہے؟''

میرے سینے میں آگ سی بھڑکی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا اور مشکل سے اپنی زبان بند رکھی۔

''تمہاری ان سے اس شہر میں آنے کے بعد ملاقات ہوئی تھی؟'' ڈاکٹر کے تند و تیز لہجے سے مجھے اور گھٹن ہونے لگی۔ ''اس سے پہلے تم انہیں نہیں جانتے تھے؟''

''دو دن ہی۔'' میں نے مختصراً کہا۔ ''بس دو دن سے۔''

''رات وہ تم سے کیا باتیں کرتے رہے؟''

''یہی اپنے گھر بیوی بچوں کی۔''

''اور تم کہتے ہو، تمہاری جان پہچان کو دو ہی دن ہوئے تھے۔'' ڈاکٹر کی آواز میں تلخی نمایاں تھی۔

''لیکن اس مختصر مدت میں وہ مجھے بہت قریب سمجھنے لگے تھے۔ وہ بہت اچھے، بڑے صاف دل آدمی تھے میں نے ایسے لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ لگتا تھا، جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' میرا جی امڈنے لگا اور آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔

''نا، نا اس طرح نہیں۔'' وہ تنبیہی آواز میں بولا۔ ''تمہیں اندازہ ہے، پولیس کسی بھی وقت یہاں آکے تم سے تفتیش کرے گی۔ ممکن ہے، راستے میں ہو۔ بہتر ہوگا کہ اس کے آنے سے پہلے مجھے صاف صاف بتاؤ۔ مجھے شبہ ہے، تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے اور اب بھی یہی کر رہے ہو۔ اصل بات سے واقف ہو کے شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔''

میں سر جھکائے بیٹھا اپنے آپ کو نوچتا رہا۔

''تمہارا کسی پر شبہ ہو تو بتاؤ۔ تم سے رات انہوں نے اتنی باتیں کی تھیں۔ کسی کی طرف انہوں نے کوئی اشارہ کیا، کوئی ایسی بات؟'' ڈاکٹر کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔

میں اسے کیا بتاتا، کیا نہیں۔ خاموشی کا اب کوئی محل بھی نہیں تھا۔ جلد، یا بدیر، اب تو سب کچھ عیاں ہو جانا تھا۔ میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔''

''کیا؟'' ڈاکٹر رائے اچھل پڑا۔ ''کیا کہتے ہو، تمہاری وجہ سے؟''

''میرا منحوس سایہ جوان پر پڑ گیا تھا۔''

''کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔''

''ایک جگہ اور ایک آدمی کی بات نہیں ڈاکٹر صاحب! پہلے بھی کتنی بار ایسا ہو چکا ہے۔ یہاں بھی

یہی ہوا۔''

''تم اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہو شاید۔'' ڈاکٹر رائے کا چہرہ بگڑ گیا۔

''یہی کچھ ہے ڈاکٹر صاحب! نہ ہم یہاں آتے، نہ انتھونی اپنی جان سے جاتا، نہ اکبر علی خاں اور......اور نہ کوئی اور......''

''انتھونی! انتھونی کا اس سے کیا تعلق ہے؟'' ڈاکٹر رائے بپھر کے بولا۔

''آپ نہیں سمجھیں گے۔'' میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ ''میں آپ کو کیا بتاؤں، ہم بہت برے لوگ ہیں ڈاکٹر صاحب۔''

ڈاکٹر نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور جبری سا ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کھل کے بتاؤ دوست! میں واقعی کچھ سمجھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا تم کوئی برے آدمی ہو، تم یا تمہارا بھائی...''

''آپ ایک دوسرے، ایک مثبت آدمی ہیں، بہتر ہوگا، آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ بہت الجھ جائیں گے۔ یہاں بہت سے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ ایسی باتیں ہمارے لیے نئی نہیں ہیں۔ ہم بھگتتے رہتے ہیں، لیکن آپ......''

ڈاکٹر جھجکتی نگاہوں سے تادیر مجھے دیکھتا رہا۔ ''تم کون ہو؟''

درشتی کے باوجود اس کے لہجے سے ہیبت عیاں تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ بے اعتنائی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ مجھے کچھ بتانا چاہتے ہو تو کہو، ورنہ مجھے اور بہت سے کام ہیں۔ میرا کوئی زیاں نہیں کہ میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں۔ تم یہاں اس اسپتال میں ہو اور کسی طور اس افسوس ناک واقعے کا تعلق اسپتال سے بھی نکل آتا ہے اور اسپتال کا اپنا ایک نام اور اپنی ایک عزت ہے۔ مجھے تم پہلی نظر میں بہت سے نوجوانوں سے ایک مختلف نوجوان نظر آئے تھے، اس لیے......'' وہ کہتے کہتے رک گیا اور پہلو بدلنے لگا۔

''ایسی باتیں نہ کیجیے ڈاکٹر صاحب!'' میں نے عاجزی سے کہا۔ ''آپ نے مجھ ایک اجنبی کو بہت عزیز رکھا ہے، بہت اچھا سلوک کیا ہے مجھ سے، لیکن میری بدقسمتی ہے، عزت مجھے راس نہیں آتی۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ کچھ بھی غلط نہیں تھا۔ بہت سیدھی سی بات ہے۔ اپنے بھائی کے علاج کے لیے مجھے یہاں آنا پڑا تھا۔ بھائی کی کیا حالت تھی اور اب کیا ہے، یہ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ہم تو کہیں اور جا رہے تھے۔ بس یہاں آکے مجھ سے ایک چھوٹی سی غلطی ہو گئی۔ غلطی تھی بھی، یا نہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ایک ذرا سی بات اتنی دور تک جا سکتی ہے، پھر ایک کے بعد ان ہونی، ناگہانی سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ میں آپ کو کیا کیا اور کس حد تک بتاتا کہ پرسوں آدھی رات کے بعد آنے والے لوگ کسی اور کی نہیں، میری جستجو .... میں آئے تھے۔ نرس ایمی نے احتیاط کی، جانے کیا سوچ کے اس نے منع کر دیا کہ میں کمرے میں موجود نہیں ہوں۔ انہیں حجت کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ ادھر سے اسپتال کے عملے نے شور مچا دیا۔ ان کے تعاقب سے وہ درندے بوکھلا گئے اور بھاگ کھڑے ہوئے، مگر صدر دروازے پر انتھونی ان کے آڑے آ گیا اور اپنی جان دے بیٹھا۔ وہ لوگ تو مجھے ختم کرنے آئے تھے۔

میں کل صبح بھی آپ کو اصل بات بتا سکتا تھا کہ انتھونی کیوں مارا گیا۔ وہ غریب تو ایک طرح سے چارا بن گیا......اور اس نوجوان سے زندگی چھیننے والے ہی نہیں، اس سے پہلے، آپ کو یاد ہوگا، کمرے میں آپ کی موجودگی کے درمیان جو دو پولیس افسر آئے تھے، وہ بھی اس سلسلے کی کڑی تھے۔ پردہ پوشی بے مصلحت نہیں تھی ڈاکٹر صاحب! آپ میرے بھائی کا علاج جس تن دہی سے کر رہے ہیں، آپ نے میری تلخ باتیں جس تحمل اور ناز سے برداشت کیں، میرا تو رواں رواں آپ کا احسان

مند ہے......میری جگہ آپ ہوتے تو شاید یہی کچھ کرتے۔ میرے اور بھائی کے بارے میں آپ کے کسی ناخوش گوار تاثر سے بھائی کا علاج متاثر ہونے کا اندیشہ بے جا تو نہیں تھا۔ بھائی بیمار ہے اور آپ ڈاکٹر ہیں۔ کسی اور جانب آپ کی توجہ بھٹک جانے، ان ناگفتنی سے آپ کو دور رکھنے، خواہ مخواہ آپ کے منتشر اور پریشان ہو جانے کے خیال سے میں نے زبان بند رکھی۔ ایمی کو میں نے سارا کچھ بتا دیا تھا اور بہت کچھ نرس سیورین کو بھی۔ میری التجا پر وہ خاموش رہیں۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔" ڈاکٹر رائے الجھ کے بولا۔ اس کے چہرے پر وحشت چھائی تھی۔

"آ جائے گا اب سبھی کچھ۔" میں نے ناتوانی سے کہا۔ "مجھے آپ سے کچھ نہیں چھپانا۔ پردے کا اب کچھ حاصل نہیں۔ آپ جو چاہیں، فیصلہ کریں۔ جو ہو چکا ہے، اس سے بدتر کیا ہو سکتا ہے۔"

"میں، میں جاننا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر حتمی لہجے میں بولا۔

میں نے اسے بٹھل کو اسپتال میں داخل کرنے کے بعد دوسری صبح لباس تبدیل کرنے لیے ہوٹل جانے اور ڈاک خانے جا کے گھر تار دینے، بٹوا چھن جانے پر چور کا پیچھا کرنے اور وہاں پیش آنے والے حادثے کے متعلق بتایا۔ میں نے کہا، "مجھے جلد از جلد اسپتال واپس پہنچنا چاہیے تھا۔ لیکن ادھر پولیس نے تعاقب شروع کر دیا تھا۔ میری کوئی غلطی نہیں تھی، لیکن سامنے آ جانے کے بعد پولیس کے طریق کار، رسمی کارروائیوں، تفتیشی مراحل سے گزرنے میں وقت لگ سکتا تھا۔ شہر میں میرا کوئی شناسا نہیں تھا۔ ایک ہجوم تانگے کے پیچھے تھا، پولیس کے علاوہ، عام لوگ بھی۔ ایک جگہ سڑک کے موڑ پر تانگا ہجوم سے اوجھل ہوا تھا کہ تانگے سے کود کے میں قریب کی ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ راستے معلوم نہیں تھے، گلیوں گلیوں بھٹکتا رہا، پھر ایک جگہ ہجوم کا شور سن کے اور کوئی چارہ نہ دیکھ کے میں نے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں آنے والے شخص کو اپنی مشکل بتانے اور کچھ دیر کے لیے پناہ کی بھیک مانگنے کا نتیجہ بہتر نکلنے کی توقع نہیں تھی۔ اپنی صفائیوں اور صراحتوں کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ گلی کا کوئی راہ گیر مجھے ایک مکان کے دروازے پر کھڑا، مکان کے مکین سے حجت کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ پولیس والوں کو تانگے والے نے یقیناً بتا دیا ہوگا کہ میں کس جگہ، کس طرف کی گلیوں میں گم ہوا ہوں گا جوان کا رخ اس طرف ہو گیا تھا۔

دستک کے جواب میں دروازے پر نمودار ہونے والے شخص کو مجھے چاقو کی زد پر لینا پڑا۔ اسے گھر میں دھکیلتے ہوئے میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ وہ صاحب اکبر علی خاں تھے۔"

"اکبر علی خاں! وکیل صاحب؟" ڈاکٹر رائے حیرانی سے بولا۔

"وہ بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ سبھی کا جو حال ہونا تھا، وہ ہوا۔ مکینوں کی بود و باش، طور اطوار اور اپنے لیے اس گھر کی صورت حال سے مطمئن ہو کے میں نے اس طرح ان کے گھر میں گھسنے پر معذرت چاہی۔ اپنی آمد کا مقصد بتایا اور کچھ دیر پہلے ڈاک خانے والی گلی میں پیش آنے والا واقعہ سنایا۔ میں نے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا تھا، نہ کسی کو زک پہنچائی تھی۔ پناہ کے سوا میرا کوئی اور مطالبہ بھی نہیں تھا۔ وکیل صاحب نے میری روداد توجہ سے سنی۔ وہ دنیا دیکھے ہوئے ایک سچے اور کھرے آدمی تھے۔ انہیں مجھ پر یقین آ گیا۔ میں نے بھی پھر ان پر اعتبار کر کے چاقو جیب میں رکھ لیا اور بیوی بچوں کو بیٹھک سے گھر کے اندر جانے کی اجازت دے دی۔"

"تم سچ بول رہے ہو؟"

"میرے پاس یہی کچھ ہے کہنے کے لیے۔" میں نے کشیدہ لہجے میں کہا۔

"تم ہمیشہ چاقو پاس رکھتے ہو؟"

میں نے سر جھکانے پر اکتفا کی۔

"مگر کیوں؟ کس لیے؟"

"ہمیں ایسے واقعات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

ڈاکٹر کی پھیلی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" وہ گہری سانس بھر کے بولا۔ "تو تم نے اکبر علی خاں صاحب کو قائل کر لیا۔"

میں نے اسے بتایا، یہ اتفاق تھا، یا یوں کہیے، میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اکبر علی خاں جیسے صاحبِ دل کے مکان پر دستک دی۔ انہوں نے مجھ سے ہم دردی کا اظہار کیا اور مجھے اس عذاب سے نجات دلانے کے لیے طرح طرح کی تدبیروں پر غور کرتے رہے۔ ڈاک خانے کی گلی میں جس آدمی کی پسلی میں چاقو پیوست ہو گیا تھا اور جس بدحواس آدمی نے ناپختگی اور نادانستگی میں اپنے ہی ساتھی کو زخمی کر دیا تھا وہ اور وہ تیسرا بھی، جس نے میری جیب سے بٹوا چرایا تھا، تینوں شہر کے نامی گرامی استاد میدا کے آدمی تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی زبانی مجھے میدا استاد سے ان کی وابستگی کا علم ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر کچھ بولنا چاہتا تھا، لیکن خاموش رہا۔ میں نے کہا کہ ہر جگہ، شہر کے دادا، یا استاد کے اڈے کی ہیبت چھائی رہتی ہے۔ پولیس بھی کسی سنگین واردات میں دادا اور اس کے ساتھیوں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے دس مرتبہ سوچتی ہے۔ ظاہر ہے، میدا استاد کے آدمیوں کے اشارے پر پولیس حرکت میں آئی تھی۔ میدا کا ایک ساتھی زخمی ہو گیا تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ بھی رہ سکے گا یا نہیں۔ میں تو فوراً گلی سے چلا آیا تھا۔ اس تمام واقعے کے گواہ گلی کے مکین اور راہ گیر تھے، لیکن یہ میدا استاد کے اڈے کا معاملہ تھا۔ گلی کے لوگ اور راہ گیر اس کے زور و اثر سے واقف تھے۔ طاقت سب سے بڑا سچ ہوتی ہے۔ اڈے کے ساتھیوں اور عام لوگوں کی نظروں میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے استاد میدا کو فوراً سرگرم ہو جانا چاہیے تھا۔ پولیس اور شہر میں بکھرے ہوئے میدا کے ساتھیوں سے اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے اسپتال پہنچنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اکبر علی خاں نے معاملہ دب جانے تک مجھے اپنے گھر میں روپوش ہونے کا مشورہ دیا اور مہربانی کی انتہا کر دی۔ انہوں نے کہا کہ میری عدم موجودگی میں وہ اسپتال جا کے بٹھل کی خبر گیری، نگرانی کرتے رہیں گے۔ اس دوران، بہتر ہوگا کہ میں تار دے کے اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سے کسی کو یہاں بلا لوں، مگر ان کا کوئی مشورہ صائب نہیں لگتا تھا۔ مجھے یاد تھا ڈاک خانے والی گلی میں، میں نے میدا کے بددماغ ساتھیوں سے اسپتال کا ذکر کیا تھا۔ تانگے والا بھی مجھے اسپتال سے ہوٹل، پھر ڈاک خانے لے گیا تھا اور واپسی میں بھی اس کا رخ اسپتال ہی کی طرف تھا۔ ان شواہد اور اسپتال سے میرے غیاب اور اکبر علی خاں کی موجودگی سے وہ ساری صورت حال بھانپ لیتے اور یوں اپنے گھر میں مجھے پناہ دینے کی فیاضی اکبر علی خاں کو بڑی مہنگی پڑ سکتی تھی۔ بٹھل کو اس حالت میں تنہا چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ مریض کو چھوڑ کے تیمار دار کے غائب ہو جانے پر سب سے زیادہ وحشت اسی کو ہوتی، اس کے دماغ میں جانے کیسے کیسے وہم نمو پاتے، اسپتال کے عملے میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگتیں، ویسے بھی مجھے یقین تھا میں اسپتال پہنچنے میں کام یاب بھی ہو جاؤں تو جلد یا بہ دیر میدا اور اس کے حاشیہ بردار سرا پکڑتے ہوئے میرے سر پر آ دھمکیں گے۔ میں نے اکبر علی خاں کے سارے مشورے مسترد کر دیے اور

میدا استاد سے بہ ذات خود ملنے کا ارادہ کیا۔ اکبر علی خاں نے مجھے بہت سمجھایا بجھایا۔ میدا جیسے خطرناک آدمی سے دور رہنے کی تلقین کی، لیکن پھر اور کیا صورت تھی۔ میرے ارادے میں کوئی لچک نہ دیکھ کہ انہوں نے خود بھی میرے ساتھ چلنے کی جرأت کرلی۔ میں انہیں اس معاملے سے الگ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں مانے اور ہم دونوں میدا کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔"

"میدا کے ٹھکانے پر؟" ڈاکٹر رائے اچھل پڑا۔ "یہ جانتے ہوئے کہ میدا کون آدمی ہے۔"

"پھر میں کیا کرتا۔ یہی ایک آخری راستہ رہ جاتا تھا۔ میں خود اس کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے سچ بتاؤں کہ میں نے اس کا کوئی آدمی زخمی نہیں کیا ہے۔ میں ایسے وقت جب میرا بھائی زندگی کے لیے جدوجہد کررہا ہے، کس طرح کسی عناد وفساد کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ میرا خیال تھا وہ اڈے کے طور طریقوں میں کھرا ہے جیسا کہ اڈوں کی چوکی پر بیٹھنے والے بیش تر دادا، استاد لوگ ہوتے ہیں تو وہ میری بات سنے گا۔ میں میں اس سے کہوں گا کہ گلی کے لوگوں سے تصدیق کیے بغیر اسے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ میرا بٹوا چھینا گیا تھا۔ چوروں کا تعاقب کرکے اور اسے زیر کرکے میں نے بٹوا حاصل کرلیا تو کیا غلط کیا تھا۔ پھر اس کے دو ساتھی اپنے چور ساتھی کا انجام دیکھنے کے باوجود زیادتی پر کیوں اتر آئے۔ انہیں جاننا چاہیے تھا کہ کوئی آدمی، چور کو قابو میں کرسکتا ہے تو ان کے لیے بھی بھاری پڑ سکتا ہے۔ وہ چند ہاتھ کے بھی نہیں تھے۔ بات بڑھ جانے کے خیال سے میں نے ہاتھ باندھے رکھے، اپنا چاقو بھی نہیں نکالا۔ وہ دونوں جانے کس خمار میں تھے، اپنے ساتھی کی ہزیمت سے ہوش وحواس کھو بیٹھے تھے مرنے مارنے پر تل پڑے۔ رفع شر کے لیے میں نے اپنا بٹوا بھی ان کی نذر کرنا چاہا۔ گلی کے لوگوں کو میدا کی ہیبت دہشت سے امان ملے تو ضرور سچ بولیں گے۔ میں نے سوچا، میدا سے کہوں گا کہ میری اس کی کوئی عداوت نہیں ہے۔ مجھے تو اپنے بھائی کی وجہ سے اس شہر میں رکنا پڑا۔ حقیقت اس سے کچھ دور نہیں ہے۔ اسے پٹنا میڈیکل کالج کے اسپتال تک جانے کی زحمت کرنا پڑے گی لیکن میدا کے سامنے جاکے میں نے یہ کچھ نہیں کہا۔ ایک نظر میں اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے بہت عرصے سے چاقو اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ جسم پر چربی کی ہلکی سی تہہ جم چکی تھی۔ آدمی کے جسم پر اگتی چربی لوہے سے چمٹنے والے زنگ کے مانند ہوتی ہے۔ میں نے استاد میدا سے کہا، میں اڈے کی چوکی کا دعوے دار بن کے آیا ہوں۔ اڈوں کی جوریت ہے، وہ چوکی سے خود اتر جائے یا پھر چاقو نکال کے تمام ساتھیوں کے سامنے دعوے دار سے زور کرے اور چوکی پر موجود رہنے کا حق ثابت کرے۔"

"تم نے اس کے ٹھکانے پر جاکے اسے چاقو آزمائی کی دعوت دی؟" ڈاکٹر رائے ہیجانی آواز میں بولا، "تم ...... تم۔" وہ ہکلانے لگا اور اس نے پوچھا، "کس اعتماد میں ......؟"

"کہ میں اسے زیر کرلوں گا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"یعنی تم اسے زیر کرسکتے تھے؟"

"کسی قدر امکان مغلوب ہوجانے کا بھی تھا۔"

"تو، تو کیا ہوتا؟" ڈاکٹر رائے نے تلخی سے پوچھا۔

"میں زیر ہوجاتا۔ یوں بھی تو اس کے شکنجے میں تھا۔"

"تمہیں اپنی چاقو بازی پر اتنا اعتماد کس وجہ سے ہے؟"

"صرف چاقو نہیں، اور بھی ایسی کئی چیزوں کی مجھے تربیت دی گئی ہے۔"

"تربیت دی گئی ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اقرار لیا۔ "میری زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش ئے کہ مجھے یہ سب کچھ سیکھنا پڑا۔"

"تم تو ایک پڑھے لکھے نوجوان معلوم ہوتے و۔"

"یہ بھی ایک تعلیم ہے، اپنے آپ کو خطروں ے نمٹنے کے لیے تیار رکھنا۔ یہ بھی تو زندگی کا ایک نصہ ہے۔"

اس کے ہونٹ سکڑ گئے اور اس نے سر ہلا کے نذبذب سے تائید کی "تو میدا چوکی سے اتر آیا؟"

"اتنا آسان نہیں تھا اس کے لیے۔ وہ جانے کب سے اڈے کی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔" میں نے ڈاکٹر رائے کو ساری تفصیل بتائی کہ اپنے ٹھکانے پر ایک اجنبی کی اس طرح اچانک آمد اور مبارزت کے لیے مسلسل اصرار سے اسے چوکنا اور محتاط ہوجانا چاہیے تھا۔ ڈاک خانے والی گلی کا واقعہ بھی پیشِ نظر ہوگا۔ اڈے پر اس کے تقریباً سارے ساتھی موجود تھے۔ اس کا تو سب کچھ داؤ پر لگ چکا تھا، منصب، عزت، دبدبہ۔ اس نے میرا مذاق اڑانے، پھبتیاں کسنے اور زور آزمائی کے نتیجے میں ذلت ورسوائی سے دوچار ہوجانے، طرح طرح سے میرا عزم شکستہ کرنے اور خبردار کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران اکبر علی خاں نے دخل اندازی کی اور جتنے موثر انداز میں میری پے روی کرسکتے تھے، انہوں نے اپنا ہنر آزمایا۔ انہیں احساس تھا، یہ عدالت نہیں ہے۔ وہ ایک مختلف جگہ پر اور مختلف لوگوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ انہیں نت نئی دلیلیں تراشنے اور بیان میں سوز وگداز پیدا کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دلیل وبیان صداقت پر مبنی ہوں تو ان کی توانائی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ان کا انداز غیر جانب دارانہ، نپا تلا اور جو کچھ میں نے ان سے کہا تھا اور انہوں نے یقین کرلیا تھا، بجنسہ اسی کے مطابق تھا۔ جو سچ اڈے پر جاکے میں استاد میدا کو باور کرانا چاہتا تھا اور میدا کو دیکھ کے میں نے ارادہ بدل دیا تھا، وہ کام نہایت خوش وضعی سے اکبر علی خاں نے انجام دے دیا تھا۔

اڈے کے لوگوں کے ہجوم میں میدا کو اپنی بات بنی رہنے کی بے چینی شدید ہوگی۔ اکبر علی خاں کے بیان نے اسے کئی جواز فراہم کردیے تھے، مجھ سے کشادہ دلی کا سلوک کرنے اور سردست یہ نازک مرحلہ حسن وخوبی سے ٹل جانے کے جواز۔ میدا کے پہلو نشیں عمر رسیدہ شخص نے یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس آزمودہ کار نے دریا دلی کے اظہار میں پہل کی اور درمیان کی راہ نکالی اور میدا کو بظاہر بادل ناخواستہ ایک فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا۔ میدا نے اپنے ساتھیوں کی دل جمعی کے لیے چاقو نکال لیا تھا اور چوکی سے اترا چاہتا تھا کہ بزرگ ساتھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کے چاقو اپنی تحویل میں لے لیا اور کوئی لمحہ گنوائے بغیر نشانہ لے کے میری طرف اچھال دیا۔ میں نے اسے اچک لیا۔ میں انکار کرسکتا تھا، لیکن میں نے وقت کی یہ رعایت غنیمت جانی کہ مجھے میدا کے اڈے، چوکی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ مجھے تو اسپتال پہنچنے کا راستہ صاف کرنا تھا۔ جواب میں میں نے بھی اپنا چاقو بوڑھے آدمی کی طرف اچھال دیا جو اس نے مہارت سے گرفت میں لے لیا۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" ڈاکٹر نے بے چینی سے پوچھا۔

میں نے اس کنائے کا مطلب اسے سمجھایا کہ سردست مبارزت ملتوی کی جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے چاقو ایک دوسرے کے پاس اس وقت تک امانت رہیں گے جب تک میں اپنا چاقو واپس لینے نہ آجاؤں۔ بزرگ نے میدا کی طرف سے اعلان کیا کہ میدا مبارزت کے لیے آمادہ ہے، لیکن ایسے وقت میں جب اس کی ہم سری کا دعوا کرنے والا، اڈے کی چوکی کا طلب گار اپنے بھائی کی

علالت کی وجہ سے پریشان اور منتشر ہے، معرکہ آرائی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ میدا اپنے مقابل کو ذہنی پراگندگی سے چھٹکارا پانے کی مہلت دیتا ہے کہ اس پر مخالف کی مضطربانہ حالت سے فائدہ اٹھانے کا الزام نہ آنے پائے۔ یہ میدا کے اپنے اطمینان کا معاملہ بھی ہے کہ کسی یک سو مخالف سے پنجہ آزمائی کرکے ناکامی اور کام یابی، دونوں صورتوں میں اسے خود سے کوئی شکایت اور اپنے ساتھیوں کے سامنے ندامت نہیں ہوگی۔ سن رسیدہ آدمی نے مجھے یہ جتانا ضروری سمجھا کہ یہ مہلت میدا کی اعلاظرفی پر محمول کی جائے۔ میدا مبارزت کے لیے میری جلد از جلد واپسی کا منتظر رہے گا۔

اس التوا میں کئی پہلو مضمر تھے۔ چوکی چھن جانے کا خطرہ میدا کے سر سے ٹل گیا تھا۔ اڈے کے آدمیوں کی نظروں میں بڑی حد تک اس کا وقار بحال رہا تھا۔ اس مہلت میں میری طرف سے چوکی کے مطالبے سے دست برداری اور نظرِ ثانی کا ایک امکان موجود تھا کہ بھائی کی صحت یابی کے بعد میری جانب سے نرمی و نرم دلی کی توقع بجا طور پر کی جاسکتی تھی۔ میدا کو چوکی بچانے کی تدبیروں پر غور کرنے کا وقت مل گیا تھا۔ اس عرصے میں میرا قصہ تمام کردینے کی ایک کوشش بھی کی جاسکتی تھی۔ اس مہلت کی بڑی اہمیت تھی۔ فیصلے پر میں نے کوئی حجت نہیں کی۔ چاقوؤں کے تبادلے سے میری مراد میرا اقرار ہی تھی۔ ہم دونوں، میں اور اکبر علی خاں پھر وہاں سے چلے آئے اور راستے میں کوئی دیوار نہ بنا۔

ڈاکٹر رائے چند لمحے چپ رہا پھر بھاری آواز میں بولا، ”اگر یہ صورت نہ ہوتی؟ میدا اور تمہارے درمیان ہونے والی زور آزمائی میں تم کامیاب ہوجاتے تو اڈے کے آدمی تمہیں بہ خوشی اپنا استاد قبول کرلیتے؟“

میں نے کہا، ”بہ خوشی تو شاید نہیں، لیکن اڈوں کے لوگ اپنے ریتی رواج کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اڈوں کا یہی دستور ہے کہ سب سے زیادہ زور آور ہی چوکی کا سزاوار ہوسکتا ہے۔ مستعد، درست اور جلد فیصلے کرنے میں طاق اور اڈے کے آدمیوں پر سایہ بنے رہنے کی خوبیاں مستزاد ہیں۔ کسی ناتواں اور مجہول کو وہ چوکی پر دیکھنا پسند نہیں کرتے لیکن پسند کی بات اور ہے، انہیں یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اڈے پر موجود استاد کو چوکی سے ہٹا سکیں۔ انہیں بہ جبر سہی اس وقت تک اسے قبول کرنا پڑتا ہے جب تک اس اڈے سے یا باہر سے چوکی کا کوئی نیا طلب گار نہ آجائے اور چوکی پر بیٹھ نہ جائے۔ اڈے کی چوکی کا فیصلہ فرد، فرد ہی کے درمیان ہوتا ہے۔ اڈے کے لوگ باہمی مشاورت سے کسی ایک کو منتخب نہیں کرسکتے۔ ادھر اڈے کی چوکی پر قائم استاد کے سر پر ہمیشہ تلوار لٹکی رہتی ہے۔ اسے کسی بھی نئے دعوے دار سے مبارزت کے لیے ہر وقت کمربستہ رہنا پڑتا ہے۔ اگر وہ سمجھتا ہے کہ دعوے دار کس بل میں اس سے زیادہ توانا ہے تو بہتر یہی ہوتا ہے، وہ خاموشی سے خود ہی چوکی خالی کردے۔ ضد اور غصے سے ذلت کا بھی سامنا کرنا پڑسکتا ہے، بزرگ آدمی نے میدا کی عزت رکھ لی۔ اس نے اڈے کے لوگوں کے سامنے ظاہر یہی کیا کہ میدا نے اس کی بات مان کے اس کا مان رکھا ہے اور بڑا احسان کیا ہے۔“

”تمہیں ان اڈے پاڑوں کی اتنی معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں؟“ ڈاکٹر نے تعجب سے پوچھا۔

”مجھے اسی سوال کی توقع تھی۔“ میں نے کسی تامل کے بغیر جواب دیا۔ ”میرا اڈوں پاڑوں سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے۔“

ڈاکٹر نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ”تو کام یاب ہوجانے کے بعد تم میدا کے اڈے کے مالک بن جاتے۔“ اس نے تکرار کی۔

”میں نے آپ کو بتایا ہے۔ میدا کو دیکھ کے میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ میرا یہی خیال تھا کہ اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے کسمساتی آواز میں کہا، ”میں جاننا چاہتا ہوں۔ اڈے کے چوکی پر تم بیٹھنا نہیں چاہتے تھے، پھر تمہاری کام یابی کے بعد اڈے کی سربراہی کی کیا صورت ہوتی؟“

”میں اپنی جگہ کسی کو بھی عارضی طور پر نام زد کرسکتا تھا۔ اس معمر آدمی کو بھی، جو میدا کا مربی معلوم ہوتا تھا، لیکن وہ اڈے کا سربراہ نہیں ہوتا۔ کسی نئے دعوے دار کے اٹھنے کے...... موقع پر مجھی کو اس سے مبارزت کرنی پڑتی۔ اڈے کے عبوری سربراہ کو نہیں۔“

”میرے لیے یہ سارا کچھ حیران کن ہے۔“ ڈاکٹر رائے آنکھیں چڑھا کے بولا ”یہ تو ایک دوسری دنیا ہے۔“

”میں اسی لیے آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔“

ڈاکٹر نے جھرجھری لی۔ ”تم نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اگر میدا استاد تیار ہوجاتا اور تم......“

میں نے اس کے اندیشے کی تردید کی۔ ”چاقو آزمائی کے لیے بل کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ حاضر دماغی، نگاہ کی برجستگی، مقابل کو حیلوں سے تذبذب کردینے کی مشاقی اور بہت سی باتیں...... میدا کو مجھ اجنبی کے زور اور مہارت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی تردد کرتا۔ اپنے تین آدمیوں کا انجام دیکھنے اور اڈے پر میرے اس طرح آدھمکنے کے بعد ذہنی طور پر زچ ہوجاتا، سو اس کے لیے یہی مناسب تھا کہ مجھے مہلت دینے کی فیاضی کے بہانے اسے کچھ مہلت مل جائے۔“

”تم نے پہلے کبھی میدا جیسے کسی استاد سے چاقو آزمائی کی ہے؟“

مجھے جھجک ہوئی، ایک لمحے کے توقف کے بعد میں اقرار کرلیا۔

”واقعی؟“ وہ حیرت سے بولا۔ ”اور انجام؟“

”انجام بہتر ہونے کی توقع نہ ہو تو اپنے مخالف کو دعوت نہیں دینی چاہیے۔“

”تو ...... تو...... تم بھی کسی اڈے پاڑے کی چوکی پر بیٹھتے رہے ہو؟“

”نہیں......“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”چند روز...... ایک بار کچھ زیادہ...... اپنا آدمی مقرر کرکے میں ہر جگہ سے چل دیا۔“ ڈاکٹر کے کوئی اور سوال کرنے سے پہلے میں نے صراحت کی۔ ”کئی اڈے حاصل کیے اور اپنی مرضی سے نہیں۔ کسی جگہ اڈے کے استاد نے کوئی رکاوٹ کھڑی کی یا اس نے کسی مظلوم شناسا، کسی دوست سے زیادتی کی، ظلم روا رکھا تب......“

”اور اڈا حاصل کرنے کے بعد تم وہاں سے چلے آئے؟“

”جی ہاں۔ اس لیے کہ میرا کام اڈا گیری نہیں ہے۔“

”کتنے اڈوں کے استادوں سے تم نے زور آزمائی کی؟“ ڈاکٹر رائے کی بے قراری بڑھتی جارہی تھی۔

”گنتی یاد نہیں ڈاکٹر صاحب۔“

”یعنی بہت سے......؟“

”بہت زیادہ تو نہیں۔“

”اور سبھی میں تم سرخ رو ہوئے؟“

میں خاموش رہا۔ خاموشی ہی میرا جواب تھی۔

ڈاکٹر رائے کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کی پلکیں پٹ پٹا رہی تھیں۔ ”تمہارا بھائی بھی ان فنون میں کوئی درک رکھتا ہوگا؟“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”جی ہاں۔“ میں نے مختصراً کہا۔

”تم سے زیادہ؟“

”میں کیا۔ وہ تو دوسرے آدمی ہیں۔ میں ان کے لیے کیا کہوں۔ آپ نے تو انہیں صرف اس

حالت میں دیکھا ہے۔ میں نے ایسی بے چارگی، ایسی غفلت میں انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ وہ تو سوتے میں بھی جاگتے رہتے تھے۔ دیوار پار کا انہیں نظر آجاتا ہے۔ دور دور کی آوازیں ان تک رسا ہو جاتی ہیں۔ ان کا سینہ تو کوئی سمندر ہے۔ ان کے بہت سے بازو ہیں...... وہ تو ایک سایہ ہیں بہت سوں کے لیے...... اور وہ تو کسی چٹان کے مانند ہیں۔ اس حال میں انہیں دیکھ کے مجھ پر جو گزرتی ہے، وہ آپ نہیں جان سکتے۔ وہ، وہ ان سارے فنون میں طاق ہیں۔ میں نے سب کچھ انہی سے سیکھا، لیکن ان کی برداشت، ان کا حوصلہ، ان کا عزم...... میں تو کچھ نہیں ہوں ان کے آگے...... میں کیا......" میری آواز رندھنے لگی۔

ڈاکٹر آنکھیں میچے دیر تک چپ رہا، پھر یکایک ہڑک کے بولا، "تمہارا بھائی بھی کسی اڈے پاڑے کا راجا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کسی اکراہ کے بغیر جواب دیا، "لیکن اب تو بہت دنوں سے وہ میرے ساتھ مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔"

"سفر! سفر کیوں، کاروبار کے سبب سے؟"

"نہیں، کاروبار نہیں۔"

"پھر......؟" مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ دیا جا سکا۔ مجھے متردد دیکھ کے اس نے کہا، "کوئی ایسی بات ہے جو مجھ سے نہیں کہنی چاہیے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ کچھ اور مت سوچیے۔ اس معاملے کا اڈے پاڑے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک طویل روداد ہے اور بہت ذاتی ہے۔ اس کی تفصیل پھر کبھی سہی۔ مختصراً یہ کہ ہمیں اپنے کھوئے ہوئے کسی عزیز کی تلاش ہے۔ ہم ہر طرف اسے ڈھونڈ رہے ہیں، گلیوں گلیوں، شہروں شہروں۔"

"کھوئے ہوئے عزیز کی؟" ڈاکٹر کے چہرے پر لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ "کون ہے وہ......؟"

"ہے ایک، جو بچھڑ گیا ہے۔ کیا بتاؤں آپ کو۔"

"کب سے یہ تلاش جاری ہے؟"

"کئی برس ہو گئے، اب تو کوئی چار پانچ سال۔" میں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں بہت کچھ چھپا سکتا تھا، لیکن یقین کیجیے، میں نے کچھ نہیں چھپایا ہے۔ اس لیے کہ آئندہ پیش آنے والے واقعات سے آپ منتشر نہ ہو جائیں اور میرے بھائی کا علاج آپ کے کسی تکدر، برہمی اور تجسّس سے متاثر نہ ہو جائے۔"

"ہشت۔" ڈاکٹر رائے دھتکارتی آواز میں بولا، "کیا فضول بات کر رہے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ ڈاکٹر کے سامنے اس کا مریض محض انسان ہوتا ہے۔ وہ چور ہو، یا ڈاکو، یا اڈے پاڑے کا آدمی، لیکن ڈاکٹر بھی انسان ہی ہے۔ انسان ناراض بھی ہوتا ہے، اسے غصہ بھی آتا ہے، دل میں گرہ پڑ جاتی ہے۔

میں نے صاف صاف کہا کہ میں اسے یہ سب بتانے کا پابند نہیں تھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسپتال مندر مسجد نہیں ہوتے۔ چھوت اچھوت، سبھی کے لیے دروازے کھلے ہوتے ہیں، میں یہاں ایک مریض لے کے آیا تھا۔ مریض اور ڈاکٹر کا جو تعلق ہوتا ہے، اسے وہیں تک محدود رہنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر رائے نے میرا بڑا لحاظ کیا۔ پہلی رات معمول کے خلاف وہ میری درخواست پر بٹھل کو دیکھنے آگیا۔ اس نے بدتہذیبی اور گستاخی کی حد تک میری تند و تیز باتیں برداشت کر لی تھیں۔ اس نے اسپتال کے بہ ترین کمرے میں ہمیں منتقل کیا اور علاج پر ہر ممکن توجہ مرکوز رکھی۔ کئی اور ڈاکٹروں کو بھی مشاورت میں شریک کیا۔ اس کا یہی احسان اتنا بڑا ہے کہ میں تو اس کے سامنے سر بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ پہلے دن اسپتال سے باہر جانے کے بعد میں شام کو واپس آیا

تو اس مشفق اور نیک نفس آدمی کو یہ بتا کے میں کیوں پریشان کرتا کہ میں کیسی دیوار ِس عبور کر کے اسپتال پہنچ پایا ہوں۔ جس رات انھونی بے موت مارا گیا، میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ لوگ تو مجھے ختم کرنے کے درپے تھے، لیکن اکبر علی خاں کے سانحے کے بعد صورت بدل چکی ہے۔ پولیس آنے والی ہوگی۔ لاعلمی میں ڈاکٹر رائے کے ذہن میں میرے اور بٹھل کے متعلق کیسے کیسے وہم، کیسی کیسی بدگمانیاں نمو پا سکتی تھیں۔

"بس بس، میں، میں سمجھتا ہوں۔" ڈاکٹر رائے نے ہاتھ اٹھا کے مجھے روک دیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، لاعلمی میں مجھے حیرت بھی ہوتی، اذیت بھی۔ پولیس یقیناً یہاں پہنچتی ہوگی۔ تم نے کیا سوچا ہے پھر؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا ڈاکٹر صاحب! میں کیا کہہ پاؤں گا، کس طرف اشارہ کروں گا۔ شاید وہ مجھے ساتھ لے جائیں۔ تو ٹھیک ہے، لے جائیں، لیکن پھر یہاں بھائی کے پاس کون ہوگا۔ کوئی تو ہونا چاہیے ان کے ساتھ۔"

"وہ تو ہم لوگ دیکھ لیں گے۔" ڈاکٹر بے پروائی سے بولا۔

"بھائی پوچھیں تو آپ کیا بتائیں گے؟"

"کچھ نہ کچھ تو کہنا ہوگا۔"

"وہ نہیں مانیں گے۔ آپ انہیں جانتے نہیں۔ وہ بہت سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ بے کل ہو جائیں گے۔"

"دیکھ لیں گے۔" ڈاکٹر اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ کل ہی اکبر علی خاں کے مشورے سے انہی کے ذریعے کلکتے تار دیا تھا، ایک نہیں، دو ارجنٹ تار، یہاں کے مشکل حالات دیکھ کے اپنی دسرات کے لیے ایک دو آدمی بلائے تھے۔ اب تک تو کسی کو آ جانا چاہیے تھا۔

"کون ہیں وہ؟" ڈاکٹر نے چونک کے پوچھا۔

"انہیں بھائی کا خدمت گار سمجھیے۔"

"سمجھیے، کیا مطلب؟" اس کے لہجے میں ترشی آ گئی۔

"بھائی کے پروردہ ہیں وہ۔"

"ان کا تعلق بھی اڈے پاڑے سے ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کلکتے سے آ رہے ہیں وہ۔ کلکتے ہی میں تمہارے بھائی کا اڈا ہے؟"

"کبھی تھا اور ہاں، ہے بھی۔ اڈا تو انہی کے نام سے قائم ہے۔" میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا، "لیکن اب تو عرصے سے وہ وہاں نہیں بیٹھتے۔ میں نے آپ کو بتایا نا کہ وہ عرصے سے میرے ساتھ سفر کرتے ہیں۔"

"یاد پڑتا ہے، تم نے شروع میں کہا تھا کہ تمہارا گھر فیض آباد میں ہے۔"

"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہم فیض آباد ہی سے آ رہے ہیں۔ وہاں سے بھی کسی کو بلایا جا سکتا تھا، لیکن گھر میں اطلاع دینے سے سبھی پریشان ہو جاتے۔"

"یہ آنے والے لوگ بھی چاقو باز ہوں گے؟"

"آپ کی اور میری طرح اڈے کا ہر آدمی، پہلے آدمی ہوتا ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ غیر ارادی طور پر تن سا گیا۔

"ہاں، ہاں، پہلے آدمی، بعد کو چاقو باز۔" ڈاکٹر رائے ناگواری سے بولا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔"

اس کے پے در پے سوالوں سے میری رگیں اینٹھنے لگی تھیں، لیکن اس کے ہر سوال کا جواب مجھ پر واجب تھا۔ کہیں ذرا سا ابہام رہ جانے کی صورت میں اس کے دل میں شک کی گرہ پڑ سکتی تھی۔ وہ کتنا ہی تردید کرے۔ ہر ذہین آدمی کا وتیرہ شک ہوتا ہے۔ وہ تو یوں بھی ایک نکتہ رس اور جزو بیں شخص تھا۔ کوئی معمولی آدمی اتنا بڑا اور کامیاب ڈاکٹر نہیں ہو سکتا۔ میری دانست میں اب بہت کچھ آئینہ ہو چکا تھا۔ مجھے اور کسی معذرت خواہانہ لہجے کی بھی ضرورت نہیں تھی، لیکن اس کے ظرف کا خیال ہر لمحے ملحوظ رکھنا تھا۔ وہ بار بار کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ اس دوران میں خود کو اس کے کسی ناروا سوال کے لیے آمادہ کرتا رہتا۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں کسی ممتحن کے سامنے بیٹھا ہوں، یا عدالت کے کسی جج کے روبہ رو۔ اڈے کے کسی استاد سے زور آزمائی کرتے وقت شاید مجھے کسی اتنی کشاکش کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہو جتنی ڈاکٹر رائے کی دھند دور کرنے کے اس مرحلے میں نازکی کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا۔ ہر لمحے مجھے خود کو ٹوکنا پڑتا کہ وہ بٹھل کا معالج ہے اور بٹھل ابھی بستر پر ہے۔ ڈاکٹر رائے اس اسپتال کا نگراں ہے۔ اسپتال کے روایتی پرسکون ماحول میں ہماری آمد کے بعد مسلسل کوئی نہ کوئی ان ہونی ہوتی رہی ہے۔ اسپتال میں آدھی رات کے بعد مسلح آدمیوں کی یلغار، انھونی کی موت، پولیس کی آمد اور اب اکبر علی خاں کی ہلاکت کے بعد ڈاکٹر رائے میرے اور بٹھل کے لیے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

"تم نے کہا ہے، پولیس تمہیں ساتھ بھی لے جا سکتی ہے، مگر کیوں؟" اس نے تیز آواز میں پوچھا۔

"پولیس کا اپنا طرق کار ہوتا ہے۔ یہاں میں اجنبی ہوں اور بہت بے سہارا بھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ پولیس کو اپنے اختیار سے سوا کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ ادھر میدا کے اڈے سے آئے ان کے واسطے کی مروت میں مجھ سے پولیس کا رویہ معاندانہ بھی ہو سکتا ہے۔ پولیس کے جانے کتنے لوگ میدا کے اڈے کا نمک بھی کھائے ہوئے ہوں گے۔"

"اس پیچیدہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے تم نے بھی کچھ غور کیا ہوگا؟" ڈاکٹر کی آواز اکھڑی ہوئی سی تھی۔

"کیا بتاؤں۔" میں نے بے ربطی سے کہا، "شاید مجھے ایک وکیل کی ضرورت پڑے۔ وکیلوں کا یہی کام ہوتا ہے۔ آپ شہر کے کسی بہت بڑے وکیل کو ضرور جانتے ہوں گے۔ اطمینان رکھیے، کتنا ہی مہنگا وکیل ہو، میں اس کی فیس ادا کر سکتا ہوں اور واضح رہے، یہ اڈے پاڑے کا پیسا نہیں ہے۔ روپے پیسے کی انہیں ایسی طلب نہیں ہوتی جتنی زور اور اپنی ساکھ کی۔"

"تم...... تم اڈے بازوں کی وکالت کر رہے ہو مجھ سے۔" ڈاکٹر رائے جھلا کے بولا۔

"میں آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔ آپ نے اتنی باتیں جانی ہیں تو یہ بات بھی آپ پر صاف ہو جائے۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے یکا یک کرسی سے اٹھ گیا۔

"ایک بات کہنی ہے آپ سے۔" اس کے کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے رکی رکی آواز میں کہا۔

کرسی سے اٹھ کے اس نے اپنا لباس جھٹکا، شکنیں درست کیں اور کسی قدر بے اعتنائی سے بولا، "بولو، کیا بات ہے؟"

"میں اکبر علی خاں کے گھر جانا چاہتا ہوں۔" میں نے نظریں جھکا کے کہا۔

"کیا......؟" اس کا جسم اکڑ گیا۔ "تم...... تم وہاں جانا چاہتے ہو؟"

"مجھے جانا چاہیے۔ دو تین دن میں سہی، ان سے جو ایک غیر معمولی ربطِ خاطر ہو گیا تھا تو مجھے وہاں جانا چاہیے۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟" وہ درشتی سے بولا۔

"میری وجہ سے وہ اپنی جان سے گئے۔ ان کا ایک آباد گھر تھا۔ میری وجہ سے اجڑ گیا۔ اس دن نہ میں ان کے گھر میں داخل ہوتا نہ اس گھر پہ یہ بربادی

آتی۔ میرے حال پر ترس کھا کے وہ مجھ سے اتنے قریب ہو گئے تھے۔ مجھے اپنا کوئی بہت قریبی عزیز، بھائی سمجھنے لگے تھے اور مجھے بھی یہی محسوس ہوتا تھا۔
کل رات اپنے گھر، بیوی بچوں کی نہایت ذاتی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی بیٹی کے لیے کسی نواب کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا۔ وہ بہت کش مکش میں تھے۔ صاف انکار بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ مجھ سے پوچھتے تھے کہ وہ کیا کریں، کس طرح نواب کو مطمئن کریں۔ وہ اپنی بیوی کے شیدائی تھے، بڑے احترام، بہت محبت سے وہ بیوی کا ذکر کرتے تھے۔ لگتا تھا، دونوں یک جان ہیں۔ وہ تو خود سراپا احترام، سرتاپا محبت تھے۔ میں نے اس گھر کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ کیسا مثالی گھر تھا۔ مثالی لوگ وہاں بستے تھے۔'' میری آواز میرے قابو میں نہیں رہی۔ آنکھوں میں جیسے آگ بھڑک اٹھی ہو اور سینہ جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔ میں نے اپنا ماتھا جکڑ لیا۔
میرا جی چاہا کہ دیوار سے سر پھوڑ لوں۔
''اوہ، نہیں...... نہیں۔'' ڈاکٹر نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ''اپنے آپ کو سنبھالو۔'' وہ میری کمر تھپکنے لگا۔
میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے دوبارہ مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ ''تم وہاں نہیں جا سکتے۔'' اس نے حتمی آواز میں کہا۔
''نہیں جاؤں گا تو میرے سینے...... میں خود کو کس طرح......'' میری آواز آنسوؤں میں بہہ گئی۔
''یوں وہ واپس نہیں آ جائیں گے۔''
''میں ان کے جنازے میں بھی شریک نہ ہوں؟'' میں نے بلکتی آواز میں کہا، ''میں جانتا ہوں، ان کے بیوی بچوں کے سامنے کس طرح جا پاؤں گا، کس منہ سے ان کے سامنے جاؤں گا، لیکن مجھے......''
''تمہیں دیکھ کے ان کا غم اور بڑھ جائے گا۔'' ڈاکٹر آہ بھر کے بولا، ''اکبر علی خاں مجھے بھی اچھے لگتے تھے۔ وہ ایک عمدہ آدمی تھے۔ ان سے مل کے خوشی ہوئی تھی۔ سوچا تھا، ذرا تمہارے بھائی کے علاج سے فراغت ہو جائے تو ان سے نشستیں ہوں۔''
''بتایئے ڈاکٹر صاحب! ان کا کیا قصور تھا۔ انہوں نے کسی کو کیا ضرر پہنچایا تھا۔ انہوں نے کتنے نادر، کتنے بڑے آدمی کو مار دیا، کس بات پر...... اس بات پر کہ جرأت کر کے وہ میرے ساتھ میدا کے اڈے پر گئے تھے اور میری دل بستگی کے لیے یہاں اسپتال میں صبح شام آنا انہوں نے معمول بنا لیا تھا۔''
''میں بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' ڈاکٹر رائے افسردگی سے بولا، ''وہ لوگ دیوانے ہو گئے تھے کیا۔ وکیل صاحب سے انہیں کیا غرض تھی۔ کیسے ظالم اور درندے لوگ ہیں یہ۔''
میں نے یہ اس سے نہیں کہا کہ اپنا حال کیا بتاؤں۔ میرا خون بہت کھولتا ہے۔ اکبر علی خاں کا خیال آتا ہے تو جسم میں آگ سی لگنے لگتی ہے۔ ایک ہڑک سی اٹھتی ہے کہ میدا کے ٹھکانے پر جا کے اس کے اڈے کو آگ لگا دوں، اس کا جو بھی آدمی سامنے نظر آئے، اس کے سینے میں چاقو بھونک دوں۔
''تم کہتے ہو، اڈے کی کرسی پر بیٹھا آدمی چاقو اور بل ہی میں نہیں، برداشت، سوجھ بوجھ میں بھی دوسروں سے لازماً برتر ہوتا ہے۔ یہ تو نہایت کم عقلی کی بات ہے۔ یہ تو اوچھا پن ہے، پرلے درجے کی ذلالت ہے کہ تم نشانے پر نہ آ سکے تو انہوں نے ایک بے گناہ کو ختم کر دیا۔ میدا کیا جتانا چاہتا ہے، تمہیں مشتعل کرنا، یا خوف زدہ کرنا؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ صاف صاف اس پر نگاہ جائے گی۔ اس طرح وہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟'' ڈاکٹر رائے بھن بھناتی آواز میں بولا۔
''آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر شاید یہ میدا نہیں ہے۔ اسے اتنا بے دماغ نہیں ہونا چاہیے۔''
''پھر...... پھر کون...... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میدا نے آسانی سے مجھے اڈے سے جانے دیا تھا۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گی جو ڈاک خانے والی گلی میں زخمی ہو جانے اور بعد کو مر جانے والے دھنوا نامی آدمی کے نہایت وفادار، جاں نثار ساتھی تھے۔ وہ میدا کے اڈے سے منحرف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اڈے کے استاد کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہو سکتا ہے، اسپتال میں آنے والے حملہ آور میدا کے بھیجے ہوئے ہوں، لیکن یہ لوگ...... یہ تو کوئی دوسرے ہی لوگ ہو سکتے ہیں۔''
''کوئی بھی ہو۔'' ڈاکٹر فہمائشی لہجے میں بولا۔ ''میری بات سنو! تم نے اتنا کچھ بتا کے مجھ پر اعتماد کیا اور میں نے اس پر یقین کیا ہے۔ تم اب اپنے آپ کوئی فیصلہ نہیں کرو گے۔ میرے مشورے اور علم میں لائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔ سمجھے!''
''آدمی اپنے آپ کو بھی تو جواب دیتا ہے، ڈاکٹر صاحب!'' میں نے یاسیت سے کہا، ''میرے وہاں نہ جانے سے اکبر علی خاں کے گھر والے کیا سوچیں گے، میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔''
''ان پر اکبر علی خان کے سانحے سے بڑی قیامت اور کیا گزر سکتی ہے، اور ہاں...... تم...... تم اپنے آنے والے بھائیوں کو بھی منع کر دو گے کہ وہ تمہاری طرف سے کوئی نادانی نہیں کریں گے۔'' وہ کرسی سے دوبارہ اٹھ گیا اور چلتے چلتے رک گیا۔
میرا خیال ہے، تم سے کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کتنا سنگین واقعہ ہے۔ شہر کے ایک نہایت معزز، مشہور، ایک بڑے آدمی کا خون ہو گیا ہے۔ تمہاری ذرا سی غلطی، مشتعل حرکت سے بات کتنی بگڑ سکتی ہے۔ اس معاملے کی تفتیش عام سطح پر نہیں ہو گی۔ وکیلوں کی برادری، شہر کے معززین، اکبر علی خاں کا وسیع اور با اثر حلقۂ احباب، سبھی تشویش ظاہر کریں گے اور تمہارا نام لازماً آئے گا۔''
اس نے مجھ سے پھر کوئی بات نہیں کی، کمرے سے نکل گیا۔ باہر راہ داری میں اس کمرے میں تعینات ڈاکٹر اور نرس اس کی واپسی کے منتظر تھے۔
ڈاکٹر نے رسمی انداز میں ان سے معذرت کی اور بٹھل کے کمرے تک میرے ساتھ آیا۔ سیورین بھی ڈیوٹی پر آ گئی تھی اور امی ابھی تک موجود تھی۔ دونوں سراسیمہ سی بٹھل کے کمرے کے باہر ہماری جانب نظریں مرکوز کیے کھڑی تھیں۔ ہمیں آتا دیکھ کر سٹ پٹا گئیں۔ ڈاکٹر رائے نے قریب جا کے امی کو اشارے سے پاس بلایا اور سرگوشیانہ کچھ باتیں کیں اور تیز قدموں سے چلتا ہوا راہ داری کے موڑ سے اوجھل ہو گیا۔
ڈاکٹر کے جاتے ہی دونوں لپکتی ہوئی میرے پاس آ گئیں۔
''یقیناً تم نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی ہو گی۔'' امی وثوق سے بولی۔
میں نے سر ہلا کے تائید کی۔
''تم نے بہتر کیا۔ تمہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔'' وہ تائیدی لہجے میں بولی، ''وہ بہت کھلے دماغ کے آدمی ہیں۔''
میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔
''اب مجھے گھر جانا ہے میرے بچے! سیورین آ گئی ہے۔ تم کہو تو رک جاؤں۔ میں تمہاری راہ تک رہی تھی۔'' امی دل دوزی سے بولی۔ ''گھر میں میرا جی نہیں لگے گا، تمہاری فکر رہے گی۔''
''نہیں، تم جاؤ۔ میں ٹھیک رہوں گا۔ میں اس کمرے میں قید رہوں گا، کہیں نہیں جاؤں گا۔'' میری آواز بہک رہی تھی۔
''تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ یہ وقت گزر جائے گا۔'' امی مجھے دلاسا دینے لگی۔
''یہ کیا ہو گیا؟ میں نے آ کے امی سے سنا تو یقین نہیں آیا۔ کیا واقعی وہ اتنا شان دار آدمی

ہمارے درمیان نہیں رہا؟'' سیورین نے دھڑکتی آواز میں پوچھا۔

میری خاموشی پر وہ بھی چپ ہوگئی۔ کمرے میں آکے بے اختیار میرے قدم بٹھل کے بستر کی جانب اٹھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سینے کے متوازن اتار چڑھاؤ سے لگتا تھا کہ وہ پُرسکون نیند میں ہے، چہرے پر بھی تازگی پھیلی ہوئی تھی۔ میں دبے قدموں اس کے پاس سے ہٹ آیا اور سوفے پر آکے بیٹھ گیا اور میرا جسم بکھر سا گیا۔ چند لمحوں بعد سیورین بھی میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ سیورین دیر تک بت بنی رہی۔ میں نے بھی اس سے کوئی کلام نہیں کیا۔ میرے پاس کہنے کے لیے تھا بھی کیا۔ گذشتہ دو ایک دن میں وہ اکبر علی خاں سے خاصی مانوس ہوگئی تھی۔ کل اس نے ان کے گھر سے آئے ہوئے توشے کا کھانا کھایا تھا اور کہتی تھی کہ اس نے آج تک اتنا نفیس اور لذیذ کھانا نہیں کھایا۔ اکبر علی خاں اس کی تعریف سے بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر خوش ہونے والے آدمی تھے۔ انہوں نے بٹھل کی صحت یابی کے بعد سیورین کو گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ کہتے ہیں، آدمی کا وقت آگیا تھا، لیکن ایسے تو وقت نہیں آنا چاہیے تھا۔ کسی بیمار، معذور، سن رسیدہ کی موت کا کوئی جواز تو ہوتا ہے۔ آدمی چپکے سے یوں اچانک غائب ہوجائے تو کوئی کیا کہے۔ سیورین بھی کیا کہہ پاتی...... اور میں کون سا اکبر علی خاں کا رشتے دار، ان کے خاندان کا آدمی تھا۔ اکبر علی خاں سے میری شناسائی سیورین سے ایک دن پہلے کی تھی، بل کہ ایک پہر پہلے کی۔ سیورین سے کچھ کہتے نہ بنا کہ لفظ تو کبھی بہت حقیر اور بے مایہ ہوجاتے ہیں۔ وہ کھسک کے مجھ سے اور قریب ہوگئی۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے مجھ سے غم گساری کا اظہار کرنا چاہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ سیورین نے اپنے عالم اضطراب میں میرے ہاتھ پر زور دیا تو میری آنکھیں بھی امڈ آئیں۔ آدمی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو آنسو ہی سہارا، آنسو ہی سپر بن جاتے ہیں۔ ''کیا ہوگیا یہ......'' وہ سسکتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولی۔

میں نے خود کو بہت روکا، لیکن سیورین کی سسکیوں نے مجھے بھی متلاطم کردیا۔ میں بھی پھڑکنے لگا۔ مسیحائی اس کا شعار تھی۔ اس بے پناہ مشفق ومہربان لڑکی نے میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ میری تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ کبھی اپنے کسی بہت عزیز ومحترم، اپنے کسی ہم نفس وہم دم کے چلے جانے پر حیران اور ہلکان ہوجاتے ہیں، لیکن اس آدمی کی ویرانی کا کون اندازہ کرے، اس آدمی کا دکھ کون جانے جو اپنے عزیز ومحترم کے خون کا بار اپنی گردن پر محسوس کرتا ہو۔ سیورین کو کیا معلوم تھا کہ ہر لمحے یہی احساس میرا سینہ دبوچتا، کھسوٹتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں، کہاں جا کے خود کو چھپاؤں۔ میں کیسا بدنصیب، بے بس آدمی ہوں۔ میرا سایہ ہی نحس ہے۔ میں زندہ رہنے پر کیوں مصر ہوں۔

سیورین میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کے مجھ سے یگانگت ظاہر کرنے لگی۔ آئینہ مقابل نہ ہو تو بھی ہمہ وقت اپنی صورت آدمی کے سامنے رہتی ہے، میں اپنا چہرہ ہی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ آدمی کا اپنا وجود کبھی اس پر بہت بوجھ ہوتا ہے۔ سیورین، ایک نرم ونازک لڑکی، کسی ستون، کسی دیوار کے مانند مجھے سہارا دینے کی کوشش کررہی تھی۔ میرے سر پر اس کی منڈلاتی انگلیاں مجھ سے اپنے دکھ کا اظہار کررہی تھی۔ اس کا گداز آفریں پہلو اس کی بے قراری کا مظہر تھا کہ وہ میرے حال سے واقف ہے اور مجھے پناہ میں لینا چاہتی ہے۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ دل داری ودل دہی سے بھی تو آنسوؤں کی نمو ہوتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم، کب وہ میرے پاس سے اٹھی، مجھے تو اپنی سدھ بدھ ہی نہیں رہی تھی۔ جانے کب اس نے میرے شانے پر ٹہوکا دیا تو میں نے دیکھا، وہ میرے سامنے کھڑی ہے، اس کے ہاتھ میں گلاس ہے اور رومال۔ اس نے آنکھیں میچ کے گلاس اور رومال میرے طرف بڑھائے تب مجھے اپنی توانائی اور فرومائیگی کا شدت سے احساس اور ندامت کا غلبہ ہوا۔

آنسوؤں کا بھی بڑا افشار ہوتا ہے۔ بہہ جائیں تو جسم ہلکا ہوجاتا ہے لیکن آنسو تلافی نہیں کرپاتے۔ سیورین دوبارہ میرے پاس آکے بیٹھ گئی اور چپ رہی پھر جیسے خود کو مجتمع کرکے دھیمی آواز میں اس نے سوال کیا۔ یہ کانٹا اس کے بدن میں چبھ رہا ہوگا۔ کہنے لگی ''اب کیا ہوگا؟''

میں نے استفہامی نگاہوں سے اس کو دیکھا۔ 'کیا ہوگا؟' پھر مجھے خیال آیا، وہ آنے والے وقت سے ہراساں ہے۔ میں نے بہ ظاہر بے پروائی سے کہا ''جو ہونا ہے...... وہ تو ہوکے رہے گا۔''

''تم ان سے زیادہ بات مت کرنا۔'' اس نے دبی آواز میں مشورہ دیا۔

''کس سے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''پولیس سے۔ امی کہہ رہی تھی، پولیس اسپتال آنے والی ہے۔ یہ پولیس والے بال کی کھال نکالتے ہیں اور کسی کا خیال نہیں کرتے۔ وہ تمہیں تنگ کرسکتے ہیں۔''

''وہ اپنی کارروائی تو کریں گے ہی۔ اتنے بڑے واقعے کے بعد کیا وہ گھر بیٹھے رہیں گے۔''

''مگر تمہارا قصور کیا ہے؟''

''اکبر علی خاں سے تعلق خاطر کا، ایسا نہ ہوتا تو وہ کیوں ختم ہوجاتے۔''

سیورین دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھا کی، پھر ٹھٹکی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

میں نے اسے تسلی دینی چاہی۔

''خداوندا! سب ٹھیک ہی ہو۔'' وہ سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے بولی۔ ''خداوند سچ کا ساتھ دیتا ہے۔''

وہ ابھی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ سیورین گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف لپکی۔

اسپتال کا ایک ملازم پولیس کی آمد اور میری طلبی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا۔ سیورین نے سہمے سہمے انداز میں ہرکارے کا پیغام مجھے منتقل کیا۔ سوفے سے اٹھ کے میں نے ایک نظر بٹھل کے بستر کے پاس جا کے دیکھا۔ سیورین سے تشفی کے کلمات کہتا ہوا میں کمرے سے نکل جانا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے روک لیا اور غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔ میرا حال واقعی ٹھیک نہیں تھا، اس کا احساس مجھے غسل خانے جا کے ہوا۔ منہ ہاتھ دھو کے اور بال درست کرکے میں باہر آیا تو سیورین مجھے رخصت کرنے کے لیے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے اس نے میرے کرتے کا دامن کھینچ کے شکنیں درست کیں۔ نیچے کے تین چار بٹن لگا کے میری کھلی واسکٹ بند کی اور پھیکی مسکراہٹ سے ہاتھ پھیلا کے مجھے کمرے سے جانے کی اجازت دی۔

باہر ملازم منتظر تھا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرکے وہ راہ داری میں دائیں مڑ گیا۔ راہ داری کے اختتام پر سبزہ زار کا وسیع کھلا حصہ تھا اور مختلف امراض کے وارڈ شروع ہوجاتے تھے۔ ایک دو کی ٹکڑیوں میں جگہ جگہ سپاہی موجود تھے۔ ان میں بیش تر سادہ لباس میں تھے۔ سادہ لباس میں بھی پولیس کا آدمی اپنے خاص انداز واطوار، چھب ڈھب، بالوں وغیرہ سے آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ پولیس سے جس کا واسطہ پڑتا رہا ہو، اس سے تو کسی بہروپ ہی میں چھپ سکتا ہے۔ متعدد مقامات پر تعینات سپاہی

ہمیں سامنے سے گزرتا دیکھ کے زیروزبر ہو جاتے، لیکن کسی نے اسپتال کی وردی میں ملبوس ملازم کی وجہ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ان کی مشکوک نظروں کے حصار میں ہم مرکزی عمارت میں داخل ہو گئے۔

عمارت کے بڑے دروازے پر بھی پانچ چھ سپاہی موجود تھے۔ انہوں نے جیسے مجھے پہچان لیا ہو اور میں ہی انہیں مطلوب ہوں۔ مجھے آتا دیکھ کے ان کے ڈھلکے ہوئے جسموں میں ایک ساتھ جیسے کسی نے سوئیاں چبھو دی ہوں، سبھی تن کے کھڑے ہو گئے۔ نگاہوں نگاہوں میں انہوں نے ایک دوسرے سے تصدیق چاہی، لیکن میرا ان کا سامنا لمحاتی تھا۔ میرا رہبر، اسپتال کا ملازم عمارت کے بڑے دروازے سے چند قدم بعد دائیں جانب گلی ایسی جگہ میں آ گیا۔ سامنے دروازے پر سادہ لباس میں ایستادہ شخص کا تعلق بھی یقیناً پولیس سے ہونا چاہیے تھا۔ ملازم نے مجھے اس کے سپرد کیا اور وہیں سے لوٹ گیا۔ مجھے باہر ٹھیرا کے دربانی خدمت پر مامور پولیس کے آدمی نے اندر جا کے میری آمد کی اطلاع دی ہو گی۔ جاتے جاتے اس نے دروازہ بند کرنے کی احتیاط بھی کی اور فوراً ہی واپس آ کے اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔

وہ اسپتال کے خاص ملاقاتیوں کا کمرا معلوم ہوتا تھا، نہ اتنا بڑا، نہ ایسا چھوٹا، بڑے اسٹیشنوں کے درجہ اول مسافروں کی انتظار گاہ کے مانند سجا ہوا اور صاف ستھرا۔ دیواروں کے ساتھ لگے شاہانہ طرز کے سوفوں کے بیچ شیشے کی چھوٹی میزیں، کمرے کی کشادہ وسطی جگہ کو پر کرتی ہوئی بڑی چوکور میز، چھت خاصی اونچی، دیواروں پر نیا نیا رنگ روغن، کھڑکیوں پر ہلکے نیلے رنگ کے ریشمی پردے، چھت سے ملحق روشن دان نصف کھلے ہوئے، چھت سے لٹکا ہوا پنکھا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ دروازے کے عین مقابل سوفوں پر تازہ وردیوں میں تین پولیس افسر بیٹھے ہوئے تھے، تینوں کم وبیش گندمی رنگت کے تھے، دوادھیڑ، ایک پختہ کار نوجوان۔ تینوں کے قامت میں تھوڑا بہت ہی فرق تھا۔ نسبتاً بڑی عمر کے شخص کے چہرے پر بردباری جھلک رہی تھی اور وہی ان کا بڑا افسر لگتا تھا۔ اس کی چھوٹی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور چمکیلی تھیں۔ بھووں پر سفید بال غالب تھے۔

حالاں کہ دربان نے انہیں مطلع کر دیا تھا، لیکن میری آمد پر تینوں سنبھل سے گئے۔ میں نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور ان سے اجازت لیے بغیر قریب کے سوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک ان کی نظریں مجھ پر بھٹکتی رہیں، پھر ادھیڑ افسر نے اپنے بڑے افسر کی طرف اجازت طلب انداز سے دیکھتے ہوئے مجھ سے میرے نام کی توثیق چاہی۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''تم سے ہم کو انکوائری کرنا ہے۔'' ادھیڑ افسر نے ہندوستانی میں پہل کی۔ ''ٹھیک ٹھیک بتاؤ گے تو ہم دونوں کے واسطے ٹھیک ہوگا۔'' اس کے لہجے کی درشتی قبل از وقت تھی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''رات کو تم ادھر اسپتال ہی میں تھے جب وکیل اکبر علی خاں صاحب کا مرڈر ہوا۔ وکیل صاحب کتنے بجے تمہارے پاس سے نکلے تھے؟''

''ڈیڑھ دو بجے کے درمیان۔'' میں نے کھنچی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''تم نے ان کو تانگے پر چھوڑا اور لوٹ کے کمرے میں آ گئے، ایسا ہی ہوا؟''

''جی ہاں۔''

''تانگے پر ان کو چھوڑنے اور واپس کمرے تک آنے میں تم کو کتنا ٹائم لگا؟''

''راستے کا وقت۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''گھر جانے میں اتنی دیر کا ہے لگائی وکیل صاحب نے؟ یہاں کا کر رہے تھے او؟'' اس بار نوجوان افسر نے بپھرے لہجے میں پوچھا۔

"باتیں کررہے تھے ہم، وقت کا کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ چلتے وقت میں نے ان سے کہا بھی کہ رات بہت ہوگئی ہے میں ان کے ساتھ چلتا ہوں، اسی تانگے سے واپس آجاؤں گا۔ انہوں نے ہنس کر منع کردیا۔"

"کا...... کا باتیں کررہے تھے او؟"

"یہی میری، اپنی، اپنے گھر کی...... دنیا بھر کی۔"

"کب سے تم ان کو جانو ہو؟"

"دو تین دن سے، یہاں آنے کے بعد سے۔"

"دو تین دن سے!" ادھیڑ افسر حیرانی سے بولا۔

اس نے وہی سوال کیا جو ڈاکٹر رائے نے کیا تھا کہ اتنی جلد وہ کس طرح مجھ سے گھل مل گئے کہ گھر کی باتوں میں شریک کرنے لگے۔ میں نے جواب میں وہی کہا جو ڈاکٹر سے کہا تھا کہ ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے کسی مدت کی شرط عائد نہیں ہوتی۔

"کدھر، کیسے تمری ان کی پہلی بار بھینٹ ہوئی؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" میں نے کسی قدر بے رخی سے کہا۔ "آپ کا وقت ضائع ہوگا۔ بس اتفاق سے میری ان کی ملاقات ہوئی۔"

"ہم کو بتاوو، ہم اسی کارن ادھر آئے ہیں۔"

"بتانے میں کوئی ہرج نہیں لیکن آپ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائیں گے، بل کہ الجھ سکتے ہیں۔ کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں تو ادھر ادھر مت بھٹکیے۔"

"تم ہم کو ایڈوائز نا ہی کرو تو اچھا ہے۔"

میں نے فوراً کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ بھٹل کہتا تھا، جواب میں تیزی ہر وقت مناسب نہیں ہوتی۔ اس کے بہ قول سامنے موجود زیادہ پولیس افسر یک ساں مزاج کے نہیں ہوتے، چہروں کی طرح ان کی خصلتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے وہ الٹے سیدھے سوالات بھی کرنے لگتے ہیں۔ شک کی بنیاد پر، مفروضے قائم کرتے ہیں اور شک کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کوئی شک ان کے دل میں بیٹھ جائے تو مشکل ہی سے نکلتا ہے۔ ظاہر ہے، ان میں نہایت ذہین، تعلیم یافتہ اور تجربے کار بھی ہوسکتے ہیں۔ وہ ہوش وحواس کھودینے کی حد تک اپنے مخاطب کو لاجواب اور برہم کرسکتے ہیں، ہمیشہ دشمن کی طرح پیش آتے ہیں اور مشکل سے شکست قبول کرتے ہیں۔ بہت کچھ دلیل پر منحصر ہے، دلیل انہیں غصہ بھی دلاتی ہے، زچ بھی کرتی ہے، متاثر بھی۔ اپنی دلیلیں آہستہ آہستہ ان پر افشا کرنی چاہییں۔ دلیلیں توانا ہوں، یا دلیل ہی نہ ہو تو حجت بھی نہیں کرنی چاہیے۔ چرب زبانی انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ ان کے مناصب کی رعایت دہی بہ ہر حال واجب ہے۔ اونچی آواز میں بات کرنے سے پہلے ان کے تیور کا تخمینہ کرلینا چاہیے۔

"ایک بات صاف سن لیجیے صاحب!" میں نے تمام تر احتیاط سے نسبتاً اٹھی ہوئی آواز میں کہا، "میرے پاس جو کچھ ہے، آپ سے کہے دیتا ہوں، ہوسکے تو اس پر دھیان دیجیے اور پہلے اس زاویے سے سوچیے۔ آپ حاکم ہیں۔ بعد کو آپ کی مرضی ہے، جس طرف، جس انداز سے چاہیں کھوج کیجیے۔"

تینوں کے چہرے تمتانے لگے۔ نوجوان افسر زیادہ بے چین نظر آرہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بڑے افسر نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا اور طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ "کا کہنا چاہو ہو تم؟" اس کی آواز بھاری تھی اور منصب کی تمکنت سے آسودہ۔

یہی ایک طور مجھے ٹھیک لگا کہ پٹنا شہر میں آنے کے بعد پیش آنے والے واقعات بے کم و کاست بیان کردوں، لیکن اس سے پہلے انہیں کچھ باور کرادینا بھی ضروری تھا۔ میں نے کہا، "جو میں کہتا

ہوں۔ اچھا تو یہی ہوگا فی الحال آپ اسی پر تکیہ یا اسی پر یقین کریں۔ بعد کو کسی وضاحت کے لیے سوال پیدا ہوتے ہیں تو میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ آپ کے اطمینان کے لیے جتنا کچھ بھی جانتا اور سمجھتا ہوں، جواب دینے کی کوشش کروں گا لیکن میری بات ختم ہونے سے پہلے کوئی سوال مت کیجیے گا۔ یہ میری گزارش ہے۔ مجھے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہے کہ آپ پولیس کے آدمی ہیں اور سنجیدگی سے ایک سنگین واقعے کی تفتیش کررہے ہیں۔ بدقسمتی سے جس میں میرا ذکر، میرا نام بھی آتا ہے۔ مجھے معلوم ہے، میری حیثیت بھی آپ کی نظروں میں مشکوک قرار پائی ہے اور میرے خیال میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ آپ کچھ جاننا چاہتے ہیں تو میں دہراتا ہوں۔ میں آپ سے امکان بھر تعاون کروں گا، یا یوں کہیے کہ آپ کی مدد کے لیے میں یہاں موجود ہوں۔ کسی کارنامے کے چکر میں پڑیں گے آپ تو شاید کچھ ہاتھ نہ آئے۔"

"تم...... تم ہمری مدد کروگے۔" نوجوان افسر کی زبان غصے میں ڈگمگا گئی۔ "تم ہم کو کوئی بہت چالو...... پروفیشنل ٹائپ مجرم لگو ہو۔"

"تو ٹھیک ہے...... میں خاموش ہوجاتا ہوں، پھر آپ بھی کیوں یہاں بیٹھے ہو۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "ایک بات دماغ میں رکھ لو صاحب! میں آپ کے ہر سوال کے جواب کا پابند نہیں ہوں۔ آپ مجھے مجرم سمجھتے ہیں تو بات ختم ہوجاتی ہے، پھر دیر کا ہے کی، مجھے یہاں سے سیدھے حوالات لے جائیے۔ میں نے ڈاکٹر رائے سے درخواست کی ہے کہ وہ شہر کے کسی اچھے وکیل کا بندوبست کردیں۔ پھر وہی آپ سے بات کرے گا۔"

تھوڑا بہت اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کچھ طے کرکے، کچھ ٹھان کے نہیں آئے ہیں۔ انہیں کسی نتیجے پر پہنچنے، کوئی رائے قائم کرنے کا موقع ہی کہاں ملا ہوگا۔ اکبر علی خاں کے ملازم کے بہ قول، صبح فجر کی نماز کے لیے مسجد جاتے ہوئے نمازیوں نے ان کی خون آلود لاش جھاڑیوں میں پڑی دیکھی تھی۔ اسی وقت سارے محلے میں کہرام مچ گیا ہوگا۔ پولیس تک بات پہنچنے، پولیس کے آنے اور ابتدائی تفتیش میں کچھ وقت تو ضرور لگنا چاہیے۔ کچھ تگ ودو کے بعد انہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ اکبر علی خاں رات گئے اپنے کسی نئے دوست کے پاس سے گھر واپس آرہے تھے۔ یہ نیا دوست کون تھا۔ اس کا سراغ بھی ان کے لیے معما نہ ہوگا۔ اسپتال آکے انہوں نے صدر دروازے پر رات کی ڈیوٹی کے دربان اور اونگھتے ہوئے سپاہیوں سے بات کی ہوگی اور ممکن ہے انہوں نے اس تانگے والے کو بھی ڈھونڈ لیا ہو جو اکبر علی خاں کو اسپتال سے لے گیا تھا اور ہوسکتا ہے مجھ سے پہلے ڈاکٹر رائے سے بھی ان کی ملاقات ہوچکی ہو۔ اتنی کم مدت میں ان کی معلومات خاصی خام اور نا تمام ہونی چاہییں۔ یہ ساری صورت حال اور ان کی تذبذب و منتشر حالت دیکھ کے ہی میں نے اپنی آواز اور لہجے میں جرأت کی جسارت کی تھی اور مجھے احساس تھا کچھ متجاوز نہ ہوجائے۔ وہ کچھ جاننا چاہتے ہیں تو مجھے بھی اپنی وکالت، اپنی نجات کی کوشش کرتے رہنا ہے۔

بستر پر پڑا بے حرکت، بے دست وپا جیسا بھٹل بار بار میری نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ اس شہر میں میری تنہائی اور اجنبیت، سارے فاصلے مٹا کے ایک شخص قریب آیا تھا، اس سے بڑا سہارا ہوگیا تھا، وہ بھی چھن گیا۔

نوجوان افسر کے پہلو میں بیٹھے ادھیڑ پولیس افسر نے میری سچ بیانی، یا وہ گوئی پر محمول کی۔ میں نے کوئی ایسی ناروا، نازیبا بات بھی نہیں کی تھی۔ جانے کیوں وہ بھڑک اٹھا۔ شاید پہلی بار اس کا مجھ ایسے کسی ملزم، یا مجرم سے سامنا ہوا تھا۔ اس نے بگڑے منہ سے پوچھا۔ "تو...... تو...... تم کون ہو؟"

''میں آپ کو یہی بتانا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں اور مجھ اجنبی کو اس شہر میں آ کے کن حالات سے واسطہ پڑا ہے۔'' میں نے جبری تحمل سے کہا۔ ''لیکن لگتا ہے، آپ کی نظروں میں اپنی حیثیت جان کے ہی مجھے زبان کھولنی چاہیے۔ مجھے اپنی بات کہنے کا حق ہے تو کھلے دل سے اجازت دو۔ نہیں دینا چاہتے تو میں نے پہلے ہی صاف کہا ہے، آپ اپنی کارروائی کرو۔ میں جانتا ہوں، یہ حق مجھے کہاں سے مل سکتا ہے، آپ پر دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔''

''ٹھیک ہے۔'' بڑے افسر نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا، ''تم بولو، کیا بولنا ہے؟''

مزید کسی حجت کا محل نہیں تھا۔ میں نے اپنی آواز دھیمی رکھی۔ ''ہم آگے جا رہے تھے۔ اکبر پور اسٹیشن پر انجن خراب ہو گیا۔ ریل گاڑی کے جھٹکوں کی وجہ سے سوئے ہوئے بھائی کے سر پہ اندرونی چوٹ آ گئی......''

میں نے شروع سے آخر تک مختصراً ساری روداد ان کے گوش گزار کر دی۔ درمیان میں کئی بار ادھیڑ اور نوجوان افسر نے مداخلت کرنی چاہی، لیکن بڑے افسر کی طرف دیکھ کے تلملا کے رہ گئے۔ میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ صرف اکبر علی خاں کے گھر میں چاقو کے زور پر داخل ہونے کے واقعے سے اجتناب کیا تھا۔ میرے بیان میں بہ تدریج ان کی بڑھتی دل چسپی اور حیرت کا اظہار ان کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کے بدلتے رنگوں سے ہوتا رہا تھا۔ اتنا کچھ جان کے ان کے ذہنوں میں اٹھتے ہوئے سوالات کا مجھے اندازہ تھا۔ انہیں بھی وہی صراحتیں مطلوب ہونی چاہیے تھیں جو کچھ دیر پہلے ڈاکٹر رائے کو ہوئی تھیں۔ گو میں خود ہی ان کی الجھنیں دور کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

میرے چپ ہو جانے پر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیے، پھر ادھیڑ افسر نے اسی سوال کی تکرار کی جو ڈاکٹر رائے نے کیا تھا کہ کیا میں ہمیشہ اپنی جیب میں چاقو رکھتا ہوں۔

ڈاکٹر رائے کی بات اور تھی، ان لوگوں کا تعلق پولیس سے تھا، میں نے محتاط لہجے میں کہا، ''کسی ان ہونے واقعے سے نمٹنے کے لیے چاقو جیب میں رکھنا ہماری ریت ہے۔''

''چاہے، برسوں اسے کھولنے کی نوبت نہ آئے۔''

یکے بعد دیگرے وہ طرح طرح کے سوالات کی نشتر زنی کرتے رہے، ڈاکٹر رائے سے کچھ زیادہ ہی۔ یہ دوسرا مرحلہ زیادہ اذیت ناک تھا۔ میں جواب دہی کا عذاب سہتا رہا کہ آنے والے وقت کی تنگی و کشادگی اب انہی پر منحصر تھی۔ بہت دیر ہو گئی تھی۔ میرے دست و بازو ٹوٹنے سے لگے تھے۔ کبھی جی میں آتا تھا، انہیں جھڑک دوں کہ میری کیا خطا ہے۔ وہ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے۔ میں نے کیا قصور کیا ہے جو مجھے ان کے سامنے سر جھکائے مجرموں کے مانند بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ ایک رکتا تو دوسرا شروع ہو جاتا تھا۔ ان کے سوالوں کا سلسلہ جاری تھا کہ صوفوں کے درمیان بغلی دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ ہوئی اور ڈاکٹر رائے نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کے مجھے سکون ملا۔ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے، میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر رائے نے پرتکلف انداز میں ان سے بیٹھ جانے کی گزارش کی اور ظاہری شائستگی و شگفتگی سے انگریزی میں بولا، ''میں مخل تو نہیں ہوا؟''

''نہیں، نہیں ڈاکٹر، کیا کہہ رہے ہیں آپ، خوش آمدید۔'' تینوں افسروں نے تپاک کا اظہار کیا۔

''کہیے صاحبان! آپ کے مسائل کچھ حل ہوئے؟'' ڈاکٹر نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

''جی ڈاکٹر۔'' بڑے افسر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ہم یہی کر رہے تھے، کچھ سمجھنے کی کوشش۔''

''یقیناً ساری بات سے آپ آگاہ ہو گئے ہوں

گے۔''

''جی ڈاکٹر صاحب، ہم نے پوری توجہ سے ہر بات سنی ہے۔''

''یہ کیسی افسوس ناک اور حیرت ناک صورت حال ہے۔'' ڈاکٹر رائے نے اداسی سے کہا۔

''جی ڈاکٹر صاحب؟'' بڑے افسر کی آواز بھاری ہو گئی۔

''واقعی۔''

''کیا نتیجہ اخذ کیا آپ نے؟'' ڈاکٹر نے پھیکی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''ابھی یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' بڑا افسر سنجیدگی سے بولا۔

''کیا مطلب؟'' ڈاکٹر رائے نے چونک کے پوچھا۔

''یہ ایک یک طرفہ روداد ہے۔'' بڑے افسر کا لہجہ بہ ظاہر معذرت خواہا لیکن تندی و ترشی کا حامل تھا۔ کہنے لگا۔ ''اس نوجوان کا پس منظر صاف نہیں ہے۔ یہ ہر وقت چاقو جیب میں رکھتا ہے۔ اڈے باڑوں سے بھی اس کی وابستگی رہی ہے۔ یہ ہتھ چھٹ ہے۔ بٹوا چھن جانے پر یہ چور کے پیچھے پڑ گیا۔ ایک ذرا سے بٹوا چوری پر ایک آدمی کا خون ہو گیا۔ اس کا کہنا ہے اس نے اپنا چاقو نہیں نکالا تھا، ایک ساتھی نے نادانی، ناتجربے کاری میں اپنے ہی ساتھی کو خود زخمی کر دیا جو بعد کو مر گیا۔ یہ ایک اور معاملہ ہے، قتل کا معاملہ۔ دیکھنا ہے، اس بات میں کتنی صداقت ہے۔ اس نے مشہور زمانہ چاقو باز میدا جیسے بدمعاش کے ٹھکانے پر جا کے اسے چاقو آزمائی کی دعوت دے ڈالی۔ کس اعتماد میں؟ اس اعتماد میں کہ یہ اسے زیر کر لے گا، ورنہ یہ آدمی ایسا بے وقوف نہیں معلوم ہوتا۔ یہ شہر کے مشہور وکیل کے گھر میں جبراً داخل ہو گیا۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ دو راتیں قبل جو مسلح آدمی اسپتال میں گھس آئے تھے۔ وہ گلی میں زخمی ہو جانے اور بعد میں دم توڑ دینے والے نوجوان کے مشتعل ساتھی ہو سکتے ہیں اور وہ نہیں، تو وہ میدا کے فرستادہ ہو سکتے ہیں۔ یہ ان کے ہاتھ نہ آ سکا اور واپس بھاگتے ہوئے ان لوگوں کے راستے میں اسپتال کا پرجوش ملازم رکاوٹ بن گیا۔ وہ بھی اپنی جان سے گیا۔ یہ دوسرا قتل ہے، پھر آج صبح سویرے تیسرا قتل، شہر کے ایک نامور وکیل کا خون۔ شہر کی ساری پولیس حرکت میں آ چکی ہے۔ دیر ہو گئی تو ضلع سے صوبے اور پھر مرکزی حکومت تک بات جا سکتی ہے۔ سنا ہے، وکیل صاحب کا بڑا بھائی نظام حیدر آباد کا مقرب خاص ہے، دربار میں کسی بڑے عہدے پر فائز ہے۔ نظام سرکار اور برطانوی حکومت کا تال میل کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ یہ انتہائی نازک معاملہ ہے اور پیچیدہ رخ اختیار کر سکتا ہے۔ ہمیں ہر ممکن قدم اٹھانا اور ہر حال میں محتاط رہنا ہے۔ سمجھ رہے ہیں آپ ڈاکٹر صاحب!'' بڑے افسر نے مایوسانہ، فکرمندانہ انداز میں کہا۔

''جی ہاں، سمجھ رہا ہوں اور اچھی طرح' جس طرح آپ سمجھا رہے ہیں اسی طرح۔'' ڈاکٹر رائے تیکھے لہجے میں بولا۔

''ایسی صورت میں یہی مناسب ہے کہ ہم اسے ساتھ لے جائیں۔''

''کیا......؟'' ڈاکٹر رائے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''آپ ساتھ لے جائیں گے اسے۔ کیوں؟ کس لیے؟''

''مجبوری ہے ڈاکٹر صاحب!'' بڑے افسر نے متانت سے کہا، ''ہمیں کچھ اور جاننا بوجھنا ہے۔''

''کیا اس سے حاصل کردہ معلومات میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟'' ڈاکٹر اکھڑی ہوئی آواز میں بولا، ''مجھے نہیں معلوم اس نے آپ کو کیا بتایا ہے لیکن جو کچھ میں جان پایا ہوں، یقیناً اس سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔''

''محترم ڈاکٹر!'' بڑے افسر نے مودبانہ کہا۔

''مجرموں کا ہمیں وسیع تجربہ ہے۔ آپ کو کیا بتائیں کیسے کیسے بہروپیے، تماشا باز سامنے آتے رہے ہیں۔ آپ جیسا ایک مقدس پیشے سے وابستہ شخص ان جرائم پیشہ لوگوں کی شعبدے کاریوں کا تصور نہیں کرسکتا۔ ہمارے روز وشب انہی لوگوں میں گزرتے ہیں۔ ایک نمبر کے چھٹے ہوئے لوگ ہوتے ہیں یہ جناب!''

''لیکن اس کے بھائی کو اس کی رفاقت کی ضرورت ہے۔ یہ سراسر انسانی ہم دردی کی بات ہے۔''

''معاف کیجیے ڈاکٹر صاحب! آپ ہمارے لیے نہایت معزز محترم ہیں لیکن پولیس اور قانون کے اپنے کچھ مطالبے ہوتے ہیں۔ میری درخواست ہے آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے اس آدمی کی وجہ سے تین آدمیوں کا خون ہوچکا ہے اور یہ اس کا معترف ہے۔''

''کیا کہا آپ نے؟'' ڈاکٹر برگشتگی سے بولا ''یعنی اس نے اعتراف کیا ہے کہ تینوں قتل اس نے کیے ہیں۔''

''نہیں، میں نے یہ کب کہا جناب!'' بڑے افسر نے بہ عجلت صراحت کی۔ ''میرا مطلب ہے یہی بنائے فساد رہا ہے۔''

''کیسی بات کررہے ہیں آپ۔'' ڈاکٹر رائے نے برہمی سے کہا۔ ''دیکھیے آئی جی صاحب! اس کا بھائی میرے زیر علاج ہے اور اس کی حالت سے میں واقف ہوں، آپ نہیں۔ یہاں اس کی ضرورت ہے۔ آپ کہتے ہیں یہ یہاں آکے تین افراد کی موت کا سبب بن گیا، سبب بننا اور قتل کردینا اور قتل کے لیے آمادہ کرنا تین مختلف باتیں ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کل رات یہ اسپتال میں تھا۔ اکبر علی خاں کو رخصت کرنے کے بعد یہ اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ کیا اس نے اسپتال میں گھس آنے والے حملہ آوروں کو آمادہ کیا تھا کہ میرے بجائے انتھونی کو ختم کردو؟ تیسرے کے بارے میں اس نے آپ کو بتادیا ہوگا کہ وہ اپنے ہی ایک اندھے ساتھی کا نشانہ بن گیا۔ ڈاک خانے والی گلی میں چور کا پیچھا کرکے یہ کون سے جرم کا مرتکب ہورہا تھا؟ شہر میں ایک اجنبی مسافر کو اپنی جمع پونجی چھن جانے پر کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہیے تھا۔ چور کا پیچھا کرکے اس نے اپنا بٹوا حاصل کرلیا تھا کہ دو آدمی چاقو تانے دیوار بن گئے۔ ان میں سے ایک آدمی سے غلطی ہوئی، کیا یہ اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کردیتا؟ پھر پولیس والے اس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ پناہ کے لیے یہ ایک شریف الطبع وکیل کے گھر میں جبراً داخل ہوگیا۔ اس نے سارا واقعہ سن کے ہم دردی کا اظہار کیا اور کسی ناخوش گوار صورت سے اسے بچانے کے لیے اس کے ساتھ میدا کے ٹھکانے پر جانے کی جرأت کرلی۔ وکیل صاحب نے میدا کو ہموار کرنے کی اپنی جیسی کوشش کی۔ جس خیال سے اس نوجوان نے میدا کے ٹھکانے پر جانے کا ارادہ کیا تھا، وہ اڈے پاڑوں کی ریت کے عین مطابق تھا اور یقیناً یہ کسی اعتماد ہی میں وہاں گیا تھا۔ اس اعتماد میں کہ یہ میدا کو چوکی سے اتار سکتا ہے۔ چاقو پر کوئی اور اتنی دست رس نہیں رکھ سکتا۔ کیا میدا ہی حرف آخر ہے۔ اس کے پاس کون سا راستہ تھا پھر؟ میدا نے اپنے گرگوں اور پولیس کے سپاہیوں سے مل کے اس کے لیے ہسپتال تک پہنچنے کا ہر راستہ بند کردیا تھا۔ پھر یہ کیا کرتا؟ وکیل کے گھر چھپ جاتا، اپنے بیمار بھائی کو اسپتال میں تنہا چھوڑ کے؟''

ڈاکٹر نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا تھا کہ ادھیڑ افسر زہر آلود مسکراہٹ سے بولا، ''آپ کو تو ڈاکٹر کے بجائے وکیل ہونا چاہیے تھا ڈاکٹر صاحب!''

ڈاکٹر نے اس کی جانب غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر آگ سی بھڑکی۔ ادھر بغلی دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر نے ناراضی سے پوچھا۔ ''کون ہے؟ اندر آجاؤ۔''

جس دروازے سے ڈاکٹر داخل ہوا تھا، سفید وردیوں میں دو آدمی خوان پوشوں سے ڈھکے تشت اٹھائے اندر آئے۔ انہوں نے سلیقے سے وسطی میز پر تشت رکھ کے خوان پوش ہٹادیے، ایک میں نمکین چیزیں، پیسٹریاں، کیک اور انگریزی بسکٹ وغیرہ تھے۔ دوسرے میں چائے کے برتن، کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ بڑے افسر نے جسے ڈاکٹر رائے نے آئی جی کے خطاب سے مخاطب کیا تھا، اس تکلف کے لیے چند رسمی جملے ادا کیے۔ ڈاکٹر رائے کے اشارے پر خدمت گاروں نے سوفوں کی حاشیہ میزیں نکال کے ہمارے سامنے کردیں اور ان پر چمچوں کے ساتھ تشتریاں رکھ دیں۔ ایک خدمت گار پہلے تشت آئی جی، پھر دوسرے افسروں اور ڈاکٹر رائے کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے میری طرف انگلی سے اشارہ کیا تو خدمت گار ڈاکٹر کو چھوڑ کے میرے پاس آگیا۔ میں نے انکار کردیا۔ ڈاکٹر نے ایک بسکٹ تشتری میں رکھ کے گویا مہمانوں کے ساتھ شرکت کی وضع پوری کی۔ سب کو چائے پیش کرکے ملازم جلد ہی رخصت ہوگئے۔

''آپ کچھ کہہ رہے تھے۔'' خدمت گاروں کے جانے کے بعد ادھیڑ افسر نے خاموشی توڑنے کی کوشش کی۔

''مگر مجھے شبہ ہے کہ آپ سن بھی رہے ہیں۔ سنا ہے پولیس ایک کان سے سنتی دوسرے سے اڑا دیتی ہے۔''

''آپ پولیس سے بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں۔'' آئی جی زیر لبی سے بولا ''پولیس میں بھی آدمی ہوتے ہیں جناب اور آدمی سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پولیس میں بھی کالے اجلے لوگ ہوتے ہیں۔ اب یہ معلوم نہیں......'' وہ جھجک کے بولا، ''آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟''

''ایک خوش فہم کو بہتری ہی کی امید کرنی چاہیے۔'' ڈاکٹر نے پرعزم لہجے میں کہا'' اور پھر یوں بھی کہ میں اپنی دانست میں کوئی غلط بات نہیں کررہا۔ میں اس نوجوان کی سفارش نہیں کررہا بل کہ حقائق بیان کررہا ہوں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، یہ تو اپنے کو داو پر لگا کے میدا کے ٹھکانے پر چلا گیا تھا۔ میدا نے چاقو آزمائی سے کیوں پہلو تہی کی۔ وہ اتنا ہی زور آور ہے تو ایک اجنبی کے سامنے سینہ تان کے آجاتا۔ اس نے درمیان کا راستہ اختیار کیا۔ کیوں؟'' ڈاکٹر نے تیز آواز میں آئی جی کو مخاطب کرکے پوچھا۔

تینوں افسر دم سادھے بیٹھے رہے۔

''اب وہ میدا کے آدمی تھے جو اسپتال میں اسے ختم کرنے آئے تھے یا اس شخص کے پاگل ساتھی جو ڈاک خانے والی گلی میں اپنے ہی ساتھی کی وحشت سے ہلاک ہوگیا۔ کیا یہ واقعہ اسی طرح پیش نہیں آسکتا جس طرح اس نوجوان نے بیان کیا ہے؟ کہیں کوئی بے ربطی، کوئی ابہام نظر آتا ہے آپ کو؟ واقعات کی ترتیب میں کہیں کوئی جھول ہے؟''

''بہ ظاہر کوئی نہیں، نہایت مکمل خاکہ۔'' آئی جی نے اچٹتی آواز میں کہا۔

''آپ اسے خاکہ کہیں یا داستان۔ میں اسے تین چار دن سے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے مجھ سے بدکلامی بھی کی ہے۔ یہ اپنے بھائی کے لیے جان پر کھیل سکتا ہے۔ اس کا ثبوت بھی دیا ہے اس نے۔ اس صورت حال میں یہ بھائی کو چھوڑ کے فرار بھی ہوسکتا تھا۔ یہ یہاں موجود ہے...... میں اس کے بھائی کا معالج ہوں اور ان دونوں سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ ایک ہوش مند، جرأت مند اور بہت سے اپنے ہم عمروں سے مختلف ہے۔ اسے آگہی ہونی چاہیے کہ سر دست یہ کسی غلط بیانی کا محتمل نہیں ہوسکتا۔ آپ لوگ اسی شہر میں ہیں کچھ بھی آپ سے دور نہیں ہے، نہ میدا کا اڈا، نہ ڈاک خانے والی گلی، وہاں بہت سے راہ گیر اور اقامتی

تھے۔ پہلے ان گوشوں کونوں کو ذرا ٹٹول کر دیکھیے۔"
"وہ تو پولیس ٹیم کر ہی رہی ہے۔ صرف ہم تینوں افسران نہیں، پٹنا شہر کی ساری پولیس جلد از جلد نتائج حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ محکمے کی کارکردگی اور عزت کا معاملہ ہے۔" ادھیڑ افسر نے بڑی حد تک روکھے انداز میں کہا۔
"تو ٹھیک ہے، پہلے اپنے طور پر تفتیش کر لیجیے۔ ضرورت پڑے تو ضرور یہاں آ یئے۔ میں یقین دلاتا ہوں۔ یہ یہیں موجود ہے، کہیں نہیں جا رہا۔ آپ جب چاہیں یہاں آسکتے ہیں اور اس سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں خود اسے آپ کے حوالے کر دوں گا۔"
"لیکن ڈاکٹر صاحب مشکوک لوگوں کو ہمارے ہاں ایسی رعایتیں نہیں دی جاتیں۔ ہماری تفتیش کا اپنا ایک طریق کار ہے۔ مجرم کا کھرا کھوٹا ذرا جلدی سامنے نکل آتا ہے۔ ہمیں اس کے شہر فیض آباد کی پولیس سے بھی رابطہ کرنا ہے، اس کے تمام پس منظر اور دیگر حوالوں کی چھان بین کرنی ہے۔ پولیس کو اسے یوں کھلا چھوڑ دینے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہیے، اور آپ بھی جناب! معاف کیجیے، ہماری مخلصانہ صلاح ہے، آپ بھی اس پر اتنا اعتماد نہ کیجیے۔ میدا کے ٹھکانے پر یہ بات الٹی ہو جاتی، یا یہ اسپتال آنے والے سرپھروں کے ہاتھ آ جاتا تو بھی تو اس کا بھائی تنہا ہو جاتا۔" ادھیڑ افسر نے کھردری آواز میں کہا۔
"لیکن ایسا نہیں ہوا۔" ڈاکٹر بپھر کے بولا۔ "اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ اب آپ اس کی خوش قسمتی غصب کر لیں۔"
"ذرا اس پہلو پر بھی غور کیجیے ڈاکٹر صاحب! یہ پولیس کی تحویل میں زیادہ محفوظ رہے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ ان کے ہاتھ نہ آیا تو انہوں نے اس کے مربی و محسن اکبر علی خاں کو ختم کر دیا۔ وہ دوبارہ کچھ اور منصوبہ بندی بھی کر سکتے ہیں۔ لگتا ہے وہ چین سے بیٹھنے والے نہیں، بڑے خطرناک، منتقم مزاج لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے وجود سے ان کے جمے جمائے ٹھکانے، ان کی بادشاہت پر ضرب پڑنے کا خدشہ ہے اور اگر وہ میدا کے آدمی نہیں اور آپ کے اندیشے کے مطابق وہ پاگل ڈاک خانے والی گلی میں مرنے والے کے ساتھی بھی ہو سکتے ہیں تو وکیل صاحب کے خاتمے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے ہوں گے کیا؟ کیا انہوں نے اپنے ساتھی کی قیمت وصول کر لی؟ ہماری تفتیش اپنی جگہ، پولیس کی تحویل سے مراد اس کی حفاظت کی ضمانت بھی تو ہے۔ یہ کھلا رہا تو اور خون خرابے کا امکان ہے۔ جو لوگ اس کے دوست وکیل صاحب پر اپنا غضب آزما سکتے ہیں، ان سے کیا بعید ہے کہ وہ اس اسپتال میں پڑے اس کے بیمار بھائی کو بھی......" میری طرف دیکھ کے ادھیڑ افسر کی آواز بل کھانے لگی۔
"اب آپ نے ایک دوسری بات کہہ دی۔ ایک بات طے کر لیجیے، آپ اسے محض شک کی بنیاد پر ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، یا اس کی حفاظت کے لیے، یا دونوں کے لیے؟" ڈاکٹر جھلائے لہجے میں بولا "میں نہیں سمجھتا شک کی کوئی معقول وجہ موجود ہے اور حفاظت تو آپ یہاں بھی کر سکتے ہیں۔ اسپتال کی تاریخ میں پہلی بار پولیس یہاں آ چکی ہے۔ کچھ اور نفری بھیج دیجیے۔ یہاں اسپتال میں بھی آپ اس کی حفاظت بہ خوبی کر سکتے ہیں۔ تھوڑا بہت قانون مجھے بھی معلوم ہے۔ اپنی سلامتی کے لیے یہ قانوناً بھی آپ سے مدد طلب کر سکتا ہے اور رہی خانہ خرابی کی بات تو آپ شہر میں کس لیے ہیں آپ کا کیا کام ہے۔ شہر میں تین خونی وارداتیں ہو چکی ہیں اب بھی آپ......" ڈاکٹر کوئی شدید بات کہتے کہتے رہ گیا۔
چند لمحے توقف کے بعد اس نے نرمی سے کہا "آپ اسے یہاں سے لے جانے ہی پر مجبور اور مصر

ہیں تو مجھے بتایئے میں آپ کا بار کم کرنے، آپ کی بریت کے لیے کس حاکم اعلا سے بات کروں۔"
تینوں افسر اضطراری انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
"آپ کی اطلاع کے لیے......" ڈاکٹر نے روکھی آواز میں کہا، "کچھ دیر پہلے میں نے بیرسٹر پی ایل بھارگو سے بات کی ہے۔ وہ بہت مصروف ہیں لیکن میری گزارش رد نہ کر سکے، پورا معاملہ سن کے رضا مند ہو گئے۔ انہوں نے ضمانت قبل از گرفتاری کا مشورہ دیا ہے۔ میں اس کی ضمانت لے سکتا ہوں، کوئی بھی ضمانت۔"
یکا یک آئی جی اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں افسر اسے دیکھ کے ہڑبڑا گئے۔ ڈاکٹر رائے نے ان سے چند لمحوں کے لیے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ ڈاکٹر نے اتنی دیر میں پہلی بار مجھے مخاطب کیا۔ "تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"
اس نے انگیریزی میں مجھ سے پوچھا تھا۔ اس دوران وہ چاروں مسلسل انگریزی میں بات کرتے رہے تھے۔ کوئی جواب دینے کا مطلب تھا کہ میں نے ڈاکٹر کی بات سمجھ لی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے انگریزی میں بولنا پڑا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "نہیں ڈاکٹر صاحب! میں کیا کہوں اب۔ سبھی کچھ تو آپ نے کہہ دیا ہے۔ اڈے پاڑوں سے تعلق کی وجہ سے پولیس کا مجھے کسی قدر تجربہ ہے۔ ان کے لیے خانہ پری بہت اہم ہوتی ہے لیکن میں انہیں یقین دلاتا ہوں، میں اس وقت تک یہیں رہوں گا جب تک بھائی یہاں زیر علاج ہے۔ اور شہر سے جاؤں گا تو پولیس کو بتا کے۔"
میرے انگریزی بولنے پر ان تینوں کے جسم کھنچ سے گئے تھے۔ انگریزی زبان کا بھی کیا کرشمہ ہے۔ آدمی کچھ اور نظر آنے لگتا ہے۔ آدمی معتبر ہو جاتا ہے۔ پولیس والے تو وہ تھے ہی، موٹی چمڑی کے سہی، آدمی تو بہرحال ہوتے ہیں۔ اس گمان میں کہ میں کچھ اخذ نہیں کر پا رہا ہوں، میرے بارے میں انہوں نے بڑی ناگواری اور حقارت سے بات کی تھی۔ یقیناً انہیں اب کچھ خجالت ہونی چاہیے۔ خجالت کے بجائے ان کے چہروں سے حیرت جھلک رہی تھی۔
"میری آپ سے التجا ہے۔" میں نے براہ راست آئی جی کو مخاطب کیا "پولیس کا ایک اور کام بھی ہوتا ہے۔ جن کا نقصان ہوا ہے، ازالہ ممکن نہیں تو کم از کم ان کی دل دہی، دل جوئی کرنی چاہیے۔ میں نے اکبر علی خاں صاحب کا گھر دیکھا ہے۔ ان کے بچے زیادہ بڑے نہیں، بیوی کو اپنے شوہر سے بہت محبت تھی۔ ایک بوڑھی ماں بیمار ہے۔ ان کے گھر پہ تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ مجھ میں وہاں جانے کی ہمت نہیں تھی، کس منہ سے ان کا سامنا کر پاؤں گا لیکن میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اجازت نہیں دی۔" میں نے عاجزی سے تکرار کی "میں یہیں رہوں گا جناب! اس اسپتال میں، کہیں نہیں جاؤں گا میں۔ بھائی کے ٹھیک ہو جانے پر اس شہر میں مجھے ایک اور بھی کام ہے۔ میدا کے اڈے پر اپنا چاقو واپس لینے بھی جانا ہے۔"
تینوں متلاطم سے ہو گئے۔ نوجوان افسر نے بے کلی سے پوچھا، "تو......تو تم وہاں جاؤ گے؟"
"جانا ہے۔ یہ میرا اس کا وعدہ ہے۔ وعدہ تو قرض جیسا ہوتا ہے۔ کم از کم میرے لیے تو ہے۔"
"یعنی تم اسے زیر کر کے اس کے ٹھکانے پر قبضہ جمانا چاہتے ہو؟" نوجوان افسر کی آواز تمتمانے لگی تھی۔
"میں آپ کو شاید بتا چکا ہوں مجھے آگے جانا ہے، لیکن قرض چکا کے، بس چلتا تو میں آج ہی ادھر چلا جاتا لیکن ڈاکٹر صاحب نے مجھے یہاں ایک طرح سے قید ہو جانے کا حکم دیا ہے۔"
"بازی الٹ بھی تو سکتی ہے۔" نوجوان افسر

ے کہا۔
"بازیوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔" میں نے بے پروائی ظاہر کی۔
"دیکھا، دیکھا آپ نے ڈاکٹر صاحب! اس ، تیور دیکھے آپ نے؟" ادھیڑ افسر تیزی سے ا۔
"یہ سچ بول رہا ہے۔" ڈاکٹر نے اٹھی آواز میں ا۔
وہ تینوں اٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے بھی پھر ان سے ئی کلام نہیں کیا، چند رسمی الوداعی فقرے ادا ۔ نے ضروری سمجھے اور دروازے تک ان کا ساتھ ۔
ان کے جانے کے بعد کمرے میں ہم دونوں تنہا گئے تھے۔ چند ثانیوں تک ڈاکٹر سر جھکائے وش بیٹھا رہا۔ جیسے سانسیں استوار کرنے کی ش کر رہا ہو یا بہت تھک گیا ہو اور ایک وقفہ ن لازم ہو۔ میں اس کے نزدیک گم سم کھڑا رہا۔ ی عقل میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا وں۔ ہر لفظ مجھے بے مایہ محسوس ہوتا تھا۔ کچھ کہنے کوشش میں میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں اس ، ہاتھ چومنا، اس کے پیر پکڑنا چاہتا تھا۔ وہ یک کھڑا ہو گیا۔ ایک نظر میری جانب دیکھا اور ے کچھ کہنے سے پہلے اس نے ہونٹوں پر انگلی کے حکم دیا، "تم ایک لفظ نہیں کہو گے۔ میں نے چھ کہا اور کیا، اسی کو ٹھیک سمجھتا تھا۔ اب جاؤ اپنے رے میں اور بھائی کو دیکھو۔"
اس نے مجھے زبان کھولنے نہیں دی اور تیز وں سے کمرے سے نکل گیا۔ میں دیر تک بے وحرکت وہیں کھڑا رہا۔
کمرے کے باہر سیورین میری منتظر تھی، بے نیازی میری جانب لپکی اور عین میرے سامنے آ کے تہ روک کے کھڑی ہو گئی۔ "کیا ہوا، چلے گئے سب ٹھیک تو رہا؟" اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔
میں نے آنکھیں موند کے اور ہاتھ اٹھا کے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔
"میرا دل بہت دھڑک رہا تھا۔" وہ پھولی ہوئی سانسوں سے بولی، "لگتا ہے، تم ایک طویل مدت بعد قید سے رہا ہو کے آ رہے ہو۔"
"مجھے بھی کچھ یہی لگتا ہے۔" میں نے زہر خند سے کہا۔ "مجھے پولیس سے بہت ڈر لگتا ہے۔"
"کس کو نہیں لگتا۔ پولیس کو بھی شاید پولیس سے ڈر لگتا ہے۔" میں نے کہا "تسلی رکھو، سب ٹھیک ہی رہا۔"
"شکر ہے، میں دعائیں کر رہی تھی۔ سوچتی تھی، تمہارا آخر کیا قصور ہے۔" وہ امڈتی آواز میں بولی۔
میں نے اس سے نہیں کہا کہ میرا قصور تو میرا وجود ہے۔ اتنی کشاکش، اتنی آزمائشوں کے بعد بھی یہ وجود اپنے ہونے پر کیوں مصر ہے۔ ہم دونوں راہ داری کا مختصر فاصلہ عبور کر کے کمرے میں آ گئے اور میرے قدم سیدھے بٹھل کی طرف اٹھے۔ وہ جاگ رہا تھا میری آہٹ سے آنکھیں کھل گئیں۔ مجھے دیکھ کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ اس نے کچھ کہا تھا جو میں نہ سن سکا۔ اس نے دہرایا بھی نہیں۔ سیورین پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے بٹھل کے جسم پر ڈھلکی دلائی جیسی چادر درست کی، سرہانے جا کے بال سنوارے، پیشانی پر ہاتھ رکھا اور ہندستانی میں نرمی سے پوچھا، "سر میں درد تو نہیں۔"
بٹھل نے ممنونیت کے انداز میں سر ہلا کے انکار کیا۔
"کچھ چاہیے آپ کو؟" سیورین نے شگفتگی سے پوچھا۔
بٹھل نے اپنا ہاتھ چادر سے باہر نکالا۔ سیورین بہت ہوش مند اور مستعد لڑکی تھی۔ دوسری جانب جا کے اس نے بٹھل کا اٹھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ادھر

بٹھل کا دوسرا ہاتھ میں نے پنجے میں جکڑ لیا۔ پنجے پر اس کی گرفت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا ارادہ بحال ہو رہا ہے۔ ارادہ آدمی کی متاع ہے۔ اس کے بغیر آدمی کیا ہے؟ ہے بھی، نہیں بھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک بھی تیز تھی۔ سیورین آدھی انگریزی، آدھی ہندستانی میں اسے تشفی دلاسے دینے لگی۔ بٹھل کے ہونٹوں پر اطمینان کی مسکراہٹ چھائی رہی۔ گھڑی دیکھ کے سیورین کے بدن میں جیسے بجلی سی بھر گئی۔ اس نے بٹھل کا بستر سرھانے سے کچھ اونچا کیا اور یکے بعد دیگرے دوائیاں پلانے لگی۔ کچھ دیر بعد بٹھل کے پپوٹے بھاری ہونے لگے اور وہ جلد ہی خود سے بیگانہ ہو گیا۔ سیورین نے مجھے اس کے پاس سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ پنجے میں دبا ہوا بٹھل کا ہاتھ آہستہ آہستہ میں نے جدا کیا۔ اس کی گرفت پہلے ہی کم زور پڑ چکی تھی۔ دواؤں میں یقیناً خواب آور دوائیں شامل ہوں گی یا اسے بھی اتنے ہی حوصلے کی توفیق ہو سکی تھی مگر یہ بھی غنیمت تھا۔ گزشتہ کل کی نسبت سے تو بہت غنیمت تھا۔

سونے پر آ کے میں نے اپنے آپ سے غافل ہونے کی کوشش کی، لیکن آدمی کا اختیار اس کے پاس کس قدر ہے۔ کتنا ہی کوئی ارادے کا پختہ ہو، اس کے دل و دماغ کتنے ہی متوازن ہوں، اسے اپنے دریچے دروازے بند کرنے کی مقدرت نہیں ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا، یا سنا تھا کہ آدمی کا سب سے بڑا دوست اس کا ہوش ہے اور سب بڑا دشمن بھی یہی ہوش ہے۔

دروازے پر کسی رفیق کار کی جھلک دکھائی دی تھی کہ اسے کمرے میں بلانے کے بجائے سیورین خود باہر چلی گئی۔ بٹھل کمرے میں موجود تھا، لیکن بے خبر آدمی کی موجودی ایک گمان ہے۔ میں تنہا رہ گیا، اور آدمی تنہا کہاں ہوتا ہے۔ تنہائی تو ایک عددی امتیاز ہے کسی کے ساتھ دوسرا کوئی نہیں ہے، مگر آدمی ہمہ وقت، ہر لمحہ اپنے ساتھ جو ہوتا ہے۔ تنہا آدمی اپنی ذات کے ہجوم میں گھر جاتا ہے، ایک دریچہ بند نہیں ہوتا، دوسرا کھل جاتا ہے، تیسرا، چوتھا...... اور کیسے کیسے بھولے بسرے، دور افتادہ، کیسے مٹی لوگ آ کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میرا سر دکھ رہا تھا۔ سر کیا، سارا جسم ہی کسی زخم کے مانند تھا۔ آدمی کو اپنا آپا کبھی کیسا حقیر، کوڑے کا ڈھیر لگنے لگتا ہے۔ میں بہت نظریں چراتا تھا، لیکن بار بار اکبر علی خاں سامنے آ جاتے تھے، مجھ سے جیسے کوئی سوال کرتے ہوں، ان کی بیوی، ان کے بچے، ان کی بیمار ماں، جنہیں میں نے نہیں دیکھا تھا، لیکن ایک ضعیف و ناتواں عورت...... ان سب کی نظریں کانٹوں کی طرح، میرے جسم میں پیوست ہوتی تھیں اور ہڑک سی سینے میں اٹھتی تھی کہ میں یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہوں۔ کیا صرف پشیمانی، ملال اور بے بسی کا احساس اکبر علی خاں جیسے بے بہا، بے پناہ آدمی کا مول ہے۔ دست و بازو اینٹھنے لگتے تھے کہ یہ کیسی مصلحت کوشی، مآل اندیشی ہے کہ میں یہاں ہاتھ پیر توڑے بیٹھا رہوں۔ اکبر علی خاں یوں چلے جائیں اور مجھے معلوم ہو کہ ان کے قاتل کس سمت سے آئے تھے، وہ کون ہو سکتے ہیں۔

مجھ سے بیٹھا نہ جا سکا تو اٹھ کے کمرے میں چکر کاٹنے لگا، اس کونے سے اس کونے تک۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، کھڑکیاں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ دن کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن روشنی، ہوا، کھلی کھڑکیاں، کھلے دروازے، سب کچھ آدمی کے اخذ و استنباط کی آمادگی سے مشروط ہے۔ آدمی کے اندر ہی اندھیرا چھایا ہوا اور آدمی کا جسم ہی محبس بنا ہو اور آدمی کو اپنا آپا ہی زہر لگ رہا ہو۔

شکر ہے سیورین جلد واپس آ گئی۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ آ کے اس نے وہی شائستگی اختیار کی جو اس لڑکی کے حسن و جمال اور نرم اور نازکی پر مستزاد تھی۔ مجھے بتائے بغیر باہر جانے کی معذرت کی اور کہنے لگی، اس کی رفیق کار دوست اسے بتانے آئی

تھی کہ انتھونی کی بیوی شیری کا بچہ اس کے پیٹ میں مر گیا ہے۔ آپریشن کر کے شیری کو بچا لیا گیا ہے، لیکن اس کی حالت نازک ہے۔ سیورین بہت اداس تھی۔ مجھ میں مزید یاسیت کی تاب نہیں تھی۔ میں خاموش رہا اور دوبارہ سونے پر آ پڑا۔ اکبر علی خاں کے سانحے سے انتھونی اوجھل سا ہو گیا تھا۔ وہ بھی تو اپنے گھر والوں کو بہت عزیز تھا۔ اس کی بھی بیوی تھی اور متعلقین تھے۔ مرنے والوں کے پس ماندگان اذیتیں جھیلنے کے لیے کیوں زندہ رہ جاتے ہیں۔ ایک آدمی مر جاتا ہے تو کتنے آدمی ویران ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی مر جایا کریں تو کسی کی جدائی کسی کے لیے عذاب نہ رہے۔ کسی آدمی کے مر جانے سے ایک گھر اجڑ جاتا ہے تو گھر ہی کیوں باقی رہے۔

سیورین میرے پاس آ کے بیٹھ گئی اور دیر تک کھوئی کھوئی رہی۔ مجھے وقت کا احساس نہیں تھا۔ کسی لمحے اس کی نظر گھڑی پر گئی ہوگی، یا اسے ویسے ہی خیال آیا کہ چونک کے بولی، "تم نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔"

میں نے اپنے آپ کو سمیٹ کے کہا، "بھوک ہی نہیں ہے۔"

"تھوڑا بہت تو کچھ کھا لو۔"

میں نے بیزاری سے انکار کر دیا۔

کل اسی وقت اکبر علی خاں کھانا لائے تھے۔ سیورین بھی شریک ہو گئی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ یقیناً اسے اکبر علی خاں یاد آ رہے ہوں گے۔ آدمی کتنی جلدی محض یاد ہو جاتا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا، میری وجہ سے وہ ان کا ذکر نہیں کر رہی ہے۔

"چائے...... کافی، یا تھوڑا سا رس...... کچھ تو لے لو......" وہ التجائی لہجے میں بولی۔

"نہیں، اس وقت کچھ نہیں۔ بس تم یہاں بیٹھی رہو۔"

"میں یہیں ہوں۔" اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے ڈوبی آواز میں کہا، "مجھے معلوم ہے، تم پر کیا گزر رہی ہے۔ کہتے ہیں بس...... مگر کوئی کسی کا دکھ کیا بٹا سکتا ہے۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی لیکن یہ بھی تو ایک سچ تھا کہ اس کی موجودی سے گھٹن کچھ کم محسوس ہوتی تھی۔

"ایک بات پوچھوں؟" وہ آہستگی سے بولی۔

میں نے پلکیں جھپکا کے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ پولیس افسروں سے تمہاری کیا بات ہوئی۔ مجھے کچھ بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں، کچھ خاص نہیں۔"

"سنا ہے، بڑے پاگل لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ایسے آسانی سے کسی کو نہیں چھوڑتے۔"

"میں نے جو تھا، انہیں بتا دیا تھا، لیکن وہ میری بات تسلیم نہیں کر رہے تھے۔"

"پھر کیسے تم......؟" وہ ہونٹ چبانے لگی۔

"پھر ڈاکٹر رائے نے ان سے بات کی۔"

"ڈاکٹر رائے! کیا وہ بھی وہاں موجود تھے؟"

"بعد کو آ گئے تھے اور پھر انہوں نے...... انہوں نے تو......" میری آواز رندھنے لگی۔ "کیسے مشفق اور سچے آدمی ہیں وہ۔ اس وقت میں یہاں تمہارے پاس انہی کی وجہ سے بیٹھا ہوں۔"

"وہ تو ایک مکمل آدمی ہیں۔ سبھی ان کی عزت بے وجہ تو نہیں کرتے اور سبھی ان سے بے وجہ خوف نہیں کھاتے۔ وہ تو ایک مثال ہیں۔"

"کون ہوتا تھا میں ان کا؟ ایک اجنبی، ایک بیمار آدمی کا نگہدار...... اور کیا رشتہ ہے میرا ان سے؟"

"صبح جوان سے تمہاری بات ہوئی ہے۔ تم نے ضرور انہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔"

"میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں تھا...... اور انہوں نے اسی طرح یقین کیا، جس طرح میں نے کہا تھا۔"

"وہ جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ صرف ڈاکٹر ہی

نہیں، وہ بہت بڑے مردم شناس اور انسان دوست آدمی ہیں۔"

"وہ تو وہاں میری وکالت کرتے رہے اور میں! میں انہیں دیکھتا رہا۔ میرے ساتھ ہر جگہ کچھ نہ کچھ ایسا ہی اندھیر ہوتا رہتا ہے، اور ایسے ہی لوگ مل جاتے ہیں۔ کس کس کا نام لوں، یہاں اکبر علی خاں مل گئے تھے اور اب...... خدا ڈاکٹر صاحب کو لمبی عمر دے۔ میری عمر بھی انہیں لگ جائے۔"

"اچھے لوگوں کو اچھے لوگ مل ہی جاتے ہیں۔"

"اور اچھے لوگوں کے ساتھ اتنا برا بھی تو ہوتا رہتا ہے...... میں تمہیں کیا بتاؤں ...... کیا کیا بتاؤں۔"

سیورین کے پاس کوئی جواز نہیں تھا، افسردگی سے بولی، "کہتے ہیں، خداوند کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔"

"انھونی اور اکبر علی خاں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ کیسی مصلحت ہے خدا کی؟"

یہی ایک جواب ہر عاجز اور ناتواں کی سپر ہوتا ہے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ سیورین نے بھی یہی کہا۔

"انھونی ان کے راستے کی رکاوٹ بن گیا تھا، لیکن اکبر علی خاں......! صرف اتنی سی بات پر کہ تین چار دن سے وہ میرے بہت قریب ہو گئے تھے اور میں ان کتوں کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا، انہوں نے ایک بے گناہ کو ختم کر دیا...... اور کس بات پر......! کہ میں کسی طور پر ان کے ساتھی دھنوا کی موت کا سبب بن گیا تھا لیکن وہ جانتے ہیں، میں نے اسے نہیں مارا تھا۔ اور سبب بھی میں کہاں تھا، انہوں نے ہی زیادتی کی تھی۔"

"وہ آدمی نہیں درندے معلوم ہوتے ہیں۔" سیورین تلخی سے بولی۔

"ان کا انجام بھی پھر ہولناک ہونا چاہیے۔" مجھے اپنی آواز پر قابو نہیں رہا۔ "انہیں ایسے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ظالم کو اس کے انجام سے دوچار کر دینے میں تامل و تاخیر بڑی اذیت، بہت بڑا جبر ہے۔"

سیورین مجھے صبر و ضبط کی تلقین کرنے لگی۔ وہ یہی کچھ کر سکتی تھی۔

وہ کیا جانتی تھی، میرا سینہ بہت جلتا ہے۔ مجھے تو ایک پل بھی کاٹنا دوبھر ہو رہا ہے۔ "اتنا وقت نہیں ملنا چاہیے انہیں۔" میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔

"مگر تم ...... تم سردست کیا کر سکتے ہو۔ شاید کچھ بھی نہیں۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

اس کے غیر متوقع ترشی آمیز لہجے پر مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پلکیں پٹ پٹانے لگی اور جیسے اس نے کچھ سوا کہہ دیا ہو۔ وہ خجل سی ہو گئی...... مگر اس نے کیا غلط کہا تھا۔ مجھے تو انتظار کرنا ہے جب تک ان لاٹ صاحب کی طبیعت سازگار نہیں ہو جاتی۔ میرے پیروں میں تو انہوں نے زنجیر ڈال رکھی ہے...... اور یہ سب کچھ ہوا بھی انہی کی وجہ سے ہے۔ نہ وہ اپنی یہ حالت بناتے نہ ہمیں اس شہر میں آنا پڑتا اور نہ یہ وقت دیکھنا پڑتا۔

"تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔" میں نے مایوسی سے کہا، "لیکن میں کیا کروں اس طرح منہ چھپائے بیٹھا نہیں جا رہا۔ اکبر علی خاں کے گھر والوں کا خیال آتا ہے۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے میں کیسا بے حس، بے غیرت ہوں، اپنے محسن کے پُرسے کے لیے نہیں آیا اور دوسرے لوگ...... اکبر علی خاں کے گھر پر ان کے اعزا، احباب، پاس پڑوس والوں کا ایک ہجوم ہو گا۔ وہ لوگ کیسی کیسی چہ میگوئیاں کر رہے ہوں گے۔ انہیں بتایا گیا ہو گا کہ تین چار دن سے ایک اجنبی سے ان کی رسم و راہ بہت بڑھ گئی تھی۔ صبح و شام اسپتال جانا ان کا معمول ہو گیا تھا۔ بہت باتیں ہو رہی ہوں گی وہاں۔"

"وہاں تمہارے جانے کے بعد بھی یہی کچھ ہو گا۔" سیورین دبی دبی آواز میں بولی۔

"لیکن میرا جی تو مطمئن ہو جاتا۔ اب خیال آتا ہے۔ شاید یہی بہتر تھا کہ پولیس مجھے ساتھ لے جاتی۔ پھر میرے وہاں نہ جانے کا ایک عذر تو معقول ہوتا۔"

"اوہ، نہیں نہیں۔" سیورین بے قرار ہو گئی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں خود کو بے بس، بہت حقیر محسوس کر رہا ہوں۔"

"کیوں؟" وہ حیرانی سے بولی، پھر اس کے شانوں کی طرح اس کی آواز بھی ڈھلک گئی۔ کہنے لگی، "برا نہ مانو تو کچھ کہوں۔"

"اس سے برا کیا ہو گا جو ہو رہا ہے۔" میں نے پژمردگی سے کہا۔

"معاف کرنا، لگتا ہے تم اپنے حواس میں نہیں ہو اور ذہنی انتشار میں بڑی الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو، تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم اپنے بھائی کو یہاں چھوڑ کے پولیس کے ساتھ چلے جاتے تو تمہارے پاس اکبر علی خاں صاحب کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہونے کا ایک عذر ہو جاتا۔ یہی نا؟ تم چلے جاتے ان کے ساتھ۔ تم نے ڈاکٹر رائے کو روک دیا ہوتا کہ وہ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ یہ تو تم اب بھی کر سکتے ہو۔ یہاں اسپتال میں بہت سے پولیس والے چوکسی کر رہے ہیں۔ تم اب بھی ان کے سامنے جا کے خود کو پیش کر سکتے ہو۔"

سیورین ایک مختلف لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دہک رہا تھا۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"ہم یہاں تمہارے بھائی کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ وہ پوچھے گا تو تمہاری یہاں ناموجودی کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیا جائے گا۔ وہ مان لے گا تو ٹھیک ہے، نہیں تو......"

مجھے حیرت ہوئی، اسے اس طرح کی نکیلی زہریلی باتیں کرنا بھی آتی ہیں۔ میں نے زبان بند رکھی، اس لیے کہ میرے پاس تردید کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"ڈاکٹر رائے ایک دانش مند آدمی ہیں۔ انہوں نے ہر طرف دیکھ کے ہی پولیس سے بات کرنے، ایک اجنبی کے معاملے میں دخل اندازی کا فیصلہ کیا ہو گا۔" سیورین کی آواز ماند پڑ گئی۔ "انہوں نے تمہارے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ ایسی پابندی جو تم کسی لمحے بھی توڑ سکتے ہو۔ یہ پابندی نہیں۔ ایک بزرگ، ایک مہربان شخص کی تاکید ہے۔ ڈاکٹر رائے کو معلوم ہے کہ شہر کی کیا حالت ہے۔ تین چار دن میں تین قتل ہو چکے ہیں اور تم کسی نہ کسی طور سے ان میں ملوث ہو۔ باہر تمہارے دشمن تمہاری تلاش میں ہیں۔ انہیں یقین ہو گا کہ تم اکبر علی خاں کے پرسے کے لیے ان کے گھر کا رخ ضرور کرو گے۔ ان پاگلوں کے سر پر خون سوار ہے۔ وہ تاک لگائے بیٹھے ہوں گے اور تم ان سے بچ کر اکبر علی خاں کے گھر پہنچ گئے تو وہاں موجود بے شمار تعزیت دار تم سے کوئی باز پرس نہیں کریں گے کیا؟ وہ طرح طرح کے سوالوں سے تمہارا سینہ چھلنی کر سکتے ہیں۔ ایک دور دراز امکان یہ بھی ہے کہ اکبر علی خاں کا کوئی فدائی تمہیں وہاں دیکھ کے اپنے ہوش و حواس میں نہ رہے اور...... اور تم پر کوئی شبہ ہے تو جلد ہی پولیس اور دوسرے ذریعوں سے ہر کسی کو باور ہو جائے گا کہ اکبر علی خاں کی ہلاکت کے وقت تم اپنے بھائی کے پاس اسپتال میں تھے...... تم نے سوچا، ان پے در پے سنگین واقعات کے بعد شہر کے لوگ تمہاری صورت دیکھنے کے لیے کتنے......"

بٹھل کو کچھ تکلیف ہوئی تھی کہ یکایک کمرے میں کراہ جیسی اس کی آواز گونجی۔ سیورین صوفے سے اٹھ کے اس کے بستر کی جانب لپکی۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ بٹھل نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی تھی۔ سیورین نے اس کی مدد کی، سر اٹھا کے تکیہ درست کیا اور جسم تھپ تھپاتے ہوئے دیر تک

نگہداری کرتی رہی۔ بھل غفلت میں تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کہ وہ دوبارہ سونے پر آبیٹھی اور معذرت کرنے لگی کہ اس نے اپنی حیثیت سے تجاوز کیا۔ وہ نہ جانے کیا اول فول بکتی رہی۔

”تم نے کیا...... کیا غلط کہا۔“ میں نے ہیجانی لہجے میں کہا، ”مجھے تو تعجب ہے، تمہیں اتنی باتیں...... اتنی مدلل اور موثر باتیں بھی کرنی آتی ہیں۔“

میں کہہ نہ سکا اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کے تخمینے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ اس کانچ کی بنی، پھولوں کی طرح نازک، ریشم کی طرح نرم لڑکی کی دانائی اور جزو بینی کا مجھے ایسا اندازہ نہیں تھا۔ وہ مجھے زریں کی مثل لگ رہی تھی۔ کوئی کسی کے بکھیڑے، کسی کے دکھ میں اس قدر سنجیدہ، اتنا شامل کہاں ہوتا ہے۔

”ایک بات بتاؤ، تمہیں اکبر علی خاں کے گھر جانے کی بے کلی ہے۔ یا ان کے قاتلوں کی سرکوبی کی؟“

مجھے جواب دینے میں ہچکچاہٹ ہوئی۔

میرے جواب کے انتظار میں اس نے چند لمحے تامل کیا اور متانت سے بولی۔ ”شاید دونوں کی...... ہونی بھی چاہیے، لیکن بہ وجوہ نہ اس وقت اکبر علی خاں کے گھر جانا مناسب ہے نہ کسی دوسرے کام سے باہر جانا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ بس تمہارے باہر نکلنے کی دیر ہے، تم ان کے سروں پر پہنچ جاؤ گے جنہوں نے انتھونی اور اکبر علی خاں سے ان کی زندگیاں چھین لی ہیں۔ تمہارے انتظار میں وہ سر جھکائے کھڑے ہوں گے کہ ہمیں ہمارے انجام تک پہنچاؤ......؟ اور کیا تم اس گمان میں ہو کہ کسی اور طرف جانے کے بجائے تم سیدھے اس بدمعاش کے ٹھکانے کا رخ کرو گے جس کا چاقو تمہاری جیب میں ہے اور جو شہر کے تمام شورہ پشتوں کا سرغنہ ہے۔ تم اسے تخت سے اتار کے اس کی قلم رو کے حاکم بن جاؤ گے، پھر سب کچھ تمہارے زیر نگیں ہوگا اور اس کا ہر آدمی تمہاری دست رس میں...... تمہارے پاس ایسی کوئی ضمانت ہونی چاہیے کہ وہاں پہنچنے کے بعد تم سے بہادروں اور بادشاہوں کا سلوک کیا جائے گا۔“

”لیکن میں...... میں تو یہاں موجود ہوں۔“ میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا، ”ڈاکٹر رائے کی تنبیہ کے باوجود میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔ بے شک میرے ذہن میں یہ خدشات اور اندیشے اتنے واضح نہیں تھے، لیکن تھے ضرور...... اس لیے میں نہ جاسکا میں تو اپنے دل و دماغ کی حالت، اپنی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ مجھ پر یہ وقت بہت بھاری گزر رہا ہے۔ یہ کمرا اب مجھے قید خانہ سا محسوس ہوتا ہے۔“

”یہ کرب و اضطراب بڑا فطری ہے لیکن اس نظر بندی کے سوا تمہارے پاس کیا راستہ ہے۔“ سیورین دل سوزی سے بولی، ”بہادری کو دانائی سے عاری نہیں ہونا چاہیے۔ باہر جا کے تم اپنے مقصد میں کام یاب بھی ہو جاؤ تو اکبر علی خاں اور انتھونی کو واپس نہیں لا سکتے۔ اس کام یابی کے بعد اور پیچیدگیاں بھی تو پیدا ہو سکتی ہیں۔ پولیس دوبارہ تمہیں ساتھ لے جاسکتی ہے اور تمہیں اندازہ ہوگا کہ اپنی جگہ پر وہ تم سے کس طرح پیش آسکتے ہیں، پھر ڈاکٹر رائے بھی شاید کچھ نہ کر پائیں۔ اب اس قدر اپنا ذہن مغلوب نہ رکھو تو اچھا ہے۔ اس وقت تمہارے متعلق شہر میں بہت افواہیں گردش کر رہی ہوں گی۔ تم کس کس کی زبان پر تالا لگاؤ گے۔ چند دن میں بہر حال، سب کچھ آئینہ ہو جائے گا۔ پولیس بھی یوں پاؤں پسارے بیٹھی تو نہ رہے گی۔ وکیل، عدالت، قانون، انصاف سب ختم ہو گئے کیا۔ کچھ خداوند پر بھی چھوڑ دو۔ تمہارے کسی غلط قدم سے بہت کچھ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ تمہارا بھائی متاثر ہو سکتا ہے۔ وہ صحت یاب ہو رہا ہے۔ اسی پر تمہاری توجہ مرکوز رہنی چاہیے کہ تم اسی لیے یہاں، اس شہر میں آئے تھے۔ بعد کو تمہاری جو مرضی

ہو، کر لینا۔'' وہ چپ ہو گئی۔

سیورین کے لہجے میں بیگانگی کی رمق نے مجھے بہت آزردہ کیا۔ ''میں...... میں کہیں نہیں جا رہا۔'' اسے مطمئن کرنے کے لیے میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

میری طرف دیکھ کے اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور میرا ہاتھ تھپکنے لگی۔ میری آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے۔ سوفے سے اٹھ کے وہ حاکمانہ انداز میں بولی، ''میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔ انکار مت کرنا۔ تمہی نے کہا تھا، غم کی توانائی کے لیے غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ ایسا ہی کہا تھا نا......؟'' یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

معمول کے خلاف دوپہر بٹھل کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر رائے کے بجائے دو اور ڈاکٹر آئے، لیکن شام کے دورے پر ڈوبتے اجالے کے کے وقت ڈاکٹر رائے ایک نوجوان ڈاکٹر اور ایک عمر رسیدہ نرس کے ساتھ کمرے میں وارد ہوا۔ وہ کچھ عجلت میں معلوم ہوتا تھا، بدحواس سا۔ آتے ہی وہ سیدھا بٹھل کے پاس گیا اور مجھے باہر چلے جانے کی ہدایت کی۔ بٹھل کے معائنے کے دوران اس نے دوسری بار مجھے باہر چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ راہ داری میں میں زیادہ دور تک نہیں گیا تھا کہ کچھ فاصلے پر دو بندوق بردار سپاہی گشت کرتے نظر آئے۔ مجھے دیکھ کے وہ چوکنے سے ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ آزمائشاً کچھ اور آگے جاؤں، لیکن بے کار منہ لگنے والی بات نہ ہو جائے۔ ادھر کسی وقت ڈاکٹر رائے کی طلبی کا خیال بھی مانع رہا۔ میں نے اپنے قدم روک لیے اور فوراً ہی واپس آ گیا اور کمرے کے آس پاس راہ داری میں ٹہلتا رہا۔ یہی ہوا، کچھ دیر بعد سیورین تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی اور اس نے ہاتھ ہلا کے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کسی لمحے کی تاخیر کے بغیر میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے کا منظر میرے لیے کسی خواب کے مانند تھا۔ بٹھل بستر پر بیٹھا ہوا تھا اور ڈاکٹر رائے اس کے بہت قریب کھڑا سرگوشیاں سی کر رہا تھا۔ بٹھل بھی زیرِ لب، کبھی سر ہلا کے اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس کی آواز پر نقاہت طاری تھی۔ ڈاکٹر رائے نے مجھے پاس بلا لیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے چہکتی آواز میں بٹھل کو مخاطب کیا، ''یہ بہت تنگ کرتا ہے، ہم کو...... اس کے لیے تم کو جلدی ٹھیک ہو جانا ہے، سمجھا۔ نہیں تو یہ بیمار پڑ جائے گا۔''

بٹھل نے پلکیں جھپکیں، میری طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کوئی حسرت سی امڈ آئی۔ اس نے سر ہلا کے ڈاکٹر رائے کو جیسے یقین دلایا کہ وہ اپنی ہمت مجتمع کرنے کے لیے خود فکرمند ہے۔

''سر میں اب تکلیف تو نہیں؟'' میں نے بے تابانہ پوچھا۔

بٹھل نے گہری سانس لے کے اور آنکھیں بند کر کے بدبداتے ہوئے نفی کی۔ ''بس اب تم ٹھیک ہو جاؤ گے جلد ہی۔''

ڈاکٹر رائے میرا بازو تھامے مجھے اس کے پاس سے سوفے پر لے آیا۔ اس کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر اور نرس نے سیورین کی اعانت سے بٹھل کا بستر پھر نیچے کر دیا۔

''اکبر علی خاں کی تدفین آج نہ ہو سکی۔'' ڈاکٹر نے یاس بھرے لہجے میں مجھے بتایا، ''اس کا بڑا بھائی حیدرآباد دکن سے آ رہا ہے۔ سنا ہے، تدفین کل کسی وقت اس کے آنے پر ہو گی۔''

میں چپ بیٹھا رہا۔

''شہر کے حالات نہایت کشیدہ ہیں۔ سارے میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ بدقماش لوگ اسے دوسرا رنگ دے رہے ہیں، کیوں کہ ایک عیسائی، دوسرا مسلمان قتل ہوا ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کے اندیشے میں پولیس بڑی تعداد میں شہر میں گھوم رہی ہے۔ تم کہیں باہر نہ جانا۔ اسپتال میں بھی پولیس کی بڑی

نفری موجود ہے اور تمہارے اردگرد وہ بہ طورِ خاص نگرانی کر رہے ہیں۔ آج دن بھر کچھ عجب مصروفیت رہی۔ اتفاق سے آج اسپتال میں کچھ سنگین قسم کے مریض آ گئے۔ دوپہر گھر بھی جانا نہ ہو سکا۔ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔ رات کو شاید آنا نہ ہو سکے۔ بھائی کے لیے ساری ہدایات میں نے ڈاکٹروں کو دے دی ہیں...... تم بھی اب آرام کرو اور اپنے ذہن پر اتنا زور مت دو۔ ہمیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔'' مجھے پند و نصائح کرتے ہوئے اس نے کسمسا کے کہا، ''تمہارے آدمی ابھی تک نہیں پہنچے۔''

''جی!'' میں نے واجبی احترام میں اختصار گوئی پر اکتفا کیا۔ ''معلوم نہیں کیوں، اکبر علی خاں صاحب نے تار دیے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ارجنٹ تار دیے ہیں، اور احتیاطاً ایک کے بعد دوسرا تار......''

''تم نے انہیں کیوں بلایا تھا؟'' اس کی آواز روکھی تھی۔

''یہی...... یہاں کی...... اور اپنی صورت حال دیکھ کے اکبر علی خاں صاحب نے بھی مشورہ دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پولیس کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھ پر کوئی برا وقت آ سکتا ہے، سو پیش بندی کے طور پر......'' میرا لہجہ غیر ارادی طور پر معذرت خواہانہ ہو گیا۔ وہ ہنکاری بھر کے رہ گیا۔

''آ جائیں گے پھر۔ تم نے بتایا تھا کہ ان کا تعلق بھی...... وہ کیا کہتے ہیں......'' وہ الجھ کے بولا، ''اڈوں وغیرہ سے ہے۔ انہیں بھی پابند کرنا ہے تمہیں...... اور ہاں، وہ دن بھر اسپتال میں رہ سکتے ہیں، رات کو انہیں کوئی اور بندوبست کرنا ہے۔''

''جی!'' میں نے اسی طرح سنا جس طرح اس نے کہا تھا۔

''اور سنو! انہیں روک کے رکھنا ہے۔ وہ یہاں کوئی تماشا نہ کریں۔ تمہاری خوش نودی میں ان کا ایسا خیال ہو تو اس اسپتال کا رخ ہی نہ کریں۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

''جی، میں سمجھتا ہوں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

یہ احکام صادر کر کے وہ سوفے سے اٹھ گیا اور اس نے میرے گال پر ہلکی سی چپت رسید کر کے مسکراتے ہوئے بولا، ''ہوش میں رہنا، کوئی کارنامہ نہیں۔''

''آپ نے ہاتھ پیر ہی باندھ دیے ہیں۔'' میرے منہ سے نکل گیا۔

''ورنہ...... ورنہ تم کیا کرتے؟'' وہ اچک کے بولا۔

مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ میں نے لکنت سے کہا، ''شاید کچھ بھی نہیں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے۔''

''اچھے لڑکے!'' وہ شاباش کے انداز میں بولا، ''اور سنو! تمہیں رات کو شاید نیند نہ آئے۔ سیورین نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے بہت برا وقت گزارا ہے۔ کہو تو نیند کا انجکشن لگا دوں...... گولیوں سے بھی کام چل جائے گا۔''

میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ میرے سینے پر مکا مار کے وہ کمرے سے چلا گیا۔

نرس ایمی آ چکی تھی۔ آتے ہی، جیسے کوئی بلائیں لیتا ہے، مجھے پہلو سے لگایا اور کہنے لگی کہ صبح وہ چلی تو گئی تھی، لیکن دن بھر اسے چین نہیں آیا۔ میری طرف دھیان لگا رہا۔ اس لیے اس نے شام کی ڈیوٹی پر آنے میں بھی جلدی کی۔

سیورین کو اب گھر جانا تھا، لیکن نرسوں کے لیے مخصوص پیوستہ کمرے میں لباس تبدیل کر کے وہ واپس آ گئی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ وہ گھر کا لباس پہنے ہوئے تھی اور گھر ہی کی کوئی لڑکی لگ رہی تھی، اجلی اجلی، صاف شفاف، شرمیلی شرمیلی اور اداس اداس۔ لباس کی تبدیلی سے بھی آدمی کیا سے کیا

ہو جاتا ہے۔ اس لباس میں اسے دیکھ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی اسپتال میں ایک تربیت یافتہ، ماہر نرس کا کام کرتی ہے۔ ہلکی نیلی رنگت کی ساڑھی میں اس کا ترشا ہوا سراپا نمایاں ہو گیا تھا۔ سر سے گردن تک لپٹے ہوئے اسی رنگت کے اسکارف میں چہرہ کچھ اور کھل اٹھا تھا۔ اسے تو اس اسپتال کے بجائے کہیں اور ہونا چاہیے تھا، کسی محل دو محلے میں...... ایمی کسی کام سے باہر گئی تھی کہ وہ سرسرائی آواز میں بولی، "میں رات کو رک بھی سکتی ہوں۔"

میں نے بے دلی سے کہا، "مگر تمہیں...... تمہیں گھر جانا چاہیے۔"

"گھر کہلوایا جا سکتا ہے، کبھی کبھی ایسا ہوتا رہتا ہے۔"

"مگر ایمی تو یہاں موجود ہے، تم بے آرام ہو گی۔"

"گھر میں آرام کہاں ہو گا۔" وہ آہ بھر کے بولی۔

"کیوں؟" مجھے تردد ہوا۔ "کوئی الجھن؟"

"نیند نہیں آئے گی۔"

"ہاں!" میں نے مایوسی سے کہا۔ "ان حالات میں نیند کیسے آ سکتی ہے مگر تم...... تم تو خود مجھے ہدایات دے رہی تھیں۔"

"لیکن اب لگتا ہے، میرے حالات تم سے مختلف نہیں۔"

"تم یہاں رکنا چاہتی ہو؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"تمہیں اگر ضرورت محسوس ہوتی ہو۔" وہ جھجک کے بولی۔

"میں تو کسی نہ کسی طرح وقت کاٹ ہی لوں گا، کاٹنا ہی ہے۔ چوں کہ آدمی کو زندہ تو رہنا ہی ہوتا ہے، اپنے لیے نہیں تو دوسروں کے لیے۔"

"اور شاید دوسروں کے لیے زندہ رہنا ہی زندگی ہے۔" اس نے جلتی بجھتی نگاہ سے مجھ دیکھا اور اٹھ گئی۔

"جا رہی ہو۔" میں نے اسے ٹوکا۔ "کہیں تم میری نگرانی کے لیے تو......؟ یہ ایمی بھی بڑی چوکی دار ہے، اور میں کہاں جاؤں گا۔"

"تمہارا ہی خیال تھا۔" اس نے ہمکتی آواز میں کہا۔

"میں ٹھیک رہوں گا۔ تم اپنا خیال رکھنا۔" وہ دروازے سے نکلا چاہتی تھی، میں نے کہا کہ میرے کپڑے شکستہ ہو گئے ہیں اور ہوٹل میں سارا سامان ہے۔

وہ رک گئی اور سوچ میں ڈوب گئی۔ "اور نئے کپڑے اتنی جلد تیار نہیں ہو سکتے۔ ہوٹل میں کسی آدمی کو تمہارا خط، تمہارا اجازت نامہ دے کے بھیجا جائے تو......"

"ہوٹل والے انکار کر دیں گے۔"

"پھر تو ایک ہی صورت ہے۔" وہ رک رک کے بولی، "کچھ دیر کے لیے تمہیں برابر کے نرسوں والے کمرے میں بیٹھنا ہو گا۔ وہ کمرا اچھا، صاف ستھرا ہے۔ اسپتال میں کئی دھوبی ہیں، جتنی جلد ممکن ہو سکے گا، وہ کپڑے دھو دیں گے۔ بس یہی ہے کہ بارش نہ ہو اور کپڑے سوکھنے میں وقت نہ لگے۔"

"جو تم مناسب سمجھو، کپڑے تو تبدیل ہونے چاہییں۔ مجھے الجھن ہونے لگی ہے ان کپڑوں سے......"

اس نے سر سے پیر تک ایک طائرانہ نگاہ مجھ پر ڈالی۔ "ایسے میلے تو نہیں ہوئے ہیں ابھی۔ پھر ایک طریقہ اور بھی ہے۔ میں ابھی ٹھیر جاتی ہوں۔ ڈاکٹروں کے دورے کے بعد تم مریضوں والے کپڑے پہن لو، پھر یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں یہ کپڑے گھر جا کے دھو دوں گی۔ رات بھر میں سوکھ ہی جائیں گے۔ استری کر کے صبح جلد سے جلد یہاں آ جاؤں گی۔"

"ارے نہیں۔" مجھے ہنسی آ گئی۔ "تم کپڑے دھوؤ گی؟"

"کبھی کبھی اپنے بھی دھوتی ہوں۔"

"نہیں نہیں۔"

"میں سنجیدہ ہوں۔ مجھے خوشی ہو گی۔"

"اور مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگے گا؟"

"بس نہیں۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔

"اس میں کیا برائی ہے؟" وہ ناراض سی نظر آنے لگی۔ "تمہارا کام کر کے مجھے خوشی ہو گی۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ لیکن......" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انکار کے لیے کیا عذر پیش کروں۔

"ٹھیک ہے، تم اچھا نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے۔ پھر کوئی آدمی بھیج کے ہوٹل کے کسی کارندے کو یہاں بلا لو۔ وہ تم سے مل کے تسلی کر لے گا تو آسانی ہو جائیگی۔ بہ ہر حال، اب تو رات ہو چکی ہے، صبح ہی کچھ ممکن ہے۔ کل دیکھیں گے پھر، مگر کل کوئی انتظام نہ ہو سکا تو تمہیں وہی کرنا ہے جو میں اب کہہ رہی ہوں۔"

پہلے برابر والے کمرے تک جا کے اس نے دروازے پر ٹھوکا دیا۔ اندر سے ایمی کی آواز آئی۔ چند ثانیوں بعد وہ باہر آ گئی۔ اس جھنجھلاتے ہوئے سیورین کو بتایا کہ شانے پر اسپتال کی وردی کی سیون نکل گئی تھی۔ کمرے میں دوسرا لباس موجود نہیں تھا۔ اسپتال کے لباس خانے سے منگوانے میں دیر لگتی۔ اسے خود ہی سینا پڑا۔ ڈاکٹر رائے کی کہیں نظر پڑ جاتی تو قیامت آ جاتی۔ ایمی کو "شب بخیر" کہہ کے سیورین بوجھل قدموں سے میرے ساتھ چلتی رہی، پھر کچھ دور جا کے اس نے مجھے واپس ہو جانے کا اشارہ کیا اور دو چار قدم آگے جا کے لوٹ آئی۔ "صبح تمہارے...... لیے کچھ بنا کے لاؤں؟" وہ اشتیاق...... سے بولی، "زیادہ تو نہیں، ایک دو چیزیں جیسی تیسی بنانی آتی ہیں مجھے بھی۔"

"جو تم بہتر سمجھو لے آنا۔" میں نے اس کی دل بستگی کے لیے کہا۔ "مجھے یقین ہے، تم نفیس چیزیں ہی بناتی ہو گی کیوں کہ تم خود بہت نفیس، بہت اچھی ہو۔"

اس کے رخسار کچھ اور گلنار ہو گئے اور وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی راہداری سے دور ہو گئی۔

رات کے دورے پر ڈاکٹر رائے کے بجائے دو ڈاکٹر بٹھل کے معائنے کے لیے آئے اور اطمینان کا اظہار کر کے جلد ہی چلے گئے۔ ایمی کے کہنے پر ایک بار پھر مجھے کمرے سے باہر جانا پڑا۔ اب یہ معمول ہو چکا تھا۔ اس دوران یقیناً ایمی نے بٹھل کے لیے نرس کی ذمے داریاں نبھائی ہوں گی۔ میں کرسی ڈال کے دروازے کے باہر بیٹھا رہا۔

آسمان پر بادل بکھرے ہوئے تھے، ہلکے اور گاڑھے بادلوں کی ٹکڑیاں۔ ہوا نم تھی اور کسی قدر سردی سے آلودہ۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی میں انتظار کا اضطراب شدید ہو جاتا ہے اور میرے پاس انتظار کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ انتظار شاید سب سے بڑی مصروفیت اور سب سے بڑی اذیت ہے...... اور میں کیا...... ہر شخص ہر وقت کسی نہ کسی انتظار سے دوچار رہتا ہے۔ چھوٹے بڑے انتظار، کسی کے آنے، کسی کی بازیابی، کسی کے صحت مند ہو جانے کا انتظار، کل کا، پرسوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں کا انتظار...... بہ یک وقت کئی کئی انتظار زندگی کا بیش تر حصہ اسی انتظار کی نذر ہو جاتا ہے۔ زندگی مختصر ہوا کرتی تو انتظار کے مراحل بھی کم ہو جاتے۔

کچھ ایسی بے سر و پا سی باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں کہ ایمی نے مجھے اندر بلا لیا۔ وہ بٹھل کو ہلکی پھلکی غذائیں اور کڑوی کسیلی دوائیں کھلا اور پلا چکی تھی۔ ایمی کو باتیں کرنی خوب آتی تھیں۔ کہنے لگی "اک مریض بھگتا چکی ہوں، دوسرے سے

اب نمٹنا ہے اور یہ دوسرا بہت نٹ کھٹ ہے۔'' امی سراپا شفقت، سرتا پا تپاک تھی۔ چہرے مہرے سے تندخو، اندر رس گھلا، موم بھرا ہوا تھا۔

کمرے کے دروازے، کھڑکیوں کی چٹخنیاں اس نے چڑھا دی تھیں۔ پردے بھی گرا دیے تھے، صرف چھت سے ملحق روشن دانوں سے تازہ ہوا کی آمد ممکن رہی تھی۔ اسے خدشہ ہوگا کہ اس رات آنے والے حملہ آور دوبارہ کمرے میں نقب لگانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ اسے معلوم تھا کہ اب کسی مشکوک آدمی کا اسپتال میں داخلہ ناممکن ہے۔ اسپتال پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ رات گئے تک وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی، شہر کے حالات اور طرح طرح کی افواہوں کے بارے میں بتاتی رہی۔ مجھے سلانے کے لیے گزشتہ رات کی طرح وہ میرے سرہانے بیٹھ کے میرے بالوں میں اپنی مومی انگلیوں سے جیسے کنگھی پھیرتی رہی اور مجھے امی کی یاد دلاتی رہی۔ ممی بھی سر سہلانے اور دبانے میں بڑی ماہر تھی، اور نیساں! نیساں تو کمال کرتی ہے۔

امی مجھے ہمت اور حوصلے کی تعلیم دے رہی تھی اور خود باہر ذرا سی آہٹ پر چونک جاتی تھی۔ میں نے اسے سو جانے کا تاثر دیا، کچھ اس خیال سے بھی کہ وہ کمر ٹیک لے۔ جانے کس وقت وہ دبے قدموں میرے پاس سے اٹھی کہ مجھے احساس ہی نہ ہو سکا۔ شاید کسی وقت میری آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح سویرے اسپتال میں خاصی چہل پہل ہو جاتی تھی۔ سبزے کی کثرت کی وجہ سے پرندوں کی بہتات تھی۔ منہ اندھیرے وہ صبح کی آمد کی نوید سنا دیتے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر آیا تو آٹھ بج رہے تھے۔ امی نے چائے منگوالی تھی۔ ہم دونوں چائے پی رہے تھے کہ کھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ چائے ادھوری چھوڑ کے امی فوراً اٹھ گئی۔ باوردی سپاہی کی جھلک پر میں بھی بیٹھا نہ رہ سکا اور اندر دروازے کے پاس جا کے ٹھہر گیا۔

''کا ......کا بات ہے؟'' امی نے کڑکتی آواز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں مام۔'' سپاہی نے کتراتے لہجے میں میرے بارے میں تصدیق چاہی کہ رات کو میں کمرے ہی میں رہا ہوں۔

''ادھری اور کاں۔'' امی نے ترخ کے جواب دیا، ''تم، تم کیوں پوچھتا ہے؟''

''بس مام، ہم کو تا ہی پتا کرنا تھا۔''

''پر کیوں؟ ایسا کا بات ہے؟''

سپاہی نے سرگوشی میں امی کو کچھ بتایا۔ امی کی سسکاری نکل گئی۔ ''نہیں نہیں، کا بولتا ہے تم؟''

سپاہی زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ اس نے بھی اپنی آنکھوں سے مجھے کمرے میں دیکھ کے اطمینان کر لیا تھا۔ امی بڑبڑاتی ہوئی میرے پاس آئی اور ہولتی آواز میں بتانے لگی کہ صبح جس وقت لوگ نماز کے لیے گھر سے نکلے، انہوں نے اس باغیچے میں، اس جگہ جہاں کل اکبر علی خاں کی لاش دیکھی تھی، تین لاشیں پڑی ہوئی دیکھی ہیں۔ سپاہی کو پولیس کے صدر دفتر کے حکم پر رات اسپتال میں میری موجودی کی تصدیق کے لیے بھیجا گیا تھا۔

میرا جسم ایک لمحے کے لیے سن ہو گیا۔

''یہ کیا ہوا میرے بچے؟'' امی کی آواز سنسنا رہی تھی۔

میں کیا جواب دیتا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' وہ سراسیمگی سے بولی۔

''کیا کہا جا سکتا ہے۔'' میں نے بہ مشکل کہا، ''سپاہی اور کیا بتا رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اور کچھ نہیں، بس یہی کچھ......''

امی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ میرا حال بھی کچھ اسی جیسا تھا۔ امی سوال پر سوال کیے جا رہی تھی جیسے میں وہاں موجود رہا تھا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے اسے جھڑک دیا اور دوسرے ہی لمحے مجھے

ندامت ہوئی۔ میں نے اپنے لہجے پر معذرت چاہی۔

''نا نا، ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں کیا معلوم۔ میں ہی پاگل ہو رہی ہوں۔'' وہ مہربان عورت فراخ دلی سے بولی۔ ''میں باہر جا کے سن گن لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ ہو سکتا ہے، خبر ہی غلط ہو۔'' امی بہت ہراساں نظر آتی تھی۔

جتنی دیر وہ باہر رہی، میں تانے بانے ملانے کی تگ و دو کرتا رہا۔ امی چند منٹ بعد مایوس واپس آ گئی۔ وہ بار بار دہائیاں دینے کے انداز میں ہاتھ پھیلاتی اور سینے پر صلیب کا نشان بناتی رہی۔ میں نے بھی کئی مرتبہ باہر نکل کے دیکھا۔ اسپتال کے عام ملازموں کے سوا مجھے کوئی ایسا آدمی دکھائی نہیں دیا جس سے کچھ معلوم کیا جا سکتا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے ڈاکٹر رائے کمرے میں داخل ہوا۔ میری توقع کے مطابق وہ بہت منتشر لگ رہا تھا۔ اپنے ساتھی ڈاکٹر کو بٹھل کے بستر کی طرف جانے کا اشارہ کر کے وہ سیدھا میرے پاس آیا۔

''تم نے کچھ سنا؟'' اس نے سلگتی آواز میں پوچھا۔

''ہاں، کچھ سنا ہے امی کی زبانی۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ اس دوران میں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا تھا۔

''کیا......کیا سنا ہے؟''

میں نے اسے صبح آٹھ بجے کے قریب آنے والے سپاہی کے بارے میں بتایا۔

''ٹھیک ہے، تم سے بات ہوتی ہے ابھی۔'' یہ کہہ کے وہ بٹھل کے پاس چلا گیا۔ کشاکش کی اس حالت میں بھی اسے اپنے کام سے علاقہ تھا۔ لوگ صحیح کہتے ہیں، عہدہ و منصب، علم و فضل اور مال و زر اپنی جگہ، آدمی کی عزت و مرتبت تو اس کی انسان دوستی اور فرض شناسی سے طے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رائے کی ہدایت سے پہلے میں خود ہی باہر چلا گیا۔ مجھے جاتا دیکھ کے اس نے بلند آواز میں مخاطب کیا، ''دور کہیں مت جانا۔''

میں دور کہاں جاتا، وہیں دروازے کے پاس دربان بنا بیٹھا رہا۔ اچھا ہوا جو مجھے اس کے ممکنہ سوالوں کی جواب دہی کے لیے خود کو استوار کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے بٹھل کے معائنے میں اپنا وقت لیا۔ وہ باہر آیا تو معاون ڈاکٹر ساتھ نہیں تھا۔ اس کی پے روی میں راہ داری سے گزر کے مرکزی عمارت تک چلا آیا۔ تیز قدموں سے وہ ایک بڑے آراستہ و پیراستہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ دروازے پر اس کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ جب تک وہ کرسی پر بیٹھ نہیں گیا اور مجھے اس نے بیٹھ جانے کی اجازت نہیں دی، میں کھڑا رہا۔ جگ سے گلاس بھر پانی بھر کے اور ایک گھونٹ لے کے اس نے معتدل لہجے میں پوچھا، ''تم کیا سمجھتے ہو؟''

''آپ کیا سمجھتے ہیں؟'' میرے لیے شاید یہی مناسب تھا کہ اپنی رائے کے اظہار میں محتاط رہوں۔

''میں......میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا ہوں، لیکن ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ ٹھیک اسی مقام پر لاشیں پھنکوانے والے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اکبر علی خاں کے قاتل ختم کر دیے ہیں۔''

''جی، یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے۔'' میں نے دھیمی آواز میں تائید کی۔

''تم بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہو؟'' وہ بے تابی سے بولا۔

''لیکن کیا اکبر علی خاں کے قاتل وہی تھے؟''

''یہ دوسری بات ہے۔'' وہ رکھائی سے بولا، ''میں نے صرف یہ کہا کہ کوئی کچھ باور کرانا چاہتا ہے۔''

''یعنی اکبر علی خاں کے قاتل دوسرے تھے اور ان قاتلوں کو انجام تک پہنچانے والے دوسرے۔ وہ جانتے تھے کہ قاتل کون لوگ ہیں۔ جس معاملے کی تفتیش میں پولیس بری طرح سر کھپا رہی ہے۔ باور

کرانے والے لوگ اس کی حقیقت سے آشنا تھے۔''
''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔
میں نے تمام لحاظ و مروت سے کہا۔ ''دونوں کے درمیان کوئی تعلق ضرور تھا۔''
''یعنی دونوں ایک ہیں؟'' ڈاکٹر نے حیرانی ظاہر کی۔
''دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں۔'' میں نے کہا۔
ڈاکٹر کے ہونٹ باہر نکل آئے۔ ''تمہارا قیاس درست معلوم ہوتا ہے۔'' وہ سر ہلا کے بولا۔
''اور آپ نے غور کیا، وہ کسے یہ باور کرانا چاہتے ہیں؟''
''ہاں۔'' اس نے تذبذب سے دہرایا۔ ''وہ کسے یہ باور کرانا چاہتے ہیں، اکبر علی خاں کے گھر والوں کو کہ وہ بری طرح متاثر ہوئے ہیں، شہر والوں کو کہ وہ شدید خوف و ہراس میں مبتلا ہیں۔ وکیلوں کی انجمن کو، جو کل سے واویلا کر رہی ہے، انہوں نے کل عدالت میں کام بھی بند کر دیا تھا۔ لا کالج کے ان طلبہ کو، جو اپنے بہترین استاد سے محروم ہو گئے ہیں۔ کل دن بھر وہ مظاہرے کرتے رہے۔ ان کا مطالبہ ہے جب تک قاتل پکڑے نہیں جائیں گے، وہ کلاسوں میں واپس نہیں آئیں گے۔ اور پولیس کو کہ وہ سخت بوکھلائی ہوئی ہے، جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے اور کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے؟''
''اور کیا اب ان تین آدمیوں کے خون سے اکبر علی خاں کے دکھ کا ازالہ ہو جائے گا؟ شہری، وکیل، طلبہ سکون کا سانس لیں گے اور پولیس کو کوئی سراغ مل جائے گا؟''
ڈاکٹر رائے کچھ سوچتا رہا، پھر مضطرب ہو کے بولا، ''لگتا ہے، تم کچھ جانتے ہو؟''
''ہاں شاید۔'' میں نے تامل سے اقرار کیا۔
''میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔''
''آپ نے توجہ نہیں دی، حالاں کہ آپ ڈاکٹری کے علاوہ زندگی کے دیگر معاملات میں بھی اتنے ہی شامل ہیں۔ دیدہ ریزی، نکتہ بینی میں طاق۔ مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔'' میرا مقصد مطلق اس کی خوشامد نہیں تھا۔ یہ تو اظہار واقعہ تھا، لیکن میرے اعتراف میں تملق کا پہلو بہر حال نکلتا تھا۔
شکر ہے اس نے میری نیت پہ شبہ نہیں کیا اور وہی ہوا۔ اس جہاں شناس، دور اندیش نے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''ٹھیرو!'' وہ ہاتھ اٹھا کے بولا، ''تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ وہ صرف تمہیں باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہی نا؟''
پھر مجھے ناگفتنی کی تشریح کی ضرورت نہ رہی۔ اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ میدا اور اس کے خاص مقرب ہی اتنا خونی، اتنا منظم اور بڑا قدم اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے ان تین آدمیوں کو بھینٹ چڑھا دیا، جو اصل میں انہی کے اڈے سے وابستہ تھے اور دھنوا سے زیادہ قرب رکھتے تھے۔
اس رات جب مسلح حملہ آور میری جستجو میں اسپتال آئے تھے تو میں نے صبح اکبر علی خاں سے کہا تھا کہ وہ میدا کی حمایت یافتہ آدمی نہیں ہونے چاہئیں، وہ میدا سے برگشتہ دھنوا کے ہم نفس، ہم جاں ہی ہو سکتے ہیں۔ انہیں بہت قلق ہوگا کہ اڈے پر آ جانے کے باوجود میدا نے اتنی آسانی سے مجھے جانے کیوں دیا۔ گو میدا نے اڈے کے استاد کی حیثیت سے دھنوا کے زخمی ہو جانے کی اطلاع پر اپنی ذمے داری اچھی طرح نبھائی تھی۔ اس نے میرے لیے سارے راستے بند کر دیے تھے۔ وہ تو خود میں نے اس کے اڈے پہنچ کے، دانستہ اس کے بے شمار آدمیوں کے نرغے میں جا کے توقع کے خلاف اڈے کی چوکی کا دعوا کر دیا۔ پھر تو بات ہی دوسری ہو گئی تھی۔ میدا کو اپنی عمل داری سے دست بردار ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔

میدا کے پختہ کار ساتھی میں نے دیکھے تھے۔ میرا قصہ پاک کردینے کے لیے وہ مسلح آدمی اسپتال بھیجنے کا نامعقول مشورہ نہیں دے سکتے تھے۔ اگرچہ میدا کی عین خواہش یہی ہوگی' میدا کا عندیہ لیے بغیر اسپتال آنے والے حملہ آور کام یاب ہوجاتے تو میدا انہیں پلکوں پر بٹھاتا لیکن وہ ناکام ہوگئے تھے اور ان کے ہاتھوں اسپتال کے ایک ملازم کا خون ہوجانے سے معاملہ اور سنگین ہوگیا تھا۔ میدا کے اڈے پر میرے جانے کی ساری روداد پولیس کے علم میں ہوگی۔ پولیس کے مخبر بھی اڈوں پر موجود ہوتے ہیں۔

پہلی بار شہر کے سب سے بڑے اسپتال میں ڈاکوؤں کی طرح کچھ لوگ گھس آئے تھے۔ اسپتال ڈاکا ڈالنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ ایک ذرا سی عرق ریزی سے پولیس کو اسپتال میں موجود اس شخص تک پہنچ جانا چاہیے تھا جو میدا سے مبارزت کے لیے اس کے اڈے گیا تھا اور مبارزت ملتوی ہوگئی تھی۔ سو مراسم کی مروت اپنی جگہ، پولیس نے سب سے پہلے میدا کے اڈے کی راہ لی ہوگی اور میدا نے صاف انکار کردیا ہوگا۔ میدا کو گرفت میں لینے کے لیے پولیس کے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں تھا اور میدا ان سے دور ہی کتنا تھا، ارادے کی دوری پر۔ کسی وقت بھی اس کے سر پہ آدھمک سکتے تھے۔

امکان یہی ہے کہ پولیس کے تیور دیکھنے کے بعد میدا نے دھنوا کے ماتم گساروں کو سرزنش کی ہوگی۔ ہوسکتا ہے انہیں اڈے سے خارج کردیا ہو یا کسی بڑے عتاب کی دھمکی دی ہو۔ پہلی ناکامی سے دھنوا کے دل برداشتہ ساتھی ادھر میدا کی سردمہری، اس کے غیظ وغضب، اُدھر دھنوا کی جدائی کے صدمے سے ایسے بے حال، ایسے اندھے ہوئے کہ انہوں نے سارا قہر اکبر علی خاں، ایک بے قصور پر اتار کے دھنوا کے قرض کا بوجھ کسی طور کچھ کم کیا اور مجھے موت سے بڑی سزا سے دوچار کیا۔ وہ اپنے مقصد میں کسی حد تک ضرور کام یاب ہوئے۔

ڈاکٹر رائے وقفے وقفے سے گھونٹ بھر پانی پیتا رہا اور چپ رہا۔ کل صبح اکبر علی خاں کی خبر سننے کے بعد جب وہ مجھے کسی ساتھی ڈاکٹر کے کمرے میں لے گیا تھا، میں نے بہ وجوہ اس سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں رکھا تھا۔ وہ سارا کچھ اس کے ذہن میں تازہ ہوگا جو اسے مزید کسی صراحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ "مگر یہ خود میدا کے لیے کوئی بہت محفوظ اور مفید فیصلہ نہیں لگتا۔" ڈاکٹر نے بھن بھناتی آواز میں کہا۔

"میدا کو مختلف ذریعوں سے معلوم ہوتا رہا ہوگا کہ میں اپنا چاقو واپس لینے کے لیے اس کے اڈے پر آنے کا مصمم ارادہ کیے ہوئے ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا، اسی شام دو پولیس افسر یہاں اسپتال میں میرے پاس آئے تھے۔"

"ہاں، ہاں یاد ہے۔" ڈاکٹر نے شکایتی لہجے میں کہا" اور میرے استفسار پر تم نے کچھ بات بنادی تھی یا یوں کہو کہ ٹہلا دیا تھا۔"

"مجھے یہی کرنا چاہیے تھا، اس لیے کہ آپ اس وقت اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔"

میرا عذر اس نے تسلیم کیا کیوں کہ وہ ایک متوازن آدمی تھا۔ "تم کیا کہہ رہے تھے!" اس نے بے صبری سے مجھے ٹوکا۔

"اس شام آنے والے پولیس افسروں نے میری جرأت کی بڑی داد دی تھی۔ انہوں نے میدا کے لیے اپنی نفرت کا اظہار کیا اور مغلظات سنائیں۔ کہہ رہے تھے کہ پہلی مرتبہ کوئی رستم سہراب میدا کے سامنے آیا ہے۔ انہوں نے درپردہ مجھے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ اس تعاون کے بدل میں رشوت طلبی کا ایک اشارہ واضح تھا۔ وہ مایوس نہیں لوٹے میں نے انہیں......"

"تم نے انہیں رشوت دی؟" میری بات پوری ہونے سے پہلے اس کا لہجہ اکھڑ گیا۔

"میں نے کنایتاً اپنی آسودگی اور کشادہ دلی کا گداز دیا۔"

"تم نے انہیں کوئی نقدی وغیرہ تو نہیں دی؟"

"نقدی دینے سے مراد ہوتی کہ میدا کہ اڈے پر جاکے میں نے بے اساس دعوے کیے ہیں، لیکن پہلے اگر کوئی شبہ تھا تو اب کچھ یقین ہونے لگا ہے، وہ پولیس والے میدا ہی کے فرستادہ نہ ہوں۔ میدا نے انہیں میرے ارادے کی تخمینگی کے لیے بھیجا ہو۔ مبارزت ملتوی کرنے کی تجویز میری نہیں تھی، میدا کے ایک عمر رسیدہ ساتھی کی تجویز تھی یہ......اور میدا نے بہ ظاہر بہ اکراہ اسے قبول کیا تھا۔ بہ حقیقت میدا کے دل پر نقش ہوگی کہ وہ میری تجویز نہیں تھی۔ جو شخص اسی وقت چاقو آزمائی کرنے اور اِدھر یا اُدھر فیصلہ ہوجانے پر تل گیا ہو، اس کا سحر و اثر میدا اور اس کے ساتھیوں کے حواس و اعصاب پر بری طرح طاری ہونا چاہیے۔ مبارزت ٹل جانے اور اڈے سے میرے جانے کے بعد میری حرکات اور عزائم کا بھی مسلسل جائزہ لیتے رہنا ان کے لیے ضروری ہوگیا تھا۔ میدا مجھ سے مبارزت کے لیے قطعاً آمادہ نہیں تھا کہ اسے اپنا نوشتہ صاف نظر آرہا ہوگا۔ مبارزت کے التوا کی اس مدت میں اسے میرے لیے تپاک اور فراخ دلی کی ارزانی کرنی چاہیے تھی۔ کچھ اسی طرح مبارزت کے لیے میرے عزائم میں نرمی آسکتی تھی، مگر دھنوا کے جفاکار فدائیوں نے سب کچھ درہم برہم کردیا۔ اب ان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ آگے وہ کیسی کیسی وحشتوں اور شورشوں کے مرتکب ہوں۔ ابھی پہلے سانحے کی تفتیش شروع ہوئی تھی کہ ایک اور سانحہ ہوگیا۔ انھونی کی موت اتفاق تھی کہ وہ ناکام لوٹ جانے والوں کے آڑے آگیا تھا۔ پولیس کے لیے یہ اتنا گمبھیر معاملہ نہیں تھا لیکن اکبر علی خاں......وہ کئی حیثیتوں سے ایک ممتاز آدمی تھے۔ ان کے خون کے بعد تو میدا کے اڈے سے پرانی رسم وراہ کی پاس داری اب پولیس کے بس میں نہیں رہی تھی۔"

ڈاکٹر رائے نے خاموشی شعار کی۔ مجھے گمان ہوا، کہیں میرے قیاس اور اندازے ہذیان کی شکل تو اختیار نہیں کررہے۔ مخاطب کی خاموشی بھی بہت ہلکان کرتی ہے۔ خصوصاً ایسے وقت جب کوئی اپنی عرض گزاری میں اس قدر شامل ہو۔ میں نے بے کلی سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

اسے بھی احساس ہوا اور اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا، "تم چپ کیوں ہوگئے؟"

"مجھے گمان ہوا، آپ کہیں اور ہیں۔" میں نے صاف گوئی اختیار کی۔

"نہیں نہیں، میں توجہ سے سن رہا ہوں۔ تم کیسی منطقی باتیں کررہے ہو، سب کچھ آئینہ کردیا ہے تم نے۔"

مجھے اپنی بات جاری رکھنے میں مشکل پیش آئی۔ میں نے جھجک کے کہا، "میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اڈے کی چوکی وراثت میں نہیں ملتی۔ استاد اپنی طاقت کے بل پر چوکی کے منصب کا سزاوار ہوتا ہے اور اس وقت تک اس منصب پر قائم رہتا ہے جب تک اس میں کس بل ہے اور وہ اپنے آدمیوں کی حفاظت کرنے کے قابل ہے۔ وہ مطلق العنان نہیں ہوتا، اڈے کی روایتوں پر عمل پیرا رہتا ہے۔ دھنوا کے سرکش ساتھیوں نے میدا کو کہیں کا نہ چھوڑا تھا، بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا انہوں نے اڈے کے استاد کو۔ استاد کی ساکھ پر ضرب پڑ رہی تھی۔ اس طرف پولیس نے اس کا ناطقہ بند کر رکھا ہوگا، دوسری طرف، اکبر علی خاں کی ہلاکت پر میرے اشتعال، غم اور غصے کا شدت سے احساس ہوگا اسے۔ اس نازک موقع پر اس کے بہی خواہ نائبین نے ایک ہی مشورہ دیا ہوگا کہ بعد کو کسی بدتر صورت حال کا سامنا کرنے سے بہتر ہے کہ پیش بندی کرلی جائے۔ سردست تو مجھے یہ باور کرانا لازم ہے کہ اکبر علی خاں کے خون میں میدا کا کوئی ہاتھ نہیں ہے،

جن کا ہاتھ تھا، ان کی سرکوبی کردی گئی ہے۔ اس طرح میدا نے میری خوش نودی کے علاوہ پولیس کو منتشر کرنے، معاملات پیچیدہ کرنے کی بھی کوشش کی اور دھنوا کے ساتھیوں کی بے دردی و بے داد گری پر بھی بند باندھ دیا۔"

ڈاکٹر تادیر گم بیٹھا رہا اور یکا یک اس کے جسم میں لہر سی اٹھی۔ "پھر اب ......اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"ہم کیا کرسکتے ہیں؟" میں نے پھیکی آواز میں کہا۔

"ہمیں پولیس سے بات کرنی چاہیے۔"

"میری طرف سے پولیس نے بے شک اطمینان کرلیا ہے کہ میں مستقل اسپتال میں ہوں۔ پولیس کی نظریں ایک ہی سمت جاتی ہوں گی، لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں، میدا کو اس کا اندازہ نہیں ہوگا کہ پولیس اس کے ٹھکانے کا راستہ پکڑے گی اور اسے اس دشوار گزار مرحلے سے نمٹنا ہوگا۔ میدا نے سارا کام نہایت سلیقے سے کیا ہوگا۔ ایسے کام خود نہیں کیے جاتے ڈاکٹر صاحب! اردگرد اور دور دور کے دوستوں سے اعانت کی درخواست کی جاتی ہے، مال و زر اٹھا کے، کچھ نادیدہ لوگوں سے بھی۔ میدا نے گزشتہ رات، ممکن ہے مجرے کی کسی محفل میں گزاری ہو یا اپنے ہی اڈے پر تمام ساتھیوں کے ساتھ کوئی محفل برپا کی ہو۔ قمار بازی کی بزم آرائی کا ڈھونگ رچایا ہو۔ چشم دید گواہان پولیس کو یہ یقین دلانے کے لیے موجود ہوں گے کہ میدا بہ تمام و کمال ان کے درمیان جانِ محفل تھا۔"

"تو ہم تماشا دیکھتے رہیں؟" ڈاکٹر درشتی سے بولا۔

"ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے۔"

"گویا ہم......" وہ زچ سا ہو کے رہ گیا۔

"ابھی یہیں بات کہاں ختم ہوئی ہے۔"

"کیا......اب کیا؟" اس نے جھلا کے پوچھا۔

"میرا خیال ہے، آج یا کل میدا یا اس کے قریب ترین معتمد کو یہاں آنا چاہیے۔"

ڈاکٹر رائے ایک لحظے کے لیے بدحواس ہوا۔

"کیا۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میں صرف امکان کی بات کررہا ہوں۔"

"مگر میدا یہاں کیوں آئے گا؟" ڈاکٹر نے میرا قیاس مبالغے پر معمول کیا۔ اس کے چہرے کی شکنیں گہری ہوگئیں۔

"پہلے ایک راستہ صاف کرنا چاہیے اسے۔ بعد کو اور راستے اور منزلیں اتنی کٹھن نہیں ہوں گی۔"

"تمہارے لہجے کے تیقن پر مجھے حیرت ہے۔ اگر تم جیسا کہہ رہے ہو تو میں...... میں اس منظر پر موجود رہنا چاہوں گا۔"

"آپ کے لیے مناسب نہیں ہوگا، گو میری خواہش بھی یہی ہے۔"

"نہیں، تم مجھے مطلع کرو گے۔" اس نے حتمی اور حکمیہ لہجے میں کہا، "میں جہاں کہیں بھی ہوں۔"

"آپ کو تیار رہنا ہوگا، کسی وقت کے لیے بھی آپ ہی نے یہ ساری صورت حال بدلی ہے۔"

"میں نے؟" ڈاکٹر کی آواز پھڑ پھڑا کے رہ گئی۔

"ڈاکٹر صاحب! کل پولیس کی آمد پر آپ دخل اندازی نہ کرتے اور پولیس مجھے ساتھ لے جاتی تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ میدا کو پھر اتنی عجلت پیش نہیں آتی۔ ان تین آدمیوں کو شاید کچھ دن اور زندگی مل جاتی۔ بہت کچھ اس پر منحصر تھا کہ پولیس کتنے دن مجھے روکے رکھتی ہے اور مجھ سے کس طرح کا سلوک کرتی ہے۔"

ڈاکٹر رائے نے گہری سانس بھری۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر منڈلاتی رہیں۔ چند لمحوں وہ بعد کرسی سے اٹھ گیا۔

سیورین آچکی تھی لیکن امی موجود تھی۔ "میں تمہارا انتظار کررہی تھی۔ سب ٹھیک تو ہے میرے

بیٹے؟" امی ہاتھ پھیلا کے میری جانب لپکی اور مجھے سینے سے لگالیا۔

"سب ٹھیک ہی ہے۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"ڈاکٹر رائے تمہیں ساتھ لے گئے تھے؟"

"انہی کی حاضری میں تھا۔"

"پولیس تو نہیں آئی تھی؟" وہ پریشانی سے بولی، "کوئی نئی خبر......؟"

"ابھی تو دن پڑا ہے۔" میں نے زہرخند سے کہا۔

"خداوند سب ٹھیک کرے۔" امی بلکتے لہجے میں بولی، "سیورین آچکی تھی مگر مجھے تمہاری فکر لگی ہوئی تھی اس لیے رکی رہی...... اچھا چھوڑو، دیکھو! یہ سیورین تمہارے لیے کیسا خوب صورت ناشتا لے کے آئی ہے۔"

سیورین پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے ڈیوٹی والا لباس پہن لیا تھا۔ کچھ بھی کھانے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، لیکن انکار کا محل نہیں تھا۔ سیورین نے انگریزی طرز کا ناشتا بنایا تھا۔ خشک میوے کے ریزوں سے ڈھکا ہوا انڈے کا حلوا، انڈوں کی آمیزش سے بنے ہوئے نمکین ٹوسٹ۔ چپاتی جیسے پتلے پتلے پراٹھے۔ آلو، مٹر اور گاجر کی سبزی، ان کی اصل رنگت پکانے سے تبدیل نہیں ہوئی تھی اور تازہ کچی سبزیوں سے بھری تشتری اور پھلوں کا رس۔

"یہ ناشتا ہے؟" میں نے کہا، "اور یہ سارا تم نے بنایا ہے؟"

"نہیں، آنٹی بھی ساتھ تھی۔" سیورین کے لہجے میں حسرت نمایاں تھی کہ میں اس کی تعریف کروں۔ ناشتا واقعی بہت لطیف اور خوش ذائقہ تھا۔ کچھ سیورین کی دل دہی عزیز تھی، کچھ ناشتے کی اپنی خوبی، انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ امی نے اپنے ہاتھ سے چمچا بھر حلوا بڑی شفقت سے میری جانب بڑھایا۔ میں نے اسی اشتیاق اور احترام سے منہ میں رکھا جس کی اسے توقع تھی۔ یہ عورتیں کیسی دل نواز تھیں۔ میرا دل بھر آیا۔ میری ان کی شناسائی کو وقت ہی کتنا ہوا تھا۔ لطف و عنایت کی اس فراوانی پر آدمی خود کو کیسا بے بس سا محسوس کرتا ہے کہ وہ نہ تو اس کا مستوجب ہے، نہ اسے یہ زیر باری اتارنے کی استطاعت ہے، اور جو مسافر ہو، جسے اس جگہ ٹھیرنا ہی نہ ہو۔ میں ان کے لیے کیسا عارضی رفیق تھا۔ آج نہیں تو کل مجھے چلے جانا ہے اور شاید لوٹ کے کبھی آنا بھی نہ ہو۔

میری پیشانی چوم کے امی رخصت ہوگئی۔ سیورین کو تین آدمیوں کے قتل کی خبر مل چکی تھی۔ وہ مجھ سے ڈاکٹر رائے کے انداز میں باز پرس کرتی رہی اور میں اس کی ہیبت، اس کا غبار دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ڈاکٹر رائے کی اطلاع کے مطابق آج اکبر علی خاں کی تدفین ہوجانی تھی۔ حیدرآباد سے پٹنے کا فاصلہ کم نہیں ہے۔ شام تک کہیں ان کا بڑا بھائی پہنچ پائے گا۔ کیا ظرفگی تھی کہ میں آخری مرتبہ اپنے محسن، اپنے مجی کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں ان کے جنازے کو کندھا دینے کی توفیق نہیں رکھتا تھا۔ اکبر علی خاں کا خیال آتے ہی ان کا سارا گھر سامنے آجاتا تھا اور جیسے میرا وجود زمین میں دھنسنے لگتا تھا۔

دوپہر کے دورے پر ڈاکٹر رائے تین چار ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ بٹھل کو دیکھنے آگیا تھا۔ اس وقت بٹھل کی حالت خاصی بہتر نظر آرہی تھی۔ انہوں نے اسے بٹھا دیا اور اتنے دنوں بعد بستر سے اٹھا کے کمرے کے فرش پر قدم رکھوانے چاہے۔ وہ بہت احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ بٹھل کا جسم ایک لمحے کے لیے ڈگمگایا مگر پھر اس نے مضبوطی سے قدم زمین پر جمالیے۔ دو نوجوان ڈاکٹر اسے کاندھوں سے پکڑے ہوئے تھے۔ چند قدم چلانے کے بعد ڈاکٹر رائے نے پوچھا کہ اس کا سر بھاری تو نہیں ہورہا یا اس کے سر میں دھمک تو

نہیں ہو رہی۔ بٹھل کے انکار پر اس نے چٹکی بجا کے خوشی کا اظہار کیا۔ سوفے تک ڈاکٹر، بٹھل کو لے آئے اور واپس چلا کے انہوں نے دوبارہ اسے بستر پر بٹھا دیا۔ انہوں نے بٹھل سے بہت کم بات کی اور لگتا تھا بٹھل خود بھی زیادہ بات کرنے سے گریزاں ہے۔ وہ کچھ مدہوش سا لگ رہا تھا۔ میں تو ایک کونے میں گنگ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا، ڈاکٹر رائے نے بٹھل سے نمٹ کے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں اچھل پڑا۔ وہ مسکرانے لگا۔ میں نے بے اختیار اس کے ہاتھ تھام کے آنکھوں سے لگا لیے۔ میرے آنسوؤں سے اس کے ہاتھ بھیگ گئے۔ وہ مجھے تھپکتا رہا، پھر اس نے مجھے پہلو میں بھینچ لیا۔ میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ لفظ ہی کھو گئے تھے۔ مجھے چھوڑ کے وہ اپنے ساتھی ڈاکٹروں اور نرسوں کے ہم راہ باہر نکل گیا۔

چار بج چکے تھے۔ میں پاؤں پھیلائے سوفے پر نیم جان سا، بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ سیورین کہیں باہر تھی، گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ اسپتال کی مرکزی عمارت سے آنے والا ایک کارندہ چند مہمانوں کی اطلاع دینے آیا ہے اور میری اجازت کے لیے باہر کھڑا ہے۔

میں خود ہی اٹھ کے دروازے پر چلا گیا۔ اسپتال کی وردی میں وہ ایک پختہ عمر آدمی تھا۔ اسی لمحے خیال آیا، کلکتے سے کوئی نہ آ گیا ہو۔ جمرو، جامو، زورا کا نام لینے پر اس نے انکار میں گردن ہلا دی اور کہنے لگا، "آنے والے مہمان لوگ میں سے ایک ہی سجن نے اپنا نام بتایا ہے اور ان کا نام میدا صاحب ہے۔"

"میدا......؟" میرے منہ میں جیسے ریت بھر گئی۔

"ایہی نام بولت ہیں صاب۔ ساتھ میں دو اور لوگ بھی ہیں۔" کارندے نے مؤدبانہ کہا۔

مجھے اس سے کچھ کہنے میں دیر لگی۔ میدا کے نام پر سیورین کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور اس نے میرا بازو زور سے دبوچ لیا تھا۔ کارندہ جواب کے انتظار میں تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور تھمی ہوئی آواز میں اسے ہدایت کی کہ ڈاکٹر رائے جہاں کہیں بھی ہوں، انہیں یہاں آنے کے لیے کہا جائے اور میدا کو اس وقت تک مرکزی عمارت میں روکے رکھا جائے جب تک ڈاکٹر رائے میرے پاس نہ پہنچ جائیں۔ میں نے سیورین کو کمرے کے آگے کے سبزہ زار میں کرسیاں لگوانے کی تاکید کی۔

"وہ......وہ کیوں آیا ہے؟" کارندہ ابھی قریب ہی تھا کہ سیورین بلبلاتی آواز میں بولی۔

"اسے آنا تھا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"اسے آنا تھا، مگر کیوں؟"

"یہی ایک راستہ رہ گیا تھا اس کے پاس۔"

"کیا مطلب؟"

"سارے سوال اس وقت نہ کرو تو بہتر ہے۔"

"تمہیں اس سے نہیں ملنا چاہیے۔"

"وہ ملے بغیر نہیں جائے گا۔"

"مگر وہ......وہ کیوں آیا ہے۔ اب کیا رہ گیا ہے کچھ کہنے سننے کو۔"

"دیکھتے ہیں۔" اس کے سکون کے لیے میں نے بہ ظاہر بے پروائی سے کہا، "یہ تو اس سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہوگا، لیکن تمہیں...... تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے؟ تم ایک حوصلہ مند لڑکی ہو، تم پر اس قدر دہشت کیوں چھائی ہے؟"

"معلوم نہیں، مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔"

میں نے اسے مصروف رکھنے کے لیے کسی آدمی کو بلا کے سبزہ زار پر کرسیاں لگوانے کا کام یاد دلا دیا۔ وہ بولائی ہوئی بہ عجلت راہ داری میں ایک طرف مڑ گئی۔ کمرے میں جا کے میں نے ایک نظر بٹھل کو دیکھا پھر اپنے آپ کو۔ ناشتے کے دوران سیورین نے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا تھا کہ کیا میں دو تین گھنٹے کے لیے مریضوں کا لباس پہن کے ملحق کمرے میں بند ہو جانے کو تیار ہوں۔ میں نے منع کر دیا تھا۔ کپڑے شکستہ ہو گئے تھے، لیکن ایسے میلے نہیں ہوئے تھے اور میدا کے سامنے تو کسی بھی لباس میں جایا جا سکتا تھا۔

دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا کہ ڈاکٹر رائے آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھری ہوئی تھی اور وہ نوجوانوں کی طرح سرگرم لگ رہا تھا۔ "وہ آ گئے ہیں؟" اس کی آواز تمتما رہی تھی۔ "تم ان سے میرا تعارف نہ کرانا۔"

"وہ آپ کو جانتے نہیں ہوں گے کیا۔ شہر میں آپ کو کون نہیں جانتا۔"

"ضروری نہیں۔ جاننا اور چیز ہے، پہچاننا اور۔"

ادھر سیورین نے آ کے سبزہ زار میں کرسیاں لگ جانے کی اطلاع دی، ادھر اسپتال کا ملازم میدا کے پہنچ جانے کی خبر دینے آیا۔ ڈاکٹر اور میں نے ایک دوسرے کو فکر مندانہ نگاہوں سے دیکھا، دوسرے لمحے ہم باہر آ گئے۔

وہ تین تھے، ایک وہی معمر آدمی، جس کا نام شاید برجو تھا، درمیان میں دوسرا میدا، اور تیسرا ابھی عمر میں خاصا پختہ تھا۔ میں نے اسے اڈے کی چوکی پر میدا کے قریب دیکھا تھا۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے، ہمیں آتا دیکھ کے کھڑے ہو گئے۔ تینوں کے چہروں پر سنجیدگی کا غلبہ تھا۔ راہ داری سے چند قدم چل کے ایک فاصلے پر ہم ان کے سامنے رک گئے۔ انہوں نے سلام کے لیے سرسری انداز میں ہاتھ اٹھا کے چھوڑ دیے۔ ہم نے بیٹھ جانے کو نہیں کہا۔ انہوں نے ہماری اجازت ضروری نہیں سمجھی۔ ہمیں بیٹھتا دیکھ کے کرسیاں سنبھال لیں۔ چند لمحے سنسناتی خاموشی رہی۔ شاید ڈاکٹر رائے کی موجودگی انہیں کھٹک رہی تھی۔ ان کی آسانی کے لیے میں نے ہی پہل کی۔ "کیا بات ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میدا نے عمر رسیدہ برجو پر نظر کی۔ برجو کی آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ کلبلاتے ہوئے اس نے زبان کھولی، "ہم کو تمرے سے جروری بات کرنی ہے۔"

"اب کیا بات کرنی ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہم کو پتا ہے، ہمرے بولن کے واسطے کچھ ناہیں ہے۔ ہم کو جیادہ بات بھی ناہیں کرنی۔"

میرے نتھنے پھول گئے۔ "بولو پھر!"

"ہم تمرا چاکو لوٹاوے کو آئے ہیں۔" میدا سمٹی ہوئی آواز میں بولا۔

یہ کہتے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے چاقو نکال لیا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ دوسرے لمحے وہ میری جانب اچھال دے گا۔ اپنے ذہنی خلجان میں اس کا ہاتھ اوچھا اٹھ گیا تھا۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ بلند کیا، مجھے اس کی کوتاہی کا احساس ہوا۔ میں کرسی پر بیٹھا رہتا تو چاقو ڈاکٹر رائے کے دائیں جانب فرش پر گرتا اور کوئی ایسی ندامت کی بات نہ ہوتی۔ کرسی پر نیم ایستادہ ہو کے اور ہاتھ بڑھا کے چاقو اچکنے کا عمل مجھ سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوا۔ میرا چاقو اب بہ ہر حال میری گرفت میں تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"اڈا اب تمرا ہے استاد! تمرے ہی کو دیکھنا ہوگا۔"

"پر ایسا کیسے۔"

"تم ہی ادھر اڈے پر بولے تھے، اڈے کی ریت ہے، چوکی پر بیٹھا استاد آپی نیچے کو آ جاوے تو......" برجو اٹکتی زبان سے بولا "استاد میدا کو اب تم سے پنجہ ناہیں لڑانا۔"

"کیوں نہیں لڑانا۔" میرا منہ بن گیا۔

"جو ہوا، اس کے بعد بالکل ناہیں۔" تیسرے آدمی نے تپی ہوئی آواز میں کہا، "اودھرام جاوے

بہت اندھیار ہیے۔ تے نے پیے اسپتال کا جوان آدمی مار دیے، پھر وکیل صاب کو۔ وکیل صاب بے چارے کا کا دوش تھا۔ ادھر ایسا کبھی نا ہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاب ہیاں بیٹھت ہیں۔ انھی سے پوچھ لیو، ایسا کبھی ہوا ادھر کا؟ کیوں ڈاکٹر صاب، مائی باپ!''
اس نے ڈاکٹر رائے سے ہاتھ جوڑ کے پوچھا۔
ڈاکٹر رائے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
ڈاکٹر کی خاموشی اس نے تائید جانی، چلچلاتی آواز میں کہنے لگا: ''او اپنے اڈے کے ادمن تھے۔ ہمرے ہی سے بندھے تھے رنڈی کے جنے، ہمرے پر جمے داری آوت ہے انھاں کی۔ میدا استاد نے اسی کارن اڈا چھوڑن کا پھیسلا کیا ہے۔ اب تمرے ہی کو اڈا دیکھنا ہے۔ میدا استاد اب ای سہر ہی سے چلا جاوے گا، پر ادھر تھوڑی پولیس سے منہ ماری کرن کے باد......''
''ہم کو ماپھی دیو استاد!'' برجو نے ندامت زدہ لہجے میں لقمہ دیا، ''ہم اور کا بولیں۔''
''میں جانتا ہوں۔ اکبر علی خاں کو تم نے نہیں ختم کیا ہے۔ ان تینوں ہی نے کیا ہوگا۔ ان کی یہی سزا ہونی چاہیے تھی جو انہیں مل چکی ہے، لیکن یہ تو بہت کم ہے۔''
''کم ہے، جانت ہیں، بہت کمتی ہے۔'' برجو تڑخ کے بولا، ''اسی کارن میدا استاد تمرے پاس......''
''اسی کارن میدا استاد اپنی سزا سنانے کے لیے ہمارے پاس آیا ہے نا!'' میں نے برجو کی بات کاٹ کے دھتکارتی آواز میں کہا، ''ٹھیک ہے، میدا کو اب اڈے پر نہیں رہنا چاہیے۔ اڈے کا جو استاد اپنے کتوں کے گلے میں پٹا ڈال کے نہیں رکھ سکتا، اڈے کے آخری آدمی تک جس کی نظر نہیں جاتی، اسے چوکی سے اتر ہی جانا چاہیے، لیکن میدا نے اپنی سزا آپ ہی کیسے طے کر لی۔ اس شہر سے راج پاٹ چلا جائے گا تو دوسرے شہر میں جا کے میدا بنسی بجائے گا۔
''ہمرا چاقو تمرے پاس ہے۔ اسی سے ہمری گدن اتار دیو۔'' میدا بھڑک کے بولا، ''کوئی اور سجا تمرے من میں ہو تو بولو۔''
''ایسا کر سکتے تو ذرا دیر نہیں لگتی استاد! پر اس سے بھی تسلی نہیں ہوگی اپنی۔'' میری آواز گرجنے لگی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کے ہی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ کہنے کو بہت سی باتیں سینہ جلا رہی تھیں۔ اب وہ میرا چاقو واپس کرنے آ گیا تھا اور اپنا چاقو طلب نہ کرنے کا مطلب واضح تھا کہ اب اس کے پاس نجات کی ایک ہی صورت رہ گئی ہے۔ پہلی مرتبہ چاقو بدلنے کے حیلے سے مبارزت ٹل گئی تھی اور بعد کو درمیان کی کوئی راہ نکل آنے کی امید کی جا سکتی تھی، لیکن اب اکبر علی خاں کی ہلاکت کے نتیجے میں اڈے پر میری واپسی یقینی ہو گئی تھی اور پھر یہی ایک تدبیر عقل و ہوش کے قریں تھی، چاقو سے میدا کی دست برداری۔
وہ اس حقیقت سے آشنا ہو چکا تھا کہ اڈے پر میرے احوال کے بیان میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ میرا بھائی واقعی اسپتال میں ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کے لیے خود کو داؤ پر لگانے آ جائے، وہ اپنے محبی اکبر علی خاں کا خون ہو جانے پر کیا کچھ کر گزر سکتا ہے۔ مجھے اس کے اڈے پر تو کل صبح ہی اکبر علی خاں کے سانحے کی خبر مل جانے پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میرے نہ پہنچ پانے کی وجہ بھی اسے معلوم ہو گی۔ سو میرے پاس آنے کے لیے یہی وقت مناسب تھا کہ اسپتال میں بیمار بھائی کی زنجیر میرے پیروں میں پڑی تھی۔ تین آدمیوں کو ختم کر کے اس نے اپنی دانست میں نرمی کا ایک گوشہ ڈھونڈ لیا تھا۔ یہی کچھ صبح میں نے ڈاکٹر رائے سے کہا تھا کہ آج یا کل کسی وقت میدا کو یہاں آنا چاہیے۔
میں خاموش رہا۔ میں نے میدا سے نہیں کہا کہ جب ان تین آدمیوں نے اسپتال میں گھس جانے کا

حوصلہ کیا تھا اور انتھونی مارا گیا تھا، میدا اگلے دن صبح ان پر پھندا ڈال دیتا تو نہ اکبر علی خاں جاتے نہ وہ تینوں۔ میدا کو میرے جواب کی آگہی ہوگی اور میرے پاس اس کے سوا جواب بھی کیا تھا کہ اس کا چاقو واپس کر کے اسے اپنے دل و دماغ سے حرف غلط کی طرح مٹا دوں۔ بٹھل کی صحت یابی تک مجھے خود کو روکے رکھنا تھا، چاہے درونِ خانہ کیسا ہی تلاطم برپا ہوا اور کیسا ہی خون کھولتا ہو۔ میرے پاس اسے ٹھوکریں مارنے، اس کا گریبان پکڑ کے لہولہان کر دینے، اس کا خون پینے کی گنجائش کہاں تھی۔ اس سے حاصل بھی کیا ہوتا۔ وہ دونوں، انتھونی اور اکبر علی خاں تو جا چکے تھے۔ انہیں واپس لانا میرے اختیار میں تھا نہ میدا کے۔ ادھر بٹھل بستر پہ تھا۔ کہتے ہیں، تحمل اور برداشت سب سے بڑا انسانی وصف ہے۔ ہر تحمل جبری ہوتا ہے اور ہر برداشت ہوش مندی ہوتی ہے۔ مجھے اسی وظیفے پر تکیہ کرنا چاہیے تھا۔

میدا کو اپنا وزن کرنا آتا ہوگا۔ وہ اپنے بدن پر چڑھتی چربی سے خوب واقف ہوگا، لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے۔ اتنے بڑے اڈے پر اس جیسے زور کا کوئی اور آدمی موجود نہیں تھا۔ ہوتا تو میدا ہی کیوں راجا بنا بیٹھا ہوتا۔ میدا کے چوکی سے اتر جانے کے بعد اڈے کی ریت کے مطابق مجھی کو اڈے کی ذمے داری سنبھالنی چاہیے تھی، کیوں کہ میں ہی ایک دعوے دار بہت عرصے بعد سامنے آیا تھا۔ دوسرا کوئی دعوے دار نظر نہیں آتا تھا۔ ہو بھی جاتا ہے تو چاقو آزمائی میرے اس کے درمیان ہی ہوسکتی ہے اور اس کے لیے میرا اڈے پر موجود رہنا ضروری ہے۔ میدا نے دست بردار ہو کے اڈے کی رسم نبھا دی ہے۔ مجھے آج میدا کی آمد کی توقع تھی اور آمد کے مقصد کی بھی...... تو اپنا ردعمل میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اپنا جواب تیار رکھنے کے لیے مجھے خاصا وقت مل گیا تھا۔

اس دوران ڈاکٹر رائے کی نظریں مسلسل مجھے اپنے چہرے پر چبھتی محسوس ہوتی رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے بے مہری سے کہا، "مگر میں اس وقت اڈا نہیں سنبھال سکتا۔ وجہ تمہیں معلوم ہے۔ اس وقت اڈے پر تم سے یہی بات ہوئی تھی کہ بھائی کے ٹھیک ہوجانے پر جب مجھے سہولت ہوگی، میں اپنا چاقو لینے آجاؤں گا۔"

"ہاں استاد، یاد ہے ہمرے کو پورا۔" معمر برجو نے سینے پر ہاتھ رکھ کے جلدی سے اقرار کیا۔ "پر...... پر......"

میں نے اسے روک دیا۔ "یاد ہے تو اچھا ہے۔ جس مجبوری سے اس شہر اور تمہارے اڈے پر آنا پڑا تھا، وہ ابھی تک ہے۔ بھائی اسپتال میں ہے۔"

"تم مانو، یا نا مانو استاد۔" تیسرا آدمی مچل کے بولا، "ایک کارن یہ بھی تھا چاقو کو بدلی کا......"

"ہنہ۔" میں نے اسے جھڑک دیا، "اس بات کو جانے دو۔ کارن اچھی طرح تمہیں معلوم ہے، مجھے بھی...... اور اتنا بھی کہ تمہیں ہمارے بھائی سے کتنی دل چسپی ہوسکتی ہے۔"

تینوں بہ یک وقت کچھ بولنا چاہتے تھے لیکن تینوں نے ایک ساتھ خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔

"اب سنو!" میں نے اونچی آواز میں کہا، "اڈے کی ایک اور ریت بھی ہے۔ اڈے کا استاد کسی وجہ سے چوکی پر نہ بیٹھ سکے تو اپنی جگہ کوئی بھی آدمی چوکی کے لیے چن سکتا ہے۔ تم لوگ یہ ریت جانتے ہو یا اسے بھی جتانے کی ضرورت ہے؟"

"جانت ہیں استاد۔" برجو کے لہجے میں کساوا آگیا۔ "تھوڑی بہت جان کاری ہے اپنے کو بھی...... تم بولو۔"

"پھر کچھ مدت کے لیے میدا استاد یا برجو دادا اڈا سنبھالیں یا کوئی اور جسے تم لوگ بہتر سمجھتے ہو۔ بھائی کی طبیعت ٹھیک ہونے پر مجھے اسے گھر لے جانا ہے۔ اسے گھر چھوڑ کے تبھی لوٹنا ہوسکتا ہے اپنا۔"

وہ مبہوت سے ہوگئے اور برجو جیسے پہلے ہوش آیا۔ عاجزی سے بولا، "اب تم جانو استاد، اڈا اپنا ہی تمرا ہے۔"

"مجھے نہیں لگتا، میدا جیسا کوئی اور آدمی اڈا سنبھال سکتا ہے۔ میرے لوٹ آنے تک میدا کو چوکی پر بیٹھے رہنا ہے۔"

حالاں کہ میری جانب سے اسی ایک جواب کی توقع انہیں بھی ہونی چاہیے تھی مگر شاید وہ کچھ اور قیاس کررہے ہوں۔ ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا تھا۔

"اب ہمرا جی ناہیں لاگے گا ہواں۔" میدا نے شکستگی سے کہا۔

ادھر برجو جھجک کے بولا، "اور میدا استاد اڈے کے سارے ادمن سے بدائی لے کے آیا ہے۔ او سب نیئے استاد کے سواگت کے واسطے اسپتال کے بہری کھڑے ہیں۔"

"ادھر اسپتال کے باہر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اب جو بولنا ہے، ایک بار ادھری جا کے انھاں کے سامنے بول دیو استاد! وہ سارے اسپتال کے بھیتر ناہیں آسکت تھے۔ ہم لوگن کو بھی بھیتر آنے میں بہت جو کھم ہوا۔"

"مجھے ان کے پاس جانا ہے؟ نہیں نہیں۔"

"اب وہ تمرے اڈے کے ادمن ہیں۔"

"لیکن میں ابھی اڈا نہیں سنبھال رہا ہوں۔"

"اسی بات کو جرا انھاں کے سامنے بول دیو۔" برجو نے لجاجت سے کہا، "جروری ہے استاد!"

مفر کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے متوحش نظروں سے ڈاکٹر رائے کی طرف دیکھا۔ اسے یہ سارا کچھ بہت نیا اور انوکھا لگ رہا ہوگا اور وہ آگے کا تماشا دیکھنے کا بھی مشتاق ہوگا۔ میں نے مزید پیش و پس مناسب نہیں سمجھا اور ڈاکٹر رائے کو اشارہ کر کے کرسی سے اٹھ پڑا۔

خاص کمروں کے اس حصے سے صدر دروازے کا فاصلہ خاصا تھا۔ ڈاکٹر رائے سے میں نے رک جانے کی درخواست کی تھی۔ وہ نہیں مانا تو میں نے اصرار بھی نہیں کیا۔ بہ ہر حال، ایک نہایت معتبر گواہ بھی ہم راہ تھا۔ جہاں جہاں سے ہم گزرتے رہے، ڈاکٹر رائے کو ہمارے ساتھ دیکھ کے راستے میں ملنے والے ڈاکٹروں، نرسوں، اسپتال کے دیگر ملازموں اور سپاہیوں کے جسم تن جاتے تھے اور آنکھیں پھیل جاتی تھیں۔ ہم دونوں آگے، پیچھے وہ تینوں تھے۔ ہماری رفتار تیز تھی۔ سلاخوں والے اونچے...... صدر دروازے ہی سے بہت لوگ مضطرب کھڑے دکھائی دیے۔ سپاہیوں کا ایک دستہ بھی وہاں موجود تھا۔

دربان نے صدر دروازہ کھول دیا۔ اڈے کے آدمیوں کے ہجوم میں شور اٹھا۔ اس لمحے بے اختیار میں نے ڈاکٹر رائے کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے نہیں معلوم اس کی ضرورت مجھے کیوں محسوس ہوئی۔ ہمارے تین اطراف اڈے کے آدمی کھڑے تھے۔ جانے کس کی ہدایت پر کوئی آدمی دربان کی کرسی لے آیا، پھر کوئی اور سپاہیوں کی بینچ۔ سپاہیوں کی کیا مجال تھی کہ اڈے کے آدمیوں کی پذیرائی میں تامل وتردد کریں۔ انہوں نے مجھے کرسی پر کھڑا کرنا چاہا، لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ڈاکٹر رائے نیچے کھڑا رہے۔ میں نے اسے کرسی کی پیش کش کی۔ اس کے چہرے سے نظر آرہا تھا کہ وہ کتنے استعجاب اور کشاکش کے عالم میں ہے۔ کسی قدر رد و کد...... کے بعد وہ کرسی پر کھڑے ہوجانے کے لیے تیار ہوگیا۔ میدا، برجو، ان کا تیسرا ساتھی اور میں بینچ پر کھڑے ہوگئے۔ وہ تینوں سکڑے سمٹے ہوئے تھے۔ ہمارے کھڑے ہوتے ہی شور اٹھنے لگا۔ عمر رسیدہ برجو کو ٹوکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اتنی عمر میں چہرہ شناسی آہی جانی چاہیے۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کے انہیں

بازی گر 7 219

خاموش رہنے کی تاکید کی۔
ہر طرف خاموشی چھا گئی تو میں نے بلند آواز میں کہا، ''ہمیں زیادہ لمبی چوڑی بات نہیں کرنی، اس کا وقت بعد کو آئے گا۔ اس وقت جو تم سے کہنا ہے، اسے دھیان سے سنو! میدا استاد نے اڈا چھوڑ دیا ہے۔ اب ہمیں اڈے کی چوکی پر بیٹھنا ہے، لیکن ابھی ہم اڈا نہیں سنبھال سکتے۔ میدا استاد فیصلہ کر چکا تھا۔ ہمارے کہنے پر مشکل سے ہماری جگہ چوکی پر بیٹھنے کو تیار ہوا ہے۔ جب تک ہم واپس نہ آجائیں، میدا استاد ہی اڈے کا مالک رہے گا۔ بیچ میں کوئی ہماری طرح چوکی کا دعوا کرنے والا آجائے تو اسے میدا استاد سے نہیں، ہم سے بل کرنا ہوگا۔ ہمارے ٹھکانے کا پتا میدا استاد کے پاس ہوگا، ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے، اس کے بلانے پر یہاں آجائیں گے، پر جب تک ہم آ نہ جائیں، نئے دعوے دار کو انتظار کرنا ہوگا۔''
میرے چپ ہو جانے پر ہجوم میں بھن بھناہٹ ہونے لگی اور مجھے خیال آیا احتیاطاً ایک بات ان سے اور کہہ دینی چاہیے۔ میں نے کہا، ''کسی کو کچھ پوچھنا ہے، یا کوئی اٹکاو ہے کسی کے دماغ میں، تو ہم ابھی سامنے کھڑے ہیں۔''
کسی طرف سے کوئی آواز نہیں اٹھی۔
''ہاں ایک بات اور۔'' جیسے ہی میری آواز بلند ہوئی، دوبارہ سناٹا چھا گیا۔ ''کوئی اور دعوے دار ہو تو ابھی ہم شہر میں ٹھیرے ہوئے ہیں، وہ سامنے آجائے، یہاں ابھی، اس وقت بھی۔ اب نہیں تو دو چار دن بعد، ہفتے بھر میں۔ ہمارے جانے کے بعد پھر، جیسا ہم نے بول دیا ہے، اسے ہمارے لوٹ کے آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔''
اپنی بات ختم کر کے میں نے سوالیہ نظروں سے برجو کو دیکھا۔ وہ تینوں ہی جیسے بت بنے ہوئے تھے۔ میں بینچ سے اتر آیا۔ ڈاکٹر رائے نے بھی فوراً میری تقلید کی۔ صدر دروازے پر واپس آ کے میں نے مڑ کے ایک نظر پیچھے کی طرف دیکھا۔ میدا، برجو اور وہی تیسرا آدمی لپکتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں اور ڈاکٹر رک گئے۔ ان تینوں کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے، آنکھیں جھلملا رہی تھیں، جیسے بس اڈا ہی چاہتی ہوں۔
جیب میں ہاتھ ڈال کے میں نے میدا کا چاقو نکال کے اس کے آگے کر دیا۔ ''اب تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ اس کے چہرے کی کھال پھڑکنے لگی تھی۔ میرے ہاتھ سے چاقو لے کے اس نے آنکھوں سے لگالیا۔ پھر ہم وہاں نہیں ٹھیرے، صدر دروازہ عبور کر کے اسپتال میں داخل ہو گئے۔
مرکزی عمارت اور اپنے کمرے تک آنے کے دوران ڈاکٹر رائے نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ مجھے اس سے اجازت لے لینی چاہیے تھی، لیکن میں اس کے ساتھ چلتا رہا تھا۔ کمرے میں آکے وہ تھکے ہوئے انداز میں میز کے قریب رکھی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لگتا تھا جیسے بہت دور کے سفر سے آرہا ہو۔ چند لمحے بعد اس نے پلکیں جھپکائیں اور مجھے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا تو گڑبڑا کے بولا۔ ''تم ...... تم کھڑے کیوں ہو؟''
''میں اب چلتا ہوں۔'' میں نے خمیدہ آواز میں کہا، ''مجھے اجازت دیجیے۔''
''کیوں، کیوں جانا چاہتے ہو؟'' اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''یوں ہی...... کچھ دیر آپ آرام کر لیں۔''
وہ پھر کہیں گم ہو گیا اور لمحے بھر بعد چونک کے بولا، ''مجھے واقعی آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے، جاؤ تم۔ کچھ دیر میں شام کے معائنے پر میں اس طرف آتا ہوں۔''
سلام کے لیے ہاتھ اٹھا کے میں دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا کہ اس کی بھاری آواز نے میرا

غائب کیا۔ رات کو تم گھر آسکتے ہو؟''
میں نے پلٹ کے حیرانی سے اسے دیکھا۔
''رات کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔'' اس نے سرسری سے انداز میں کہا۔
میں سوچتا رہا، مجھے کیا کہنا چاہیے۔ اس نے کرسی کے سرہانے سے سر ٹکا کے پھر آنکھیں موند لی تھیں۔ میں دبے قدموں باہر آگیا۔
راستے بھر گزرتے ہوئے لوگوں اور جگہ جگہ تعینات سپاہیوں کی نگاہیں مجھ پر بھٹکتی رہیں۔ بری خبر ہوا رفتار ہوتی ہے۔ شاید سبھی کو معلوم ہو گیا تھا کہ شہر اڈے کے سب سے بڑے استاد، میدا استاد اور اس کے قریب ترین ساتھی مجھ سے ملنے کے لیے اسپتال آئے ہوئے تھے اور یہ حیرت انگیز واقعہ بھی ان کے لیے ناقابل فہم ہوگا کہ ڈاکٹر رائے بھی میرے ساتھ تھا۔ کچھ دیر میں جزئیات سے بھی انہیں آگاہی ہو جانی تھی۔ پھر ہر کوئی اپنے اپنے طور، اپنی اپنی زبان میں انہیں بیان کرے گا۔ میں دائیں بائیں ان کی موجودی سے بے نیاز سا ان کے سامنے سے گزرتا رہا۔ اتنی نگاہوں کی زد پر آدمی کیسا چور سا بن جاتا ہے۔ بہ حال، کسی طرح میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ سیورین مجھے باہر ہی مل گئی۔ اسے چین نہیں ہوگا۔ بار بار کمرے سے راہ داری میں آتی ہوگی۔ اس نے دور سے مجھے آتا دیکھ لیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ابھی اس کے سوالوں کی جواب دہی کا ایک مرحلہ باقی ہے۔
''کیا ہوا؟'' اس نے پھٹے ہوئے دیدوں سے پوچھا۔
''چلے گئے وہ۔'' میں نے اس کے اطمینان کے لیے مسکرا کے کہا اور اس کا بازو تھام کے صوفے پر لے آیا۔ ''تم اتنا کیوں گھبرا رہی تھیں؟''
''بات ہی ایسی تھی۔'' وہ ہراساں آواز میں بولی۔
''تم نے غور نہیں کیا۔ اسپتال میں وہ کسی خطرناک ارادے سے کیسے آسکتے تھے۔ وہ باقاعدہ اجازت لے کے یہاں تک پہنچ پائے تھے۔''
''لیکن ان کا کیا بھروسا۔''
''وہ بھی آدمی ہی ہوتے ہیں، اور آدمی زیادہ تر آدمی ہی رہتا ہے۔''
''لیکن یہ ہوا کیا؟''
''ہوتا کیا۔'' میں نے اسے مختصراً ساری روداد سنانے کی کوشش کی۔ ''اب سب ٹھیک ہو گیا۔'' میں نے رسانی سے کہا۔
''کیا ٹھیک ہو گیا؟'' اس کا اضطرار کم نہ ہوا۔
''میں نے تمہیں بتایا نا، میرا چاقو اب میرے پاس ہے، میدا کا چاقو اس کے پاس۔ میدا استاد اپنی پرانی جگہ جا بیٹھے گا۔ انتھونی کو جانا تھا، چلا گیا۔ کہتے ہیں، وقت کو کون ٹال سکتا ہے۔ اکبر علی خاں صاحب کا بھی وقت آگیا تھا۔ ان کے قاتل بھی چلے گئے۔ پولیس ایک دوسرے کے قاتل تلاش کر رہی ہے۔ کوئی ان کے ہاتھ نہیں آئے گا تو وہ کیا کر سکتی ہے، چپ ہو کے بیٹھ جائے گی اور کسی معاملے میں مصروف ہو جائے گی۔ شیری کو انتھونی کے بغیر رہنا ہوگا۔ اکبر علی خاں صاحب کے گھر والوں کو ان کے بغیر زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی اور عادت پڑ ہی جائے گی۔ آدمی کو سب سے عزیز اپنی زندگی ہوتی ہے۔''
''تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' وہ آزردگی سے اور روہانسی ہو گئی۔
''کیا غلط ہے اس میں؟'' میں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ سر جھکا کے چپ ہو گئی اور ناخن کریدنے لگی۔ میں بھی خاموش بیٹھا اپنے کو تنکے چبھوتا رہا۔ خود آزادی سے بھی تسلی ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہو رہا تھا، دل جوئی کے بجائے میں نے اس سے کیسی شکستہ باتیں شروع کر دی تھیں۔ وہ تو چھوئی موئی کی مانند ہے۔ میری سنگ بیانی سے کیسی کمھلا گئی ہے۔ شیشہ ایسی گرانی کی

تاب نہیں رکھتا۔ اصل میں شاید میں یہ سب کچھ خود سے کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اس پر بار کر دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے چپکے سے اسے ٹوکا، ”اب کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ اس کی آواز جیسے پاتال سے ابھری۔

”مجھے افسوس ہے۔“ میرا لہجہ بھی معذرتی تھا۔

اس کے گلابی ہونٹوں میں ارتعاش ہوا۔

”ویسے تم تھوڑی سی پاگل بھی ہو۔“ میں نے ہلکی آواز میں کہا۔

اس کی لب ریز آنکھیں مجھ پر منڈ لائیں اور اس کے ابر آلودہ رخسار چمک اٹھے۔ ”ہاں۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”اور تم نے کیا ہے مجھے پاگل۔“

”میں نے؟“

”معلوم نہیں، تم کیسے آدمی ہو۔“

”بہت برا ہوں نا۔“

”ہاں آں، بہت برے۔“ وہ ہنس پڑی ”یہی تو تمہاری خوبی ہے۔“

میری تدبیر کارگر ہوئی، آخر کہیں اس پر چھائے یاس و حرماں کا غبار چھٹا۔ ”چائے نہیں پلاؤ گی۔“ میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں فرمائش کی۔

وہ زریں کی طرح بے تاب ہو گئی، نیساں کی طرح اس کے بدن میں بجلی بھر گئی، جھٹ باہر نکل گئی۔ بٹھل پر ایک نظر ڈال کے میں بھی باہر آ گیا۔ سیورین وہاں نہیں تھی۔ خدمت گار کو طلب کرنے کے بجائے وہ خود احکام صادر کرنے باورچی خانے چلی گئی ہو گی۔ سبزہ زار میں، اسپتال کے آداب کی وجہ سے وہ میرے ساتھ چائے میں شریک نہیں ہو سکتی تھی، اس خیال سے میں دوبارہ کمرے میں آ گیا۔

تھوڑی دیر میں وہ نمودار ہوئی۔ اس کے پیچھے بڑا سا تشت اٹھائے ایک مؤدب خدمت گار بھی تھا۔ چائے تنہا نہیں تھی۔ جانے کیا کیا لوازم ساتھ تھے۔ چائے کا تو بہانہ تھا، میں تو سیورین کو متح[ر]ک تازہ دم دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ حسین چہرو[ں پر] حزن و ملال زیبا نہیں ہوتا۔ پھول کھلے ہو[ئے] اچھے لگتے ہیں، ڈھلکے ہوئے ہوں، تیز دھوپ [میں] پڑے اور تیز ہواؤں کے نرغے میں ہوں تو جی گھبر[انے] لگتا ہے۔ چائے کے دوران وہ خاصی چاق چ[وبند] تھی۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ یہ وقت منا[سب] ہے۔ وہ کوئی کارندہ ہوٹل بھیجنے کا بندو[بست] کر دے۔ میں پرچی لکھے دیتا ہوں تا کہ ہوٹل کا ذمہ دار شخص یہاں آ کے تصدیق کرے کہ میں ہ[ی] سامان ہوٹل سے منگوانا چاہتا ہوں۔

وہ دنیا جہاں سے باخبر تھی، کہنے لگی کہ سنا [ہے شہر] میں سناٹا ہے، بہت کم لوگ آج گھروں سے [نکلے] ہیں۔ بیش تر دکانیں اور بازار بند ہیں۔

میں نے کہا، ”شہر تو بند نہیں اور ہوٹل تو ہو گا۔ کیوں نہ ایک کوشش کر لی جائے۔ اب تو خود بھی جا سکتا تھا، لیکن ڈاکٹر رائے سے بات بھول گیا۔“

”کیا؟“ وہ برگشتگی سے بولی۔ ”تم جاؤ گے [شہر] میں۔ ڈاکٹر رائے کیا، میں بھی تمہیں جانے ن[ہیں] دوں گی۔“ اپنے تحکمانہ لہجے کا اسے فوراً احساس اور وہ ٹھٹک سی گئی۔ ”تمہیں معلوم ہے، تم کیسے عج[یب] بنے ہو شہر میں۔“

”میں اسی لیے تو نہیں گیا۔“ میں نے ملائم[ت] سے کہا۔ ”معلوم تھا، ان حالات میں کوئی بھی جا[نے] نہیں دے گا۔ ان کپڑوں میں ایک دن اور گز[ارا] جا سکتا تھا، لیکن آج رات ڈاکٹر رائے کے گھر [دعوت] ہے۔“

”کیا؟“ اس کا سراپا بل کھا گیا۔ وہ بدحواس ہو کے بولی۔ ”ڈاکٹر رائے نے تمہیں بلایا ہے؟“

”ہاں، انہوں نے حکم دیا ہے، رات کا کھ[انا] میں انہی کے ساتھ کھاؤں۔“ میں نے کہا۔

”کیا واقعی؟ یقین نہیں آتا۔“

”کیوں نہیں آتا، اور تم اتنی حیران پریشان ہو رہی ہو، کوئی نئی بات ہے کیا؟ ڈاکٹر [صاحب] ایک مہربان اور مشفق بزرگ ہیں۔“

”بے شک، وہ ہر اعتبار سے ایک بڑے اور [اچھے] آدمی ہیں، وہ اپنے اسپتال کے مریضوں میں شامل رہتے ہیں لیکن صرف یہیں تک۔ مجھے [یاد نہیں]، آج تک انہوں نے......“

”مگر میں ان کا مریض نہیں، مریض کا نگراں [ہوں]۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوا۔ گھر جا کے تو وہ بالکل گھر [کے] ہو جاتے ہیں، مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ بہت [کم لوگوں] سے ان کا ملنا جلنا ہوتا ہے۔ انہیں اپنے کام [سے] غرض ہے۔ کام ان کے لیے عبادت ہے۔“

”سچ پوچھو تو مجھے بھی حیرت ہوئی تھی، لیکن جیسا [تم کہ]تی ہو اور جیسی لوگ ان کے بارے میں رائے [رک]ھتے ہیں، شاید ایسا کچھ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب [زند]گی میں بھی بہت شامل ہیں۔ لوگوں نے طرح [طر]ح کے افسانے یوں ہی ان کے بارے میں [ترا]ش رکھے ہیں۔“

”بہر حال، یہ بڑی ان ہونی سی بات ہے۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، انکار بھی تو نہیں کر سکتا [تھ]ا۔“

”یہ تو ایک اعزاز ہے۔“ جانے کیوں سیورین کچھ متردد، کسی فکر میں ڈوبی نظر آنے لگی۔

اسی اثنا میں دروازے پر آہٹیں ابھریں۔ ڈاکٹر رائے حسب معمول شام کے معائنے کے لیے آ گیا تھا۔ بٹھل کو آنکھیں کھولنے میں کچھ دیر نہیں لگی۔ انہوں نے اسے بٹھا دیا۔ ڈاکٹر رائے اور اس کا شریک کار ڈاکٹر آہستہ آہستہ اس سے باتیں بھی کرتے رہے۔ بیش تر بٹھل، ہوں ہاں، میں جواب دیتا رہا۔ میرا خیال تھا ڈاکٹر شام کو بھی اسے چہل قدمی کرائیں گے لیکن روزانہ کا طبی احوال نامہ پڑھ کے انہوں نے فشار خوں کا معائنہ کیا اور بٹھل کو بستر سے نہیں اٹھایا۔ میری تشویش پر ڈاکٹر رائے نے بے پروائی ظاہر کی۔ ”وہ زندگی ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔“ میں نے کچھ اور پوچھنا چاہا تو اس نے مجھے باہر چلے جانے کا حکم جاری کر دیا۔ میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ شاید بٹھل کو چند قدم چلانے کا فیصلہ قبل از وقت تھا جو انہوں نے شام کو نہیں دہرایا۔ ڈاکٹر کے واپس آنے میں دیر ہو گئی تو مجھے اور پریشانی ہوئی۔ میں نے دروازے سے جھانک کے دیکھنا چاہا، مگر دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

سورج کب کا افق پار جا چکا تھا۔ شام تیزی سے اندھیرے میں اتر رہی تھی۔ اسپتال کی روشنیاں جل چکی تھیں تب کہیں دروازہ کھلا اور ڈاکٹر رائے اپنے ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکلا۔ ہم دونوں جیسے ایک دوسرے کی جانب جھپٹے مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا، وہ بٹھل کے بارے میں تردد کی کوئی بات نہ کہہ دے، لیکن میرا شانہ پکڑ کے اس نے اپنی بات کی۔ ”ساڑھے آٹھ بجے تیار رہنا ہے۔ ملازم گھر لے جانے کے لیے آ جائے گا۔“ یہ کہتے ہی وہ چل پڑا اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

کمرے میں جا کے جب تک میں نے کرید کرید کے سیورین سے تصدیق نہیں کر لی، مجھے سکون نہیں آیا۔ اس نے بتایا محض احتیاط کی وجہ سے کہ بٹھل پر کوئی دباؤ نہ پڑے، انہوں نے اسے فرش پر چلانے کی زحمت نہیں دی۔

امی آ چکی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آ گیا تھا مگر وہ ٹھیری رہی اور دیر تک امی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں امی کو منتقل کر رہی ہو گی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ امی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استاد میدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طلبی۔ ان دونوں میں بڑی یگانگت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں جتنی

قریب ہو جاتی ہیں، دو مرد اتنے قریب نہیں ہو پاتے۔ دو عورتوں کی ایسی یک جائی دیکھ کے مردوں کو اپنی الگ جنس کا احساس کچھ سوا ہونے لگتا ہے، مغائرت کا سا کوئی احساس۔ گذشتہ شام کی طرح کترائی ہوئی آواز میں سیورین مجھ سے پوچھنے لگی کہ کل صبح وہ میرے لیے کچھ لائے۔ میں منع کرنا چاہتا تھا، لیکن وہی صورت درپیش تھی۔ بہت کچھ دعوت کار پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کون ہے، کتنا دل کش اور نازک، کتنا عزیز و محترم ہے اور اس کی نیت، اس کی طلب میں شوق کیسا فراواں ہے۔ کل کی طرح مجھ سے انکار نہ کیا جا سکا۔ میرے اقرار پر اس کی آنکھوں کی تابانی فزوں ہوگئی اور وہ سبک خرامی سے چلی گئی۔ رفتار بھی آدمی کی قلبی کیفیت کا مظہر ہوتی ہے۔

گھڑی نے ساڑھے آٹھ بجائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر رائے کے ملازم کو پابندیٔ وقت کی غیر معمولی تربیت دی گئی تھی۔ ضرور وہ کمرے کے باہر کھڑا رہا ہوگا کہ ٹھیک وقت پر دستک دے۔ آدمی کو اتنا 'گھڑی' نہیں ہونا چاہیے، آدمی تو پھر آدمی نہ رہا۔

ہوٹل میں کسی کو بھیجنے اور سامان منگوانے کا وقت نہیں تھا۔ کھینچ تان کے میں نے انہی بوسیدہ کپڑوں کی شکنیں درست کیں۔ نہا دھو پہلے ہی لیا تھا۔ نہانے کے بعد باسی کپڑے پہنے رہنا بھی ایک ستم ہے۔ پیشانی پر امی کے بوسے کی نذر لے کے میں باہر آ گیا۔

ڈاکٹر کا گھر دور نہیں تھا۔ پیدل کے فاصلے پر، اسپتال کی چار دیواری سے ملحق ہم گویا کسی جنگل میں داخل ہوئے، تراشا ہوا جنگل۔ ہر طرف سبزے کی خوش بو گھلی ہوئی، کچی کچی سی خوش بو۔ ایک طرف کوٹھیوں کی قطار، بیچ میں سیمنٹ کی پختہ سڑک، سڑک کے اس طرف درخت ہی درخت، باغ ہی باغ، چمن زار، فاصلے فاصلے پر والی بال، ٹینس اور باسکٹ بال وغیرہ کے قطعات۔ سڑک کے کنار ایستادہ کھمبوں پر قمقمے روشن تھے اور پروانے ا یلغار کیے ہوئے تھے۔ کچھ دور سڑک پر چند گور اور کالے بچوں کی ٹولی سائیکلیں دوڑا رہی تھ بچوں کی ہاؤ ہو میں مینڈکوں کی ٹرٹر اور جھینگروں جھنگار بھی شامل تھی۔ ہر کوٹھی گز بھر اونچی لکڑی کی کی چار دیواری میں قائم تھی اور عمارت کے چ اطراف وسیع رقبے پر اونچے نیچے سبزہ زار ہوئے تھے۔

ہمیں زیادہ آگے نہیں جانا پڑا۔ تیسری کوٹھی لکڑی کے چوڑے دروازے پر دربان موجود تھ یہ پرانی طرز کی دو منزلہ کوٹھی تھی۔ نہ اتنی بڑی، ایسی چھوٹی۔ جدید کم، قدیم زیادہ، صاف ستھر رنگ روغن بھی نیا نیا تھا۔ دروازے میں دا ہوتے ہی رات کی رانی سے واسطہ پڑا۔ رات رانی کی بھی کیا مہک ہوتی ہے۔ ادھر زریں۔ حویلی میں رات کی رانی کے پودے بے تحاشا لگا۔ ہیں۔ ساری حویلی معطر رہتی ہے۔ کچھ یہی احو ڈاکٹر کی کوٹھی کا بھی تھا۔ خوش بو آدمیوں کی طر ہوتی ہے۔ نرم و نازک، اجڈ اور وحشی، الھڑ، شو شرارتی، سنجیدہ، رنجیدہ۔ رات کی رانی کی مہک م جتنی نفاست اور شائستگی ہے، اتنی ہی شوخی ا چہکارسی بھی۔

ڈاکٹر رائے سبزہ زار میں ٹہل رہا تھا۔ میر سلام کا اس نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ ''فاص زیادہ تو نہیں ہے۔'' وہ نکیلی آواز میں بولا۔

''بالکل نہیں۔'' میں نے مستعدی سے کہا۔ ''کیا مجھے دیر ہو گئی؟''

''آدمی کے پاس سب سے کم کیا چیز ہو ہے؟''

دماغ کچھ حاضر تھا۔ ایک لحظے میں اس کا مد رسا ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ''جی ہاں! وافر بھی ہو تو ہے۔''

''آؤ'' میری کمر پر ہاتھ رکھے وہ بید کی کرسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ کرسی پر بیٹھ کے اس نے تذبذب سے پوچھا، ''یہاں بیٹھو گے، یا اندر چلیں؟ یہاں کچھ خنکی ہے۔''

''جیسا آپ بہتر سمجھیں۔'' میں نے مؤدبانہ کہا۔

''پہلے کھانا کھاؤ گے یا......؟''

''آپ کا وقت ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے۔''

''میرا خیال ہے، کچھ دیر بعد لگوائیں،'' اس نے ہچکچاتے ہوئے فیصلہ کیا اور کرسی سے اٹھ گیا، پھر ایک دو قدم بعد رک کے بولا، ''تم یہاں بیٹھنا تو نہیں چاہتے؟''

''یہ بہت خوب صورت اور پرسکون جگہ ہے۔'' میں نے کہا، ''لیکن یہاں واقعی خنکی ہے۔''

مجھے ساتھ لیے ہوئے وہ عمارت میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے سامنے کا وسیع حصہ کسی بڑے ہال کے مانند تھا، سادگی و پرکاری کی مثال، کونے کونے میں لہراتے، بل کھاتے ایک دوسرے میں پیوست اور گم، عورت اور مرد کے عریاں، نیم عریاں قد آدم مجسمے، دیواروں پر بڑی بڑی روغنی تصویریں، ساز و سامان کم اور منتخب تھا۔ ہال میں غنودہ سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر رائے بائیں طرف کے روشن کمرے میں آ گیا۔ یہ نشست گاہ تھی۔ جالی پوش کھڑکیاں کھلی ہونے کی وجہ سے یہاں بھی باہر جیسا موسم تھا۔ اس کمرے کے ساز و سامان میں بھی بڑی سادگی تھی، آرائش تھوپی ہوئی نہیں تھی اور مکینوں کی دولت و حشمت سے زیادہ ان کی نفاست طبع کی غماز تھی۔ ہم دیواری کونے میں جڑے ہوئے سوفوں پر کچھ اس طرح بیٹھ گئے کہ ایک دوسرے کے سامنے بھی تھے، ترچھے بھی۔

''ابھی کوئی دس منٹ پہلے ایک پولیس افسر یہاں سے گیا ہے۔ اصل میں میں نے ہی اسے بلایا تھا۔ اس دوران میں نے پولیس سے تھوڑا بہت رابطہ رکھا ہوا تھا۔'' ڈاکٹر رائے نے کسی تمہید کے بغیر کہا، ''پولیس افسر بتا رہا تھا، کچھ دیر پہلے، غروب آفتاب کی نماز کے بعد اکبر علی خاں کی تدفین ہو گئی ہے۔ ان کا بڑا بھائی شام کو حیدر آباد دکن سے آ گیا تھا۔ سنا ہے، جنازے میں بہت بڑا ہجوم تھا۔ شہر کے بیش تر مسلمان، عدالت میں اکبر علی خاں کے ساتھی اور لاء کالج کے طلبہ کثرت سے شریک تھے۔ آئی جی سے میں نے درخواست کی تھی کہ جنازے میں تمہاری عدم شرکت محسوس کی جائے گی اور خواہ مخواہ کے وہم و گماں کو ہوا دے گی۔ بہتر ہو گا، اکبر علی خاں کے بھائی اور گھر والوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ تمہیں بہ وجوہ شرکت سے روکا گیا ہے۔ پولیس افسر کا کہنا ہے، اکبر علی خاں کا بھائی طویل سفر سے آیا ہے اور چھوٹے بھائی کی ناگہانی پر بہت دل گرفتہ ہے۔ اسے ابھی کسی اور طرف دیکھنے اور سوچنے کا وقت کہاں ملا ہو گا، لیکن پولیس اس کے اثر و رسوخ سے واقف ہے، اس لیے خائف ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اکبر علی خاں کا بھائی تم سے ملاقات کرنا چاہے گا۔''

میں چپ رہا۔ میرے پاس کیا جواب تھا۔

''اکبر علی خاں کے قتل کے مقام پر پھینکی گئی تین لاشوں نے خاصی پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔ حالاں کہ میرے، تمہارے اور کسی حد تک پولیس کے بھی علم میں ہے کہ یہ کوئی ایسی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے، جیسا کہ تم کہتے ہو، قاتل اتنی آسانی سے گرفت میں نہیں آپائیں گے۔ بہ ہر حال، میں نے پولیس کو یقین دلا دیا ہے کہ اس دوران تم ہر وقت اسپتال میں رہے ہو اور پولیس ...... بھی تو تمہاری نقل و حرکت کی نگرانی کرتی رہی ہے۔ ادھر میں احتیاطاً بیرسٹر بھارگو سے بھی مشورے لیتا رہا ہوں۔ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ تم فی الحال اپنے آپ کو اسپتال اور بیمار بھائی کے کمرے تک محدود رکھو۔''

ملازم کی مداخلت پر ڈاکٹر رائے کو رکنا پڑا۔ ازم باوردی تھا اور کسی پھل کے رس سے بھرے لاس بہت اہتمام سے لایا تھا۔ یہ انناس کا رس تھا۔ ازم کے جانے کے بعد ڈاکٹر رائے کو توقع ہو گی کہ ں زبان کھولوں گا، لیکن ممنونیت کے اظہار کے سوا رے پاس کچھ نیا نہیں تھا اور ڈاکٹر کا لحاظ بھی مانع ا کہ منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے۔

''آج شام کا واقعہ میری زندگی کا سب سے نوکھا تجربہ تھا، خاصا سنسنی خیز۔ ہم قاتلوں کے اتھ بیٹھے تھے اور وہ...... وہ کیسے مطمئن تھے۔''

''آپ اڈے کے لوگوں کے درمیان تھے۔'' یں نے تصحیح کی جرأت کی۔

''یعنی وہ قاتل نہیں تھے۔'' وہ بگڑ کے بولا، ''یہ ن کے لیے کیوں کہ معمول کی بات ہے۔''

''اڈے کے آدمی اس طرح ہر کسی کا خون نہیں کرتے۔''

''مگر وہ قاتل ہیں۔ انہوں نے تین آدمیوں کا خون کیا ہے۔ یہ اعتراف کسی طور ڈھکے چھپے انداز میں انہوں نے خود کیا ہے۔'' شدت بیاں میں ڈاکٹر کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

''مگر میرے اور آپ کے سامنے اس مجہول و مبہم اعتراف کی کیا حقیقت ہے۔''

''یہ ایک اور بات ہے۔'' وہ جھنجلا کے بولا۔

''انہوں نے ان لوگوں کو راستے سے ہٹا دیا جو ان کے لیے مسلسل مصیبتیں کھڑی کر رہے تھے۔''

''تم ان کی حمایت کر رہے ہو؟''

''جن تین آدمیوں نے انتھونی اور اکبر علی خاں کو ختم کیا تھا، آپ کے خیال میں ان کی کیا سزا ہونی چاہیے؟'' میں نے تحمل سے پوچھا۔

فوراً کچھ کہنے کے بجائے وہ پہلو بدلنے لگا۔

''نہیں...... انہیں...... مگر یہ عدالت کا کام ہے۔ عدالتیں کس لیے کھلی ہوئی ہیں۔''

''عدالت بھی یہی فیصلہ کرتی...... یا نہیں کرتی...... مگر فیصلہ تو یہی ہونا چاہیے تھا۔ عدالت کو کسی نتیجے پر پہنچنے میں ایک وقت صرف ہو جاتا، گواہیاں، شہادتیں، وکیل، اور ایک عدالت کے بعد دوسری، تیسری اور ایک تاریخ کے بعد دوسری...... ممکن ہے، وہ بچ بھی جاتے۔''

''مگر یہ بھی تو ممکن ہے، اکبر علی خاں کا قتل انہوں نے کیا ہی نہ ہو۔''

''اور اگر واقعی کیا ہو؟''

''مگر اڈے کے لوگوں کو کسی فیصلے کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں کیا، کسی کو بھی نہیں۔''

''سارے معاملات میں وہ کہاں دخیل ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک بالکل مختلف معاملہ تھا۔ یہ ان کے اڈے کا معاملہ تھا۔ اڈے کے لوگوں پر ضرب آ رہی تھی۔ اپنے ہی آدمیوں کی وجہ سے وہ رسوا ہو رہے تھے اور...... یوں سمجھیے، انہوں نے اچھی طرح خونی تلاش کر لیے تھے۔''

''میں تم سے متفق نہیں ہوں۔''

''میں اصرار بھی نہیں کر رہا۔ میں تو حقیقت واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ جو کچھ ہوا، اس کا پس منظر بتانے کی کوشش کر رہا ہوں اور انہوں نے قتل کہاں کیا ڈاکٹر صاحب! یہ تو انہوں نے میرے اور آپ کے سامنے جو ڈھکا چھپا سا سچ بولا تھا، اس کی کیا وقعت ہے۔ انہیں کسی مضبوط شہادت کے بغیر کوئی عدالت سزا نہیں دے سکتی۔ ہاں، میں انہیں سزا دے سکتا ہوں، آپ دے سکتے ہیں۔ آپ نے وہ قول لازماً سنا ہو گا، قانون کی آنکھیں نہیں ہوتیں، صرف کان ہوتے ہیں، چلیے، کل صبح چل کے میں اور آپ عدالت میں اعلان حق کرتے ہیں، ہم سچ بولتے ہیں۔ انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہو گی۔ اگر کی ہے تو اس کا خمیازہ ضرور بھگتیں گے۔ آدمی اپنی غلطیوں ہی سے اپنے لیے کانٹے بوتا ہے۔''

''تم مجھے زچ کر رہے ہو۔''

''مجھ میں یہ حوصلہ نہیں ہے۔''

گویا اب سب کچھ فیصلہ ہو چکا۔
"باقی پولیس کی سنجیدگی اور دیدہ ریزی پر منحصر ہے۔ اس کے لیے یہ عزت وقار کا مسئلہ ہونا چاہیے۔ پولیس بھی سمت پہچانتی ہے۔ اسے سراتلاش کرنے کی بے قراری ہونی چاہیے۔"
"ہم اس کی مدد تو کر سکتے ہیں۔"
"کس بنیاد پر؟"
ڈاکٹر کا جسم پھڑک کے رہ گیا، اور وہ مرجھائی ہوئی آواز میں بولا، "تم ٹھیک کہتے ہو شاید۔"
انناس کے رس میں کالی مرچ اور نمک کی آمیزش تھی۔ میں نے لمبا گھونٹ لے کے گلاس تمام کر دیا۔ ڈاکٹر نے بھی اپنے گلاس کا رس حلق میں انڈیل لیا۔ "یہ اس کم عمری میں ایسی جہاں دیدگی تم میں کہاں سے آ گئی؟" وہ کچھ پر سکون سا ہو گیا تھا۔
"شاید میں نے زندگی زیادہ ہی جھیلی ہے۔" میں نے انکسار سے کہا۔
باہر سے آتی کھنکتی نسوانی آواز نے نشست گاہ کا سکون متلاطم کر دیا۔ "پاپا! کھانا لگوائیں۔" ساتھ ہی بادامی رنگت کی سادی سی ساری میں لپٹی ایک نوجوان لڑکی ہوا کے تیز جھونکے کی طرح کمرے میں در آئی۔ مجھے دیکھ کے وہ کسی قدر جھجکی اور جھپکتی پلکوں سے بولی، "آپ ہی بابر صاحب ہیں۔"
میں کھڑا ہو گیا۔
اس نے میری سامنے آ کے جھٹ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور چہکتی آواز میں بولی، "اچھا، تو آپ ہیں۔ پاپا لوگوں کی تعریف کرنے میں بڑے بخیل ہیں، لیکن آپ کا ذکر مسلسل کرتے رہے ہیں۔ مجھے آپ کو دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔"
اس کے نرم ہاتھوں کی حدت اور لپک سے اس کے اشتیاق کی تصدیق ہو رہی تھی۔ اس کی ناگہاں آمد، تپاک اور اس بے ساختگی سے میرے حواس منتشر ہو گئے۔ "یہ بینا ہے، میری بیٹی۔" ڈاکٹر نے افتخار سے کہا۔ "اور اب یہ میرا بیٹا بھی ہے۔" اس کے لہجے میں بے پناہ شیفتگی تھی۔
سونے جیسی اس کی رنگت تھی، سونا جیسے تپا ہوا ہو، چمپا جیسے کندن بن گئی ہو۔ بدن کا ایک ایک انگ ناپ تول کے بنایا گیا ہو، شانوں تک تراشیدہ بال، چہرے پر تابندگی اور تروتازگی، انداز میں تمکنت اور اعتماد۔ اسے حسن و جمال کا مرقع نہیں کہا جا سکتا تھا، لیکن جاذبیت اور دل کشی میں یک تا، یگانہ۔ آدمی دیکھتا رہ جائے، آدمی کھنچتا چلا جائے۔ یہ خوبی ہر حسین لڑکی میں نہیں ہوتی۔ "میں تو بھول ہی گیا۔" ڈاکٹر خود کو سرزنش کرتے ہوئے لہجے میں بولا، "تم کچھ پیو گے، اسکاچ، وائن، یا کونیک؟ اسکاچ کا تو وقت نہیں رہا۔"
"جی، جی نہیں۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا، "میں کچھ نہیں پیتا۔"
"کوئی تکلف نہیں، میں برا نہیں سمجھتا اور گاہے گاہے تو......" وہ مسکرا کے بولا۔
میں نے شکریہ ادا کیا۔ "بس یوں ہی عادت نہیں پڑی۔"
"اچھا ہے یہ بھی...... مشکل یہ ہے کہ پھر آدمی شرابی ہو جاتا ہے اور شرابی ہو کے آدمی نہیں رہتا۔"
"پاپا! باقی باتیں اب کھانے کی میز پر۔" بینا نے ہٹیلی آواز میں کہا، "کھانا تیار ہے۔"
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، آتے ہیں سرکار۔"
ڈاکٹر کے فدویانہ لہجے پر مجھے تعجب ہوا۔ ایسا لگا کہ بیٹی کے سامنے وہ بے بس سا ہو گیا ہے۔ یوں بھی اولاد کے سامنے آدمی کو اپنی عمر کا احساس کچھ زیادہ ہی ہونے لگتا ہے، اور اولاد جوان ہو تو پس پا سا ہو جاتا ہے۔
بینا چھلاوے کی طرح کمرے سے چلی گئی۔ ڈاکٹر بھی اٹھ گیا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ نشست گاہ سے نکل کے ہال میں اور چند قدم کی دوری پر واقع کھانے کے کمرے میں آ گئے۔ میز پر چینی کی صاف شفاف تشتریاں سجی ہوئی تھیں۔ گلاسوں میں سفید

رومال اڑ سے ہوئے تھے۔ کھانے کا یہ اہتمام میں نے کرشنا جی کے ہاں دیکھا تھا۔ جولین اس قسم کی نوک پلک میں بڑی مشاق ہے۔ بینا کی نگرانی میں وردی پوش خانساماں نے خوان اس احتیاط سے میز پر رکھے کہ ایک ذرا سی بھی آواز بلند نہیں ہوئی۔ یہ آداب بھی زندگی کتنی مفید کرتے ہیں۔ درمیان میں ڈاکٹر اور اس کے دائیں بائیں میں اور بینا بیٹھ گئے۔ کھانوں کی اقسام زیادہ نہیں تھیں۔ ڈاکٹر کی دیکھا دیکھی میں نے بھی سبزیوں کی یخنی سے ابتدا کی۔ مچھلی کا سالن، مٹر پلاؤ، پنیر پالک، مسالا مرغ، میتھی کے ساگ ملی مونگ کی دال اور اروی کے پتوں کے کباب۔ سب کچھ ہلکا پھلکا اور لذید، کچھ مختلف سا بھی، مرچیں برائے نام اور روغن کم سے کم۔ میں نے ازراہِ وضع تعریف کی۔
"آج اس نے تجربے نہیں کیے، شاید تمہارا خیال رکھتے ہوئے۔" ڈاکٹر رائے نے توصیفی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ "ورنہ یہ تو روز ہی نت نئے تجربے......"
"آپ کو دل چسپی ہے کھانا پکانے سے؟" میں نے بینا سے پوچھا۔
بینا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر نے لقمہ دیا۔ "پکانے سے زیادہ تجربوں سے۔ خانساماں کو ہدایتیں جاری کرتی اور سر پہ کھڑی رہتی ہے۔"
"اور تجربے کیا برے ہوتے ہیں پاپا!" بینا نے ٹھنک کے پوچھا۔
"نہیں، بہت اچھے، مگر ہضم بھی تو کرنے پڑتے ہیں۔"
"اوہ پاپا۔" وہ کھل کھلا پڑی۔ طعام گاہ میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔
"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کو کھانا پکانے وغیرہ سے بھی رغبت ہو گی۔" میں نے دبی آواز میں کہا۔
"کیوں، اندازہ کیوں نہیں تھا؟" بینا نے چمک کے پوچھا۔
"عموماً جہاں ملازمین اور زندگی کی وافر سہولتیں میسر ہوں، وہاں کھانا پکانے وغیرہ کو ضمنی چیزیں سمجھا جاتا ہے بل کہ فضولیات۔"
"اور وہاں طرح طرح کے کھانوں کے سبھی دل دادہ ہوتے ہیں۔" بینا شگفتگی سے بولی، "کھانے کا تعلق تو زندگی سے بہت ہے، غالباً سب سے زیادہ۔"
"اور یہ تم دیکھ رہے ہو۔" ڈاکٹر رائے سر اٹھا کے گھماتے ہوئے بولا "ان دیواروں پر یہ نقش و نگار، یہ جگہ جگہ، کونے کونے بے حرکت مرد اور عورتیں...... یہ بے جان بھی اسی کی شرارتیں ہیں۔"
"یہ مجسمے، تصویریں آپ کی تخلیق ہیں، یہ سارا کچھ......؟" میں نے تعجب سے کہا۔
"ہاں۔ بس ایسے ہی کوشش کرتی رہتی ہوں۔" بینا چہکتی آواز میں بولی، "آپ کو مصوری، سنگ تراشی سے کوئی نسبت ہے؟"
"درک نہیں، شوق ضرور ہے۔ آپ نے تو بہت اچھا کام کیا ہے۔ سارا گھر عجائب خانہ لگتا ہے۔ یہ مجسمے اور تصویریں محض صناعی اور مصوری نہیں، ان میں آپ کا خیال، آپ کے احساس، آپ کی فکر کا اضطراب جھلکتا ہے۔ لگتا ہے، درون خانہ کچھ سلگ رہا ہے، کوئی شورش سی بپا ہے۔ کچھ تلاش سی ہے۔ جو کچھ نظر آ رہا ہے، جوں کا توں وہ آپ کو قبول نہیں۔ اس سے کچھ نیا، بدلا ہوا اور سوا ہونا چاہیے۔ مصور اور مجسمہ ساز قدرت جیسا اختیار چاہتے ہیں۔ تجریدی مصوری اس خواہش کی ایک مثال ہے۔ تجریدی مصور ملحد ہوئے بغیر قدرت کے بنائے ہوئے نمونوں سے انحراف کی جرأت کرتے ہیں۔ وہ جیسے کائنات کی یک سانی سے اکتا گئے ہیں اور تغیر و تبدل کے شدت سے خواہش مند......"
میں نے خود کو روک لیا اور معافی چاہی کہ اس موضوع پر کوئی دست رس نہ ہونے کے باوجود میں

کیسی کلیاتی باتیں کررہا ہوں اور ایک باقاعدہ مصور کے سامنے۔

بینا کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ ’’آپ رک کیوں گئے؟‘‘ وہ چھن چھناتی آواز میں بولی، ’’بہت عمدہ تجزیہ کررہے ہیں آپ۔‘‘

’’کہاں، بس یوں ہی۔‘‘

’’آپ تجریدی مصوری کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔‘‘ بینا نے مجھے ٹوکا اور اس کا سارا بدن مچل سا گیا۔

’’میں ...... میں کہہ رہا تھا۔‘‘ شاید اپنی بے مائیگی، یا تجاوز کے احساس سے میری آواز اینڈ نے لگی، میں نے لہجے میں نرمی اختیار کی۔ ’’اور ہوا کچھ یہ، بعض مصوروں نے تجرید کے عنوان سے مادر پدر آزادی حاصل کرلی۔ پھر تو کوئی بھی مصوری کا دعوا کرسکتا ہے کہ اشیا و اجسام، مظاہر و مناظر کی مسلمہ اور مستقل شکلیں مسخ کرنے کا کام نہایت آسان ہے۔

تجریدی تخلیقات میں بھی ایک توازن و تناسب بہر حال لازم ہے۔ مراد یہ ہے کہ تجرید کو بھی ایک نظم و ضبط چاہیے۔ تجرید مصوری کے نسب اور تسلسل سے بالکل جدا نہیں ہوسکتی۔ تبھی اثر انداز ہوتی ہے جب تخلیق کار کو مصوری کے آداب و قواعد سے آگہی ہو اور وہ اشیا و مناظر کی بجنسہ تشکیل و تجسیم پر بھی قادر ہو، یعنی انحراف اسی مصور کو زیب دیتا ہے جو مصوری کی بنیاد، اس کے فنی رموز سے آشنا ہو...... اور ہاں رسائی بھی ایک شرط ہے، چاہے وہ معدودے چند تک ہو۔ مشکل رسائی اور چیز ہے، رسائی سے عاری ہونا اور چیز۔ تخلیق رسائی سے عاری ہوگی، یا رسائی صرف تخلیق کار تک محدود رہتی ہے تو حجت محض ہے۔ ہر تخلیق جتنی اپنے لیے، اتنی دوسروں کے لیے ہوتی ہے۔ کوئی صرف اپنے لیے شعر نہیں کہتا اور کوئی صرف اپنے لیے تصویر نہیں بناتا، سو رسائی لازم ہوجاتی ہے۔ تجرید بے دلیل نہیں ہوتی۔ وہ کسی فکر، کسی خیال کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ لکیروں، رنگوں اور زاویوں میں فکر و خیال، معانی و مفاہیم کہیں چھپے ہوئے، آنکھ مچولی کرتے محسوس کرتے ہوں تو ان کا تعاقب ضرور کیا جاتا ہے اور تعاقب میں کچھ ہاتھ نہ آئے تو...... تو۔‘‘ میں پھر بہکنے لگا تھا۔ اپنی رو میں جانے کیا کیا کہتا رہا۔ دونوں باپ بیٹی کی نظریں مجھے نشانہ بنائے ہوئے تھیں۔

بینا کا چہرہ آتے جاتے رنگوں سے تمتما رہا تھا۔ باپ سے وہ شکایت کرنے لگی کہ اس نے میرے بارے میں اتنے بخل سے کیوں بتایا تھا۔

’’پھر میں نے اسے مدعو کیوں کیا ہے۔‘‘ ڈاکٹر رائے بچوں کی سی سرخوشی سے بولا، ’’میں تمہارے لیے کچھ حیرتیں محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔‘‘

بینا نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کیا اور لچکتے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی، ’’آپ نے تجریدی بات کی ہے۔ تاثراتی (impresssionistic) مصوری میں حقیقت سے ایسا انحراف نہیں کیا جاتا، حقیقت ہی بنیاد رہتی ہے۔‘‘

’’مصوری کی یہ قسم اس لیے مرغوب بھی بہت ہے کہ حقیقت بنیاد رہتی ہے۔ یوں کہیے کہ بنیاد میں ذرا سا تصرف کیا جاتا ہے، تھوڑا لرزا اور جھن جھنا دیا جاتا ہے۔ یہ ایک معصومانہ انحراف ہے، سرکشانہ اجتہاد نہیں۔‘‘

’’آپ تو خاصا جانتے ہیں۔‘‘ بینا کی آواز حیرت آمیز مسرت اور احترام سے مملو تھی۔

’’نہیں، بالکل نہیں، کسی خوش فہمی میں نہ رہیے۔ سچ پوچھیے تو مجھے آپ کے سامنے اس موضوع پر بات کرنے کا حوصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن کچھ تو سفر بہت کیا ہے، اور شہر شہر میں عجائبات و نوادر دیکھنے کا موقع ملا ہے، پھر اصل میں بمبئی میں میرے ایک مربی تھے، راج کرشناجی، مدراسی تھے، پولیس کے بہت بڑے افسر، سفر کے دوران ریل کے ڈبے میں

ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ میں نے ان کی جان بچائی تھی۔ مجھ پر ایسے مہربان ہوئے کہ اپنے گھر لے گئے۔ مجھے چھوٹا بھائی سمجھنے لگے۔ پولیس سے وابستگی کے باوصف وہ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے، عالم فاضل۔ انہیں فرصت کم ملتی تھی لیکن جب بھی ملتی، مجھ سے ادب، شاعری، فلسفے، مصوری، موسیقی کی باتیں کیا کرتے۔ ان کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ میری تربیت کرتے، مجھے اپنا علم منتقل کرتے رہتے تھے۔ دوسری بار ان پر حملہ ہوا تو میں انہیں نہ بچاسکا۔ بدمعاشوں نے انہیں ختم کردیا۔‘‘

’’ہائیں......‘‘ بینا کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس نے مشرقی لڑکیوں کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

’’یہی کچھ ہوا۔‘‘ میں نے اداسی سے کہا۔ ’’اور آپ کو بتاؤں، وہ مجھے اتنا اپنا سمجھنے لگے تھے کہ ساری جائیداد میرے نام کرگئے۔ میرے سوا ان کا کوئی تھا ہی نہیں یا ایسا سمجھیے کہ میرے سوا وہ کسی کو اپنا نہیں سمجھتے تھے۔ میں نے مصوری کے بارے میں جو کچھ الٹا سیدھا کہا ہے، وہ میرا دیکھا اور جانا ہوا کم، سنا ہوا زیادہ ہے، یہ تو آموختہ تھا۔‘‘

’’آدمی اپنا دیکھا اور سیکھا ہوا ہی دہراتا ہے اور دلچسپی نہ ہو تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ کیوں بابا؟‘‘ بینا نے باپ سے حمایت چاہی۔ ڈاکٹر رائے نے سر ہلا کے تائید کی۔

کھانا کب کا ختم ہوچکا تھا۔ خانساماں نے خوان ہٹالیے تھے۔ ڈاکٹر رائے کے اٹھنے پر میں بھی اٹھ گیا، بینا بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر نے خوشامدانہ سے لہجے میں بینا سے کہا کہ اسے مجھ سے کچھ بات کرنی ہے، بینا اس دوران کافی کا اہتمام کردے تو کیا خوب ہو۔

’’کوئی ذاتی قسم کی بات؟‘‘ بینا نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

’’نہیں، کچھ ایسی ذاتی نہیں۔‘‘

’’تو میں شریک نہیں ہوسکتی؟‘‘

ڈاکٹر رائے نے انکار نہیں کیا، یا انکار کر نہ سکا۔ وہ بیٹی کی پیشانی پر کسی شکن کا متحمل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا کہ ہماری باتوں میں بینا کے ذوق کی شاید کوئی چیز نہ ہو۔

’’مگر میں اس منفرد اور شاندار مہمان کے ساتھ بیٹھنا اور بہت سی باتیں کرنی چاہتی ہوں۔‘‘ بینا نے بے باکی سے کہا۔

’’میں...... میں تو کچھ بھی نہیں۔‘‘ میں نے ہکلا کے کہا۔

’’آپ لوگ بیٹھیے، میں کافی کا انتظام کرتی ہوں۔‘‘ بینا نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ تیز قدموں سے وہ ایک طرف چلی گئی۔

دوبارہ نشست گاہ میں جانے کے بجائے ڈاکٹر رائے ہال کے ایک گوشے میں رکھے صوفوں میں سے ایک پر جا بیٹھا۔ بینا ہال مزید روشن کرگئی تھی۔

’’تم کیسی کافی پسند کرتے ہو، بلیک یا سادہ؟ دودھ کے ساتھ یا کریم کے؟‘‘

’’میں مشروبات کم پیتا ہوں۔‘‘ میں نے متانت سے کہا۔ ’’ویسے کافی کا لطف ہی اس کی تلخی میں ہے۔‘‘

’’اور تم سب سے زیادہ تلخ چیز نہیں پیتے۔‘‘

’’جی ہاں۔‘‘

’’برا سمجھ کے؟‘‘

’’کچھ اچھی چیز بھی نہیں ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا، بس عادت ہی نہیں پڑی۔‘‘

’’کیا اڈے کے لوگ نہیں پیتے؟‘‘

’’پیتے ہیں۔ شراب، افیون، گانجا اور بھنگ بھی، لیکن عام آدمیوں کی طرح، عادی شرابیوں اور نشے بازوں کی طرح نہیں، اور کسی خاص موقع پر۔‘‘

بینا فوراً ہمارے درمیان آگئی اور اپنے باپ کے ساتھ میرے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ پہلے سے کچھ زیادہ شاداب لگ رہی تھی۔ ’’کیا باتیں کررہے تھے آپ؟‘‘ اس نے شائستگی سے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" ڈاکٹر رائے اچٹتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں نے تمہیں اڈے پاڑوں کے متعلق بتایا تھا نا، اسی کے بارے میں کچھ مزید معلومات......"

"اڈے کے لوگوں کے سینگ نہیں ہوتے، نہ چار آنکھیں، چار کان۔" میں نے کہا۔

"ہاں، ہاں۔" ڈاکٹر کے لہجے میں ترشی آ گئی۔ "مگر وہ اڈے کے لوگ ہوتے ہیں، عام لوگوں سے مختلف۔"

"عام لوگوں میں بھی بہت مختلف لوگ ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر رائے مفاہمانہ لہجے میں بولا۔

"معلوم ہے، تمہارے پاس ہر بات کا جواب ہے۔"

"اور بے جواز نہیں۔"

"ہاں ہاں صاحب۔" اس نے الکساتے ہوئے اقرار کیا اور کچھ توقف کے بعد ہمک کے بولا، "ایک بات ذہن میں اٹکتی ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ ڈاک خانے والی گلی میں...... کیا نام تھا مرنے والے آدمی کا؟"

میں نے بتایا، "دھنوا۔"

"ہاں دھنوا، دھنوا۔ تمہارے ہاتھوں دھنوا کو زچ ہوتا دیکھ کے اس کا دوسرا ساتھی تمہاری طرف چاقو تانے بڑھا تھا اور تم اس کے نشانے سے ہٹنے میں کام یاب ہو گئے تھے، لیکن چاقو بردار خود کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اس کا چاقو اپنے ہی ساتھی کی پسلی میں جا کھبا۔"

"جی ہاں، کچھ ایسا ہی۔" میں نے تعجب سے کہا، "آپ کو خوب یاد ہے، جزئیات کے ساتھ۔"

ڈاکٹر نے میری مداحی پر توجہ نہیں دی اور تیزی سے بولا، "مگر وہ آدمی جس کے چاقو سے دھنوا زخمی ہو گیا تھا، اس حقیقت سے تو واقف تھا کہ غلطی اسی کی تھی، پھر اس کے اور دھنوا کے لیے جان پر کھیلنے کو تیار اس کے دو اور ساتھیوں کے قہر و غضب کا کیا سبب تھا۔ ایسا جنون کہ وہ تمہیں ختم کرنے کے لیے اسپتال تک آ گئے اور تم ہاتھ نہ آئے تو انہوں نے اکبر علی خاں کو ہلاک کر دیا؟"

"اس نے اپنے دو ساتھیوں کو اصل حقیقت نہیں بتائی۔" میں نے تامل سے کہا۔

"لیکن راہ گیر...... گلی کے بہت سے مکین بھی تو اس منظر کے گواہ تھے۔"

میری سمجھ میں ڈاکٹر کی الجھن ذرا دیر سے آئی۔ وہ ایک دانا و بینا، نہایت منطقی بات کر رہا تھا۔ مجھے وہ سارا واقعہ اختصار سے دہرانا پڑا۔ میں نے کہا، "اس قسم کی صورت حال میں پلک جھپکنے کی مدت میں منظر بدل جاتا ہے، کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ بے شک راہ گیر گواہ ہیں، لیکن وہ ایک خیرہ کن منظر تھا۔ دھنوا کا ساتھی پاگلوں کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا تھا، اور واضح رہے، فاصلہ میلوں کا نہیں، چند قدم کی دوری کا تھا۔ میرے پاس اس وقت یہی ایک راستہ تھا کہ اپنے قبضے میں آئے دھنوا کو ڈھال بنائے رکھوں کہ یہ صورت دیکھ کے چاقو بردار کو شاید کچھ ہوش آ جائے، وہ خود کو تھام سکے۔ لیکن وہ نومشقا تھا اور ادھر دھنوا کو چھوڑ کے الگ ہو جانے کی مہلت میرے پاس نہیں تھی۔ ایک لمحہ، دوسرا لمحہ...... لمحوں کا معاملہ ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب!"

"میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔" ڈاکٹر تندی سے بولا۔ "جب دھنوا کا ساتھی اس حقیقت سے......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی، "وہی بتا رہا ہوں آپ کو۔ دھنوا کی پسلی میں چاقو کی رعایت بھی اس سبب سے ممکن ہوئی تھی کہ میں کسی حد تک اسے نشانے سے بچانے میں کام یاب رہا تھا، ورنہ چاقو یا تو اس کا پیٹ چیر دیتا، یا سینہ کھود ڈالتا۔ چاقو بردار نے خود کو یقین دلایا، اس نے یہی جانا کہ میں دھنوا کو چھوڑ دیتا تو دھنوا اس کے نشانے پر نہ آ پاتا، یعنی

میں نے دھنوا کو سپر بنائے کیوں رکھا، یعنی مجھے اس کی خواہش کی تعمیل کرنی چاہیے تھی۔ مجھی کو نشانے پر آجانا یا رہنا چاہیے تھا یعنی میں نے دھنوا کو دانستہ آگے کردیا۔ لازماً اس نے اپنے دو ساتھیوں کو بھی یہی کچھ باور کرایا ہوگا۔ اپنی بجی ونا اہلی کا غم وغصہ اسے بہت ہونا چاہیے تھا۔ گلی کے بوکھلائے ہوئے تماشائیوں میں کچھ دور تھے۔ کچھ قریب۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کس نے دیکھا، کتنا دیکھا، اور کیا جانا، کیا سمجھا اور ایک نے دوسرے کو کیا تلقین کی۔ ہجوم میں ہر ایک اپنی اپنی شہادت الاپتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے، میں ان کے لیے اجنبی اور اڈے کے آدمیوں سے ان کا روز کا واسطہ تھا، لیکن ان میں کچھ اس موقع پر میری حالت دیکھنے، میری مجبوری سمجھنے اور سچ بیانی کا حوصلہ رکھنے والے لوگ بھی ضرور ہوں گے۔ کسی سے گواہی طلب کی جاتی تبھی کچھ سامنے آتا۔ گلی سے میرے نکلتے ہی ہاہا کار مچ گئی۔ اڈے کے کچھ آدمی شامل ہوگئے اور ہر کوئی اس سمت اشارے کرنے لگا، جدھر میرا تانگا بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے پولیس کو بھی ساتھ کرلیا۔ میرا چاقو، میری جیب میں تھا۔ یہی ایک دلیل کافی ہے، لیکن دلیلیں دینے کی نوبت ہی کہاں آئی۔ میدا نے شاید واقعے کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اسے چاقو بردار کی ناپختگی کا بھی علم ہوگا۔ جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے کہا تھا، ایک اجنبی کے بجائے اڈے کے کبیدہ خاطر آدمیوں کو مطمئن رکھنا میدا کے لیے ضروری تھا۔ اسے اس وقت کوئی اندازہ نہیں ہوگا کہ بات اتنی دور جاسکتی ہے۔ یہی کچھ تو وہ آپ کی موجودی میں کہہ رہا تھا۔"

ڈاکٹر چپ رہا۔ بینا کا بے قرار سراپا ساکت ہوگیا تھا۔ اس دوران خانساماں نے کافی لا کے میز پر رکھ دی تھی۔ چند لمحے گزر گئے تو بینا نے لہکتی آواز میں خاموشی چاک کی۔ "اب تو کوئی کھٹک نہیں رہی پاپا؟ آپ کہیں تو کافی بناؤں۔ آپ لوگ بڑی عجیب قسم کی باتیں کررہے تھے۔ میں نے منتشر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

ڈاکٹر نے رسمی انداز میں بیٹی سے معذرت کی۔

پیالی میں کافی لوٹتے ہوئے بینا کہنے لگی، "پاپا کی زبانی میں یہ خوف ناک واقعہ تھوڑا بہت سن چکی ہوں، لیکن اب تو لگ رہا تھا جیسے میں وہاں موجود ہوں، چاقو کھلے ہوئے ہیں، لوگوں کی بھیڑ ہے اور ان میں میں بھی ایک گواہ ہوں۔"

"آپ تو ویسے بھی ایک خیال کار ہیں، پہلے تصور، پھر تخلیق۔ مصور تو تصور کی فراوانی ہی سے بنتا ہے۔"

"لیکن تصور کی کثرت بھی بہت تنگ کرتی ہے۔ آدمی سمتوں میں بھٹک جاتا ہے، یک سو نہیں رہ پاتا اور کہیں مطمئن نہیں ہوتا۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ قرار تو استقرار میں ہے۔ زندگی تو یوں منزلیں سر کرنے ہی میں گزر جاتی ہے۔

کافی ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اس نے خانساماں کو آواز دے کے دوسری گرم کافی لانے کی ہدایت کی اور متجسس آواز میں گویا ہوئی "پاپا کہہ رہے تھے، آپ کو چاقو بازی خوب آتی ہے۔"

"یہ کوئی ایسی فضیلت نہیں جس کا ذکر سر اٹھا کے یا اونچی آواز میں کیا جائے۔"

"برا تو نہیں مانا آپ نے۔" وہ گھبرا کے بولی۔ اس کی گھبراہٹ میں بھی کیا دل کشی تھی۔ اس نے جلدی سے وضاحت کی، "اصل میں آپ کو دیکھ کے بہت سے سوال ذہن میں کلبلاتے ہیں۔"

"مجھے اندازہ ہے، لیکن یقین کیجیے، کوئی تہ در تہ...... کوئی سر نہاں نہیں ہے۔"

"پھر بھی کچھ تو ہے، کچھ بتائیے نا۔"

"اگر سامنے کا منظر اتنا ناگوار خاطر محسوس نہیں ہورہا تو پیچھے کی جانب کیوں نظر کی جائے۔ ماضی کی راکھ میں چنگاریاں بھی چھپی ہوتی ہیں۔"

"وہ تو لگ رہا ہے۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"کیا لگ رہا ہے؟"

"چنگاریاں، گھٹائیں، داستانیں، بہت کچھ۔"

"آپ کو مصوری کے ساتھ قلم کاری بھی کرنی چاہیے۔"

"محض قیاس ہے میرا، غلط بھی ہوسکتا ہے۔"

"اور میں کہنا چاہتا ہوں، ماضی سے حال کا کتنا تعلق ہے۔ صرف حال ہی پیش نظر ہونا چاہیے۔ آدمی کا حال ماضی سے بہت مختلف ہوسکتا ہے تو پھر آنے والے وقت میں بھی کیا کچھ بدل سکتا ہے۔ آدمی تو بدلتا رہتا ہے، اور جو سامنے ہے، وہی معتبر ہے۔"

وہ دمکتی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ "آپ کو انگریزی میں اپنا مدعا بیان کرنے کی کیسی قدرت ہے۔"

"انگریزی تو آپ بولتی ہیں، رواں، سجل، شستہ، صحیح برطانوی طرز کلام، بالکل گوروں کی طرح، بل کہ ان کی اشرافیہ کی طرح۔"

وہ ہنسنے لگی، ہال میں چھنا کا سا ہوا۔ "میں انگلستان میں بہت دن رہی ہوں۔"

"وہی تو......! میں تو ہندستانی لہجے میں انگریزی بولتا ہوں۔ کبھی تو خود مجھے اپنا لہجہ بہت چبھتا ہے۔"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں۔" اس نے میری کسر نفسی یک سر مسترد کردی۔

"ان چار پانچ دنوں میں، جب سے اسپتال آنا ہوا ہے، بیش تر انگریزی سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ نرسیں، ڈاکٹر، سبھی انگریزی کے عادی ہیں۔ حالاں کہ اسپتال میں نوے فی صد سے زیادہ مریض ہندستانی ہوں گے۔ وہ جو کہتے ہیں، گٹ پٹ کرتے کرتے جبڑے دکھنے لگے ہیں، کچھ یہی حال ہوچکا ہے میرا۔"

"ہشت!" ڈاکٹر رائے نے بہت دیر بعد جھپٹتے لہجے میں مداخلت کی۔ "تم خاص کمروں کی بات کررہے ہو، یہ 'گٹ پٹ' تو انہی کمروں سے مخصوص ہے۔"

خانساماں نے تازہ کافی لا کے رکھ دی تھی۔ بینا نے عجلت کی، اس مرتبہ کافی کو ٹھنڈا ہوجانے کا ذرا سا وقت نہیں دیا۔ مجھ سے مقدار پوچھ کے اس نے شکر تحلیل کی۔ پہلے اپنے باپ کے سامنے پیالی رکھی۔ پھر میرے آگے۔ شکر نے سیاہ کافی کی تلخی خاصی کم کردی تھی۔ کافی کا گھونٹ بھر کے بینا نے گلابی ہونٹوں سے رومال مس کیا اور چہک کے بولی، "پاپا سے معلوم کیجیے، مہم جو لوگ میری کیسی کمزوری ہیں۔"

"پھر آپ اپنی تصحیح کرلیجیے، میں مہم جو قطعاً نہیں۔ مہمیں تو مجھ پر وارد ہوتی رہتی ہیں اور جبراً مجھے ان سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ کہیں خود میری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے، کہیں کسی دوسرے کی۔ میں ایک بات صاف کردوں، اڈے پاڑوں سے میرا تعلق بالواسطہ رہا ہے۔ میں اڈے پاڑوں کا آدمی نہیں ہوں۔"

"سمجھتے ہیں ہم۔" بینا کے بجائے ڈاکٹر رائے سرزنش کے انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں بڑا اپنا پن تھا۔ وہ بیٹی سے کہنے لگا، "تم محتاط رہو تو اچھا ہے۔ اندیشہ ہے، تمہارے سوالوں کے جواب میں اس نے سچ بولنا شروع کردیا تو تم سے برداشت نہیں ہوپائے گا۔ یہ کل سے مجھے مسلسل حیران کررہا ہے۔ صبح اس نے یقین سے کہا تھا کہ آج کسی وقت میدا استاد کو اسپتال آنا چاہیے۔ شام کو وہ موجود تھا۔ یہ میرے لیے ایک نیا آدمی ہے، ایک تجربہ، بل کہ ایک معما۔ پھر اس نے میدا استاد، پٹنا شہر کے سب سے بڑے بدمعاش سے جس انداز کا سلوک کیا، وہ دیدنی تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے التجا کی، "اتنا

مت کہیے۔ میری جگہ آپ ہوتے، میری طرح اس ساری صورت حال میں شامل، اور میری طرح آپ پر گزر رہی ہوتی تو آپ بھی یہی کرتے، اسی نتیجے پر پہنچتے۔"

"شاید نہیں۔ جزوی طور پر تم درست کہتے ہو۔" ڈاکٹر نے فراخ دلی سے اعتراف کیا، "میں تمہاری جگہ ہوتا تو اتنی استقامت نہ دکھا پاتا۔"

"میری استقامت کی ایک وجہ آپ بھی تھے۔ آپ نے میری بات تحمل سے سنی اور میری پاس بانی کی۔"

"تم اپنے بزرگ کو عزت و تکریم سے نواز رہے ہو۔ یہ اچھی بات ہے۔ لیکن میں نے تو بہت بعد میں یہ سارا کچھ جانا تھا۔ اس سے پہلے تو تم بہت کچھ خود ہی بھگتتے رہے تھے۔ ڈاک خانے والی گلی کا واقعہ، اکبر علی خاں کے گھر میں تمہارا داخلہ اور میدا کے اڈے پر جانے کا حوصلہ...... ان سارے مراحل سے تم گزر چکے تھے۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں نے تو سچ کی اعانت کی ہے۔ چوں کہ تم سچ بولتے رہے تھے، لیکن......" اس کی آواز بھاری ہوگئی۔ "تم نے ایک سچ نہیں بولا......"

"وہ کیا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"...... کہ مریض تمہارا اصل بھائی نہیں ہے۔"

مجھے جھٹکا سا لگا۔ کئی بار دل میں آیا تھا کہ میں ڈاکٹر پر یہ حقیقت آشکارا کردوں، لیکن کچھ تو بیچ میں اس سچ بیانی کا موقع نہیں آپایا، یا پھر کوئی دور پرے کی احتیاط مانع رہی کہ ڈاکٹر کے ذہن میں پھر کیسے کیسے سوال اٹھنے لگیں، یا پھر مجھے اس وضاحت کی ایسی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پشیمانی کے چند لمحوں بعد میں نے اس سے یہی کہنا چاہا کہ بھائی کیا، میرے تو بُھل سے بہت سے رشتے ہیں۔ وہ میرا باپ ہے، دوست، بزرگ، مربی و محسن ہے۔ وہ تو میرا آقا ہے، میرا سایہ، میرا ستون ہے۔ ڈاکٹر کی آسانی کے لیے میں نے 'بھائی' کی نسبت معین کردی تھی۔ کیا ضروری ہے کہ بھائی ہی کا رشتہ مستحکم ہو۔ بھائی تو صرف بھائی ہوتا ہے۔ کیا ڈاکٹر نے بُھل کے لیے میری نگہداری، میری تشویش، میرے اضطراب میں کوئی کوتاہی دیکھی ہے۔

میرے زبان کھولنے سے پہلے ڈاکٹر نے مجھے روک دیا۔ "جانتا ہوں، تم کیا کہو گے۔ واقعی میں نے اصل رشتوں میں بھی ایسی قربت نہیں دیکھی۔"

ڈاکٹر کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ایک ملازم نے آکے کسی انسپکٹر کی آمد کی اطلاع دی۔

"سکسینا؟ ابھی تو وہ یہاں سے گیا ہے۔"

ڈاکٹر رائے الجھ کے بولا، "اب کیا بات ہے؟"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ انسپکٹر کا دوبارہ آنا اور اس وقت آنا بے علت نہیں ہوسکتا تھا۔

بینا نے باپ کو مشورہ دیا کہ گھر میں مہمان موجود ہے، انسپکٹر کو منع کردیا جائے۔

ڈاکٹر نے اس کی بات نہیں مانی۔ ملازم منتظر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے انسپکٹر کو سبزہ زار میں بٹھانے اور کافی پیش کرنے کی تاکید کی۔

میرے لیے اب رخصت کی اجازت لے لینا ہی مناسب تھا لیکن بینا نے کچھ دیر اور ٹھیر جانے کی منت کی، ادھر ڈاکٹر کا بھی یہی حکم تھا۔

جلد آنے کا کہہ کے ڈاکٹر ہمارے پاس سے چلا گیا۔ میں اور بینا تنہا رہ گئے۔ گو میرا دماغ انسپکٹر کی ناوقت آمد کی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا، لیکن سامنے بینا تھی، ماہ جمال، خوش مقال، خوش خیال بینا۔ میں نے اپنا دھیان بٹانے اور میزبان کی خوش نودی کے لیے اس کی تصویریں اور مجسمے دیکھنے کی فرمائش کی۔ میرے اشتیاق پر اس نے خوشی کا اظہار کیا اور دن میں کسی وقت گھر آنے کی دعوت دی کہ اس کی تخلیقات کی نظارگی کے لیے دن کا وقت ہی موزوں ہوتا۔

"مجھے احساس ہو رہا ہے، میں آپ دونوں کے معمولات میں حارج ہو رہا ہوں۔"

"بالکل نہیں۔" اس نے خوش وضعی سے تردید کی۔ "پاپا تو رات گئے تک مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ پاپا ان ڈاکٹروں میں نہیں جو ایک بار ڈگری لے کے سمجھ لیتے ہیں کہ بس سب کچھ جان لیا، میدان مار لیا۔ پاپا طب کی جدید کتابوں، دواؤں اور امراض کی تازہ ترین تحقیقات سے متعلق کتب و رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ جتنے پرانے ڈاکٹر ہیں، اتنے ہی نئے بھی۔"

"لوگوں کا ان پر بڑا عقیدہ ہے۔ کہتے ہیں، کسی کسی کے ہاتھ میں شفا ہوتی ہے۔ یہاں اسپتال میں ڈاکٹر صاحب کی یہ کرامت بہت مشہور ہے۔"

"شفا تو ڈاکٹر کے علم، اس کی سنجیدگی، صحیح تشخیص، مریض سے ہم دردی، غرض اپنے کام میں دیانت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پاپا کے لیے ہر مریض یک ساں اہمیت رکھتا ہے، اور وہ اس پر پوری توجہ دیتے ہیں۔ کسی پیچیدہ مرض پر وہ دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے میں ذرا تکلف نہیں کرتے۔"

"مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک بے مثال ڈاکٹر ہیں اور آدمی بھی بہت نادر۔"

میرے اعتراف کی صداقت اس نے محسوس کی کہ اس کی آنکھوں میں شرارے نمودار ہوئے۔

"اور آپ...... آپ کیا کرتی ہیں ان اوقات میں؟" میں نے تمام تر شائستگی سے پوچھا۔

"کوئی ایک کام نہیں۔" وہ خوابیدہ سی آواز میں بولی۔ "کبھی ادھوری تصویر مکمل کرتی ہوں، کبھی گراموفون سنتی رہتی ہوں، کبھی ریڈیو، کبھی ستار بجانے لگتی ہوں، زیادہ تر کتابیں پڑھتی ہوں۔ کتاب بھی کھڑکی کی طرح ہوتی ہے، جھانکو تو کچھ نہ کچھ ضرور نظر آتا ہے، ہر بار نیا منظر۔"

"لیکن بعض کھڑکیوں کے آگے دیوار بھی پڑ جاتی ہے۔"

میری بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ وہ کھل کھلا پڑی۔ "بعض کتابیں بھی ایسی کھڑکیوں کے مانند ہوتی ہیں، یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ۔"

اس نے میری بات سے لطف لیا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا۔

"اور ایک مصروفیت تو میں بتانا ہی بھول گئی۔" اپنے مخاطب سے اس کے تکلم کا کلف اب کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ کہنے لگی، "کبھی کسی چیز میں جی نہیں لگتا تو پاپا کے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔ انہیں دیکھتی رہتی ہوں۔ ان سے زندگی سیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ بھی کتاب چھوڑ کے مجھ سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ طب کی کتابوں کے علاوہ پاپا کو ادب کا بھی اچھا ذوق ہے۔ دنیا کے مشہور ناول، کہانیاں پڑھنے کے لیے جانے کیسے وقت نکال لیتے ہیں۔"

"آپ اپنے پاپا سے بہت محبت کرتی ہیں۔"

"وہ میرے دیوتا ہیں، میرے باپ اور ماں بھی۔"

"اور آپ کی والدہ......؟"

"وہ اب نہیں ہیں ہمارے درمیان۔" وہ اداس ہوگئی۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا تو بولی، "تعلیم مکمل ہوگئی تھی، لیکن آرٹ پر کچھ اور پڑھنے کا ارادہ تھا۔ پاپا کی تنہائی کا سوچ کے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے یہاں چلی آئی۔"

"اب آپ کا یہاں دل لگتا ہے؟"

"یہ میرا وطن ہے۔ یہاں میرے پاپا رہتے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ میرے بارے میں سوال کرنے لگتی، میں نے انگلستان کی زندگی کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے دیکھا تھا، لوگ کتنے ہی گوروں سے ناراض، ان کے دشمن ہوں، انگلستان کے نظم و ضبط کی مدح و ثنا کرتے نہیں تھکتے۔ پھر تو جیسے بینا کو موضوع مل گیا۔ ایک دریا رواں ہوگیا۔ وہ پٹر پٹر باتیں کرنے لگی۔ میرے کان ڈاکٹر کی واپسی کی آہٹ کے منتظر تھے۔ میں نے کوشش کی کہ بینا کو میری بے چینی کا احساس نہ ہو پائے۔ یوں اس کی

قربت ہی کچھ کم سحر ناک نہیں تھی۔ کاش، انسپکٹر کی آمد سے یہ رخنہ اندازی نہ ہوتی۔ بعض لوگ بھی رنگا رنگ منظر کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ انگلستان میں ایک عرصہ گزار کے آئی تھی اور گوروں کی علوم وفنون سے دل چسپی، کام کی لگن، وقت کی پابندی، نفاست اور سلیقے سے بہت متاثر تھی، لیکن کہہ رہی تھی، یہاں اپنے وطن کی بے اطواری، بے سلیقگی میں بھی ایک رنگ ہے۔ میں نے اس سے بحث نہیں کی کہ اس نے یہاں کیا دیکھا ہوگا۔ یہاں تو بہت اندھیرے ہیں۔ اس نے یہاں کی غربت اور اس کے عذاب کہاں دیکھے ہیں، اور جہالت تو سب سے بڑی غربت ہے۔ ہندستان تو اب اپنی جہالت کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں تو سنتا رہا، اور میری خوش سمعی سے وہ مہمیز ہوتی رہی۔

''آپ آئیں گے نا پھر؟'' اس نے حسرتی لہجے میں کہا۔

''جب تک یہاں ہوں، آتا رہوں گا۔ آپ بلائیں گی اور ڈاکٹر صاحب کا حکم ہوگا تو کیوں نہ آؤں گا۔''

''آپ سے مل کے عجیب سا احساس ہوا۔ بہت دنوں بعد کوئی......''

ڈاکٹر کی آمد پر جیسے کسی خواب سے آنکھ کھل گئی۔

ڈاکٹر کا چہرہ دیکھ کے اندازہ ہوگیا کہ انسپکٹر سکسینا نے اس سے کچھ خوش گوار باتیں نہیں کی ہیں۔ ڈاکٹر کو گئے دیر بھی خاصی ہوگئی تھی۔ میں نے اسے سانس لینے کا وقت دیا، پھر پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''ہاں، ہاں۔'' اس کے تیور کسی حد تک مغائرانہ تھے، معاندانہ نہیں۔ ''یہ ٹھاکر بستی کا کیا قصہ ہے؟'' اس نے ناگواری سے پوچھا۔

میں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔

میری خاموشی پر وہ ڈپٹ کے بولا ''چپ کیوں ہو؟''

''سوچ رہا ہوں، کیا بتاؤں آپ کو۔ اس کا مطلب ہے، فیض آباد پولیس سے ان کا رابطہ ہو چکا ہے۔''

''سکسینا یہی بتانے آیا تھا۔''

''اور اس نے خواہ مخواہ آپ کو تنگ کیا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے یہی کچھ ہوگا کہ فیض آباد پولیس ٹھاکر بستی میں ہونے والے قتل وخوں کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی۔''

''ایسا ہی کچھ کہا اس نے۔''

''تو آپ اتنے فکر مند کیوں ہو رہے ہیں۔ اڈے پاڑوں سے متعلق لوگوں پر سنگین الزامات عائد ہوتے رہتے ہیں۔ کیا میں اور بھائی ٹھاکر بستی کے حادثے میں فیض آباد پولیس کو مطلوب ہو گئے ہیں؟''

''اس نے یہ کچھ نہیں کہا۔''

''تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں، اگر آپ سننا چاہتے ہیں۔''

''میں...... میں جاننا چاہتا ہوں۔''

میں نے اسے بتایا کہ فیض آباد میں قیام کے دوران ایک روز بازار میں اڈے سے وابستہ ہریانامی آدمی پر زیادتی ہوتی دیکھ کے مجھ سے رہا نہیں گیا، مجھے دخل دینا پڑا۔ یہی ایک واقعہ ہم پر پولیس کے شک کی بنیاد بنا۔

فیض آباد کے قریب واقع ٹھاکر بستی میں ایک خاندانی جاگیر دار ٹھاکر ہر دیو کی علاقے بھر میں دہشت، اس کے بدکار بیٹے ٹھاکر بل دیو کی فیض آباد میں مقیم ایک نوجوان، حسین وجمیل، تعلیم یافتہ اور آسودہ حال لڑکی برکھا پر فریفتگی اور شادی کے لیے پیام۔ برکھا کے باپ کے انکار پر ٹھاکر بل دیو کا عتاب، برکھا کا اغوا اور اڈے کے آدمی کے آڑے آجانے پر ناکامی، انتقاماً اڈے کے دو آدمیوں کا قتل، دوسری کوشش میں برکھا کے گھر پر حملہ، دو ملازموں کی ہلاکت اور برکھا کا اغوا، اور

دوسرے تیسرے روز گھر کے قریب برہنہ اور شکستہ لاش کی صورت میں برکھا کی بازیابی، صدمے سے باپ کے حواس معطل، چند دنوں بعد ایک رات ٹھاکر بستی کی پامالی، ٹھاکروں کی ساری حویلی، کھیت کھلیان نذر آتش، ٹھاکر، خاندان کے دیگر افراد، ملازمین اور مصاحبین پر مشتمل بیالیس آدمیوں کی موت، اڈے کے دو آدمیوں کی ہلاکت سے ہم پر پولیس کے شک کی پختگی، حادثے کی تفتیش کے لیے پولیس کے بڑے بڑے افسروں کی تعیناتی، کوتوالی میں میری، بٹھل اور اڈے کے سارے آدمیوں کی طلبی، سوال جواب اور کوئی ثبوت نہ ملنے پر کوتوالی سے ہماری بہ عافیت واپسی کا سارا واقعہ ڈاکٹر کی شرح صدر کے لیے مجھے سنانا پڑا۔

دونوں باپ بیٹی سن سے ہوگئے۔ بینا کے چہرے کی چمپا زرد پڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر بھی گنگ بیٹھا رہا۔ ان کے عالم حیرت کی ایک وجہ مجھ پر ان کا اعتبار تھا۔ نہ میں کسی غلط بیانی کا مرتکب ہوں گا نہ کسی مبالغے کا۔

میں نے ڈاکٹر کو بتایا، پولیس کے اطمینان کی خاطر ہم نے فیض آباد میں قیام کی مدت بڑھا دی۔ سترہ اٹھارہ روز بعد ہم نے از خود کوتوالی حاضری دے کے پولیس افسروں کو فیض آباد سے اپنی روانگی سے مطلع کیا۔ انہوں نے ہمیں نہیں روکا۔ تاہم ہم نے اپنی جانب سے انہیں یقین دلایا کہ اس خوں ریزی میں ہمارے عمل دخل کا کوئی اشارہ انہیں ملے تو ہم کہیں ان سے دور نہیں ہوں گے۔ پولیس، فیض آباد میں ہمارے گھر، یا کلکتے کے اڈے پر طلبی کا پیغام بھیج دے۔ ہم جہاں کہیں ہوں گے، فیض آباد پہنچ جائیں گے۔

''مگر ٹھاکروں کی بستی میں کس نے آگ لگائی؟'' ڈاکٹر کی آواز دھڑک رہی تھی۔

''کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ٹھاکروں نے گرد ونواح میں جانے کب سے بہت تباہی مچائی ہوئی تھی۔ کسی کی عزت آبرو محفوظ نہیں تھی۔ ظاہر ہے، انہوں نے بہت سے دشمن پیدا کر لیے ہوں گے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو؟''

''میں نے اس پر بہت غور کیا تھا، ہر پہلو سے اور میں آپ کو بتاؤں، مجھے بٹھل بھائی پر بھی شبہ ہوا تھا۔ شبہے کی وجہ وہی تھی جو پولیس کی تھی۔ ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آتی تھی۔ ٹھاکر بل دیو کو فیض آباد میں ہماری موجودی اور شہر کے اڈے کی پشت پناہی کا علم یقیناً ہوگا۔ اڈے کے بعض آدمیوں کو ہمارے گھر آنے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ یہ خدشہ رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی دن ٹھاکر بل دیو اپنے زور واثر کے نشے میں ہمارے گھر کو نشانہ نہ بنا دے، لیکن پولیس کی طرح میرے پاس بھی کوئی گواہی نہیں تھی۔ جس رات یہ واقعہ ہوا، ہم سب فیض آباد میں تھے۔ میں مسلسل بٹھل بھائی کے ساتھ تھا۔ پولیس کو شہر میں ہماری موجودی کی ساری شہادتیں مل گئی تھیں۔''

''بیالیس آدمیوں کی موت، اتنا سنگین واقعہ! کوئی نقش، نشان، کوئی علامت نہیں۔'' ڈاکٹر کی حیرت بے جواز نہیں تھی۔

''تفتیش کے لیے گورے افسر بھی آئے تھے۔ انہوں نے تو حادثے کی جگہ کا معائنہ بھی کیا تھا، مگر سنا ہے، سب کچھ خاکستر، کھنڈر ہو چکا تھا۔''

''صبح سویرے اکبر علی خاں کے قتل کی جگہ پہ تین لاشیں پائی گئیں۔ گمان ہے، انہی تین آدمیوں نے اکبر علی خاں کا خون کیا تھا۔ کسی نے انہیں ان کے انجام تک پہنچا دیا۔ پولیس کو کوئی ثبوت نہیں ملا۔ میدا اپنے اڈے پر آرام سے بیٹھا ہوا ہے، اس کے ساتھی بھی۔ ٹھاکر بستی اور یہاں، پٹنے کے واقعے میں تمہیں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی؟'' ڈاکٹر رائے بگڑے تیوروں سے بولا ''یاد ہے، تمہی نے کہا تھا کہ ان تین آدمیوں کے قاتلوں کی گرفت آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر یہ میدا اور اس کے ساتھیوں کا کام ہے تو انہوں نے اپنی گردنیں محفوظ کر لینے کی

ہر تدبیر کرلی ہوگی، یعنی میدا نے یہ کام کسی اور کو سونپا ہوگا۔"

"جی ہاں۔" میں نے اقرار کیا۔ "یہی کہا تھا میں نے اور کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔"

"پھر...... پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ ٹھاکر بستی میں تمہارے۔" ڈاکٹر نے اپنی بات خود ہی ادھوری چھوڑ دی، کیوں کہ اسے میرا جواب معلوم ہوگا۔ وہ خاموش ہوگیا۔

میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا، "انسپکٹر سکسینا کو اس وقت یہاں آنے کی ایسی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ آپ کو ابھی اس سے باخبر کرنا لازم ہو۔"

"وہ نہیں آیا تھا۔" ڈاکٹر نے ترشی سے کہا، "اسے ڈی آئی جی نے بھیجا تھا۔ وہ تمہاری نقل وحرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ تم اس وقت میرے گھر پہ ہو۔ انسپکٹر سکسینا ڈی آئی جی کی طرف سے مجھے متنبہ کرنے آیا تھا کہ تم پر اور تمہارے بھائی پر اتنی شدید نوعیت کے الزامات ہیں۔"

"محض الزامات نا!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کاش، الزامات ہی رہیں۔"

"آپ کا دعائیہ لہجہ شک سے آلودہ ہے۔"

"نہیں نہیں۔" ڈاکٹر کا لہجہ مدافعانہ ہوگیا۔

"پولیس کے پاس فضول قسم کے کام بہت ہوتے ہیں۔"

"ہاں پاپا، کیا غلط ہے، دیکھیے نا پولیس افسر نے ہماری ایک خوب صورت شام بل کہ رات منتشر کردی۔" بینا نے دبے لہجے میں باپ سے شکایت کی "میں اسی لیے آپ کو منع کررہی تھی۔"

"پھر تم ٹھاکر بستی کے اس عبرت ناک واقعے سے محروم رہ جاتیں۔" ڈاکٹر کی آنکھوں میں خاصی دیر بعد آسودگی نمودار ہوئی۔

"یہ بہت سنسنی خیز تھا۔" بینا نے جھرجھری لے کے کہا، "ناقابل یقین۔"

"مجھے شبہ ہے، اس قسم کے کتنے واقعات اس کے سینے میں دفن ہوں گے۔"

ڈاکٹر کی قیاس آرائی میں طنز کی رمق دانستہ نہیں تھی۔ دانستہ بھی ہوتی تو میں کیا کرسکتا تھا۔ "ان پر مٹی ہی پڑی رہنے دیجیے۔" میں نے پژمردگی سے کہا۔

"دیکھا!" ڈاکٹر نے اچھل کے بیٹی کو مخاطب کیا، "یہ کیسا مختلف نوجوان ہے، اور بھی...... اور بھی ایسے واقعات سے اس کا سابقہ پڑا ہے۔"

"میرے لیے تو یہ دریافت کی حیثیت رکھتے ہیں۔" بینا بے اختیار سی ہو کے بولی۔

"میرا خیال ہے، اب مجھے چلنا چاہیے۔" میں نے مسکرا کے کہا، "رات بھی بہت ہوگئی ہے۔"

"بیٹھیے نا، کچھ دیر اور۔" وہ اٹھلاتی آواز میں بولی اور باپ کی طرف حمایت طلب نظروں سے دیکھا۔ "کیوں پاپا! ایک کافی اور نہ ہوجائے...... کافی یا کچھ اور......"

کھانا کھائے وقت ہو چکا تھا۔ بینا اٹھ کے ہال سے باہر چلی گئی۔ خانساماں شاید کہیں قریب ہی تھا کہ وہ فوراً واپس آگئی اور تیز سانسوں سے بولی، "کیا آپ نے ابھی ٹھاکر بستی...... جس جگہ کا یہ واقعہ بتایا ہے، دوسری جگہوں پر بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟"

"یہ کیا، اس سے بڑی حقیقتیں ہیں۔ یہاں صرف گوروں کی حکومت نہیں، بے شمار حکم راں ہیں یہاں، دولت مند، زمیں دار، جاگیر دار، نوابین۔ باقی خلقت تو ان کے پالتو جانوروں کی طرح ہے، ان کے گھوڑوں، ان کے کتوں کی طرح۔ باقی سارے ان کی رعیت ہیں، ان کے غلام۔ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔" میں نے خود کو تھاما اور اپنے لہجے کی تلخی پر معافی مانگی۔

"میں...... میں پاپا، آپ سے کیا کہتی ہوں۔"

بینا جوشیلے انداز میں بولی، ''یہ وہی بات کر رہے ہیں۔ یہاں تو دو قسم کے آدمی رہتے ہیں، ایک حاکم، ایک محکوم، آقا اور غلام۔ نواب راجا لوگ وہاں بھی بہت ہیں، لیکن ایسا کچھ، یہاں جیسا کچھ نہیں۔''

''وہ ایک اور دنیا ہے۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں بے چارگی سی تھی۔ ''وہ تین صدیوں سے جاگ رہے ہیں۔''

''اور ہم......؟ ہم سوتے رہے ہیں۔'' بینا تڑاق سے بولی۔

''نہ سو رہے ہیں، نہ جاگ رہے ہیں۔'' ڈاکٹر نے اداسی سے کہا، ''ہم کچھ تھک سے گئے ہیں۔ قوموں پر تکان، اعصاب شکنی اور غنودگی کے یہ دور آتے رہتے ہیں۔''

خانساماں نے بہت عجلت کی۔ کافی کے ساتھ انگریزی بسکٹ، خشک میوہ اور دال موٹھ وغیرہ کے لوازم بھی تھے۔ کافی ختم کر کے میں اٹھ گیا۔ پھر انہوں نے مجھے نہیں روکا۔

ہم ہال سے باہر آ گئے۔ ہلکی سی ٹھنڈی ہوا پر رات کی رانی کا راج تھا۔ دونوں میرے ساتھ دروازے تک بڑھتے اور مجھے شرمندہ کرتے رہے۔ دروازے پر آ کے بینا نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایک لحظے کے لیے جی میں آیا کہ اس کے ہاتھ کو بوسہ دوں، دوسرا لمحہ بہ ہر حال میرے اختیار میں آ گیا۔ مصافحہ کرتے ہوئے اس کی مخروطی انگلیوں کی گرفت سے اس کی سرخوشی جھلک رہی تھی۔ مجھ سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے کے وہ دروازے سے لوٹ گئی، لیکن ڈاکٹر رائے میرے ساتھ باہر آ گیا۔ میں نے اس سے واپس چلے جانے کی عاجزی کی۔

''کچھ چہل قدمی ہو جائے گی۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

ہماری رفتار سست تھی۔ چند قدم آگے جانے پر میں نے خاموشی توڑی اور رکی رکی آواز میں کہا، ''بینا، آپ کی صاحب زادی تو بہت لائق ہیں۔ ان کا کام بہت متاثر کرتا ہے۔''

''اس میں بہت سے گن ہیں۔''

''وہ تو کوئی شہزادی ہیں۔''

''حالاں کہ باپ بادشاہ نہیں۔'' وہ ہنس کے بولا۔

''باپ کا درجہ بادشاہوں سے بلند ہے، باپ تو ایک مسیحا ہے، باپ تو ایک فرشتہ ہے۔''

''اوہ، نہیں نہیں، اتنا مت کہو۔'' وہ ناراض ہونے لگا۔

''میں جو سمجھتا ہوں، جو میں نے دیکھا ہے، وہی کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اصرار کیا۔

''ہم کیا بات کر رہے تھے؟'' اس نے اپنے ذکر سے اجتناب کے لیے موضوع بدلنا چاہا۔

''آپ شہزادی کی بات کر رہے تھے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں، میں کہہ رہا تھا، میرے لیے وہ یہاں آ گئی ہے، لیکن کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، اس نے اپنے آپ سے زیادتی کی ہے۔ اسے یہاں بہت گھٹن بھی ہوتی ہوگی۔''

''وہ تو بہت خوش دکھائی دیتی تھیں۔''

''گھر میں کم لوگ آتے ہیں اور بہت کم لوگوں میں اس کا جی لگتا ہے۔ بیش تر اکیلی ہی رہتی ہے۔ تمہارے آنے سے خاصی کھلی کھلی لگ رہی تھی کیوں کہ تم اس کے لیے دوسروں جیسے نہیں تھے، ایک بہت نئے آدمی، ہرا اعتبار سے۔''

''میں کیا......'' میرے شانے سکڑ گئے۔

''آپ جب انسپکٹر سے ملنے باہر چلے گئے تھے تو میری ان سے خوب باتیں ہوئیں ان کے لیے تو سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ وہ اپنے پاپا کے پاس ہیں۔''

''وہ بڑی پگلی ہے۔ سوچو، کب تک میں اس کے ساتھ رہوں گا اور کب تک وہ میرے ساتھ رہ

سکے گی۔ اسے اپنا گھر تو بسانا ہوگا، بسانا چاہیے۔''

''جی ہاں۔'' میں نے ہچکچا کے کہا۔ ''لڑکیوں کے ساتھ یہ کچھ عجب ہے، ان کا گھر بدل جاتا ہے۔''

''پہلے تو شادی ہی سے انکاری تھی۔ کہتی تھی، میں تو آپ کے ساتھ رہوں گی۔ کیا ضروری ہے کہ ہر لڑکی کی شادی ہوا کرے۔ بعد کو میرے سمجھانے بجھانے پر آمادہ ہو گئی۔ پھر یہ شرط عائد کی کہ میں بھی اس کے ساتھ رہوں گا۔ میں نے ہامی بھر لی کہ پہلے وہ اپنے گھر کی تو ہو جائے بعد کو دیکھا جائے گا۔''

''پھر کیا ہے۔ اب تو وہ راضی ہو گئی ہے۔ کوئی ایسا خوش قسمت تلاش کر لیجیے جو آپ کے ساتھ رہ سکے۔''

''لیکن کوئی اسے پسند تو آئے۔ تم نے تو اسے دیکھا ہے، کیسی نفیس طبع، نادرہ کار اور ندرت پسند لڑکی ہے۔ اسے چیدہ چیدہ چیزوں کی عادت ہے۔ کلکتے میں کچھ عزیز رہتے ہیں۔ ان کے نہایت لائق بیٹوں سے ملوایا تھا میں نے اسے۔ اس نے انکار کر دیا۔ میں نے اسے آزادی دی تھی کہ پھر اپنے لیے خود کوئی لڑکا منتخب کرے۔ لندن میں ایک عرصے رہی، وہاں بھی اسے کوئی نہ بھا سکا...... تمہیں ایک دل چسپ بات بتاؤں۔''

''جی......'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''جب مسلسل کئی لڑکے مسترد کر چکی تو تنگ آ کے سارا بار مجھ پر ڈال دیا کہ جو مجھے پسند آ جائے، وہ اسے قبول کر لے گی۔''

''تو سب کچھ اب آپ پر منحصر ہے۔''

''اور ظاہر ہے، مجھے بھی اس کے مزاج، رجحان، طبیعت کا خیال رکھنا ہوگا۔''

''جی ہاں، پھر تو بات وہی کچھ رہی۔''

''وہ بڑی تیز ہے، اسے معلوم ہے، اس کا باپ بھی پسند ناپسند میں کچھ کم حجت نہیں کرتا۔ تم بھی کچھ میری مدد کرو۔''

''جی...... جی ہاں۔'' میں نے تذبذب سے، کہا۔

کوٹھیوں کے علاقے کی چار دیواری قریب آ گئی تھی۔ سامنے دروازہ تھا۔ ڈاکٹر رائے ٹھیر گیا۔ میں بھی رک گیا۔

''تم سفر کرتے رہتے ہو۔ کوئی ایسا نوجوان جو ایسا ہی پر خیال، عزم و حوصلے میں یک تا، پڑھا لکھا، ہوش مند، کچھ تمہارے جیسا......'' اس نے سر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا اور گھر کی طرف واپس ہو پڑا، اور ابھی قدم دو قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ پلٹ کے بولا، ''اور وہ...... وہ تم بھی ہو سکتے ہو۔''

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

ڈاکٹر آہستہ قدموں سے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے اپنے حواس کی درستی پر شبہ ہوا اور جی میں آیا، اس کا تعاقب کروں یا اسے آواز دوں کہ کیا اس نے یہی کہا ہے جو میں نے سنا ہے۔

مجھے یہاں لانے والا ڈاکٹر کا ملازم کچھ فاصلے پر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے لوٹ جانے کے بعد وہ میرے قریب آ کے ٹھہر گیا اور منتظر رہا کہ کب میں اس کے ساتھ چلتا ہوں مگر میرے قدم تو زمین نے جکڑ لیے تھے۔

جانے کیوں مجھے گمان تھا کہ ڈاکٹر مڑ کر مجھے دیکھے گا لیکن وہ دور ہوتا گیا اور ہیولا سا نظر آنے لگا۔

''چلیں صاحب!'' مجھے بے حس و حرکت دیکھ کے ملازم نے دبی آواز میں ٹوکا۔

میں نے اضطراب سے سر ہلایا اور سٹپٹاتے ہوئے پلٹ کے دروازے کی طرف چل پڑا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور میرے جسم و جاں میں شور مچا ہوا تھا۔ چند قدم بعد اسپتال کی چار دیواری آ جاتی تھی۔ اسپتال کے اس حصے پر تعینات مستعد دربان نے چند لمحوں کے تامل کے بعد پھاٹک کھول دیا۔ سپاہیوں کے انداز میں اس نے مجھے سلام کیا

تھا۔ مجھ سے کوئی جواب دیا جا سکا نہ ہاتھ ہلایا جا
سکا۔ سامنے اسپتال کی عمارتیں سکوت میں ڈوبی
ہوئی تھیں۔ راہ داریوں اور مختلف وارڈوں کے
درمیان پھیلی ہوئی سڑکوں اور سبزہ زاروں پر نصب
روشنیاں ہلکی ہلکی کہر میں ٹمٹما رہی تھیں۔

ڈاکٹر رائے کا خدمت گار میرے ساتھ ساتھ
چلتا رہا۔ کمرا نزدیک ہی تھا۔ مجھے اسے لوٹا دینا
چاہیے تھا لیکن اس کی ہمراہی میں کوئی سہارا سا
محسوس ہو رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے
دروازے پر ٹھہر کے میں نے غیر ارادی طور پر مصافحے
کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ بوکھلا گیا۔ مجھے خیال نہیں
رہا تھا کہ خدام اس عزت افزائی کے عادی نہیں
ہوتے۔ وہ سرتاپا لہرا گیا اور جسم خم کر کے اس نے
مجھے تعظیم دی تو الٹی مجھے پشیمانی ہوئی۔

نرس ایمی جاگ رہی تھی۔ میری آہٹ سن کر
لپکتی ہوئی باہر آ گئی۔ ایک لمبی سانس کھینچنے کے بعد
وہ پلکیں جھپکنے لگی۔ "بہت دیر کر دی تم نے۔" وہ
شکایتی لہجے میں بولی۔

"بس" میں نے سر جھکا کر ناتوانی سے کہا۔
"وقت کا کچھ احساس ہی نہیں رہا۔"

"کیسا رہا؟" وہ اشتیاق سے بولی۔

"بہت اچھا" میں نے بے ربطی سے کہا۔

"اوہ شکر ہے۔" وہ جھرجھری لے کر بولی،
"مجھے تو طرح طرح کے وہم آ رہے تھے۔"

"کیوں...... کیسے وہم؟" میں نے تندی سے
پوچھا۔

"کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو کہیں۔ میں نے تمہیں
بتایا تھا، ڈاکٹر رائے بہت کم کسی کو اپنے گھر بلاتے
ہیں۔ یہ تو بڑی ان ہونی قسم کی بات تھی، خصوصاً
تمہارے لیے۔" ایمی جھجکتے ہوئے بولی۔ "ان
حالات میں جو تین چار دن سے پیش آ رہے ہیں،
تمہاری حیثیت کسی سوالیہ نشان کی سی ہو گئی ہے۔
ویسے بھی ڈاکٹر اور تمہاری شناسائی کو وقت ہی کتنا
گزرا ہے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں کمرے میں
آ گئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظریں
بے اختیار بھل کے بستر پر گئیں اور جیسے کسی خواب
سے آنکھ کھل جائے میں نے اضطراری آواز میں
پوچھا۔ "کیا حال ہے ان کا؟"

"بالکل ٹھیک۔" ایمی فراخ دلی سے بولی۔
"درمیان میں دو ایک بار آنکھ کھلی تھی، تمہیں پوچھ
رہے تھے۔"

"تم نے کیا کہا پھر؟"

"میں نے بتا دیا کہ تمہیں ڈاکٹر رائے نے گھر
پہ بلایا ہے۔ کچھ تو کہنا تھا مجھے۔ میں نے بتا دیا کہ
ڈاکٹر نے تمہیں کھانے پر بلایا ہے۔ یہ واضح کرنا
ضروری تھا، کہیں کوئی اندیشہ، وسوسہ مریض کے
دماغ میں نمو نہ پالے۔ بیماری بہت حساس کر دیتی
ہے۔" ایمی سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "خاصی دیر
تک جاگتے رہے پھر میں نے سیب کی چند قاشیں
کھلائیں، دوائیں دیں، سو گئے۔ خون کا دباؤ،
حرارت وغیرہ دیکھی تھی میں نے۔ سب کچھ معمول
پر ہے۔ بہ ظاہر فکر کی کوئی بات نہیں۔"

صوفے پر بیٹھ کے میں نے اپنا بکھرا ہوا جسم
سمیٹنے کی کوشش کی۔ ایمی بھی میرے برابر بیٹھ گئی۔
لمحوں تک خاموش رہی پھر اپنے گرم ہاتھ سے میری
گدی سہلاتے ہوئے وہ بولی۔ "کچھ کھوئے
کھوئے سے لگتے ہو۔"

"نہیں تو......" میں نے تنی ہوئی آواز میں کہا۔

"نیند آ رہی ہے؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔" میں نے اپنا جسم سیدھا
کر لیا۔ وہ نیند کو پوچھ رہی تھی۔ نیند تو بڑی مشروط
ہوتی ہے۔

"کیا ہوا وہاں؟" وہ مچل کے بولی۔

"کیا ہوتا؟" میں نے کسمسا کے کہا۔

"کیا کیا باتیں ہوئیں؟"

"دنیا بھر کی، ادھر ادھر کی۔ بہت سی باتیں۔"
میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ میں ایمی کو کیا بتاتا۔

"کیسا لگا ڈاکٹر کا گھر؟"

"وہ تو کوئی نگار خانہ ہے۔"

"ہاں، بے شک۔" عمر رسیدہ ایمی بچوں کی
مانند ہمکنے لگی۔ "کوئی نگار خانہ یا عجائب خانہ...... مگر
تمہیں سارا گھر دیکھنے کا موقع کہاں ملا ہو گا۔"

"تھوڑا بہت جتنا دیکھا وہی بہت مختلف اور
منفرد تھا بہت......" میری آواز کھو سی گئی۔

"تم نے غور کیا، کیسا تناسب و توازن ہے اس
گھر میں۔ ہر چیز جہاں رکھی ہے، جیسے اسی جگہ کے
لیے بنی ہو۔ اس طرح کے اکثر گھروں میں بڑی
نادر چیزیں ہوتی ہیں لیکن ایک سلیقہ بھی تو چاہیے۔
بعض جگہوں پر تو چیزیں تھوپی ہوئی، ابلی ہوئی لگتی
ہیں۔ جتنے نفیس ڈاکٹر رائے ہیں۔ اتنا ہی اعلیٰ ان کا
ذوق ہے...... اور جب سے بینا انگلستان سے آئی
ہے، گھر کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ بینا تمہارے
سامنے آئی تھی؟"

"ہاں آں۔" میں نے ہچکچا کے اقرار کیا۔

"دیکھا تم نے اسے۔ کیسی ترشی ہوئی، سانچے
میں ڈھلی ہوئی لڑکی ہے، شگفتہ، شائستہ......
ہزاروں، بلکہ میں تو کہوں گی، لاکھوں میں
ایک......"

میں نے آنکھیں میچ لیں۔

"کیسی لگی وہ تمہیں؟"

"بہت اچھی، تم ٹھیک کہتی ہو، وہ بڑی نادر لڑکی
ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "ڈاکٹر رائے کی
بیٹی شاید کچھ ایسی ہی ہونی چاہیے تھی۔"

"ارے مت پوچھو۔" ایمی بے تاب سی ہو گئی۔
"میں تو اس کی عاشق ہوں۔ ذرا سا بھی تکبر نہیں
اس میں۔ جب بھی جاتی ہوں، بہت خوش ہوتی ہے
اور میں...... میں تو اسے بس دیکھتی رہتی ہوں۔ جی
کرتا ہے آنکھوں میں بسا لوں۔ کبھی لمبا وقفہ ہو
جائے تو شکایت کرتی ہے۔ باپ سے کہلوا کر بلاتی
ہے۔ جس گھر میں جائے گی بہاریں بکھیر دے گی۔
وہ تو ایک گلستان ہے۔ سوچتی ہوں، کون خوش
نصیب ہو گا جس کے گھر اور دل کی زینت بنے گی۔
کوئی شہزادہ ہی ہونا چاہیے اس کے لیے۔"

"ہاں ہاں۔ وہ خود کسی شہزادی سے کیا کم ہے۔"

"تم بتاؤ تم نوجوان آدمی، سچ کہنا، تم اس کے
سحر کے اسیر نہیں ہوئے؟ ہیں نا!" ایمی مجھے ٹہوکا
دیتے ہوئے بولی، "لگتا ہے، کچھ ایسا ہی ہے جبھی چپ
چپ ہو۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔" میں نے زیر و زبر
آواز میں کہا اور پہلو بدلا۔

"سچ بتاؤ، تم نے نہیں چاہا کہ تم اس کے پاس
بیٹھے رہو۔ تم سونے کی اس مورتی کو دیکھتے رہو، اس
کے پہلو میں، اس کی روشنی اور گداز میں زندگی بسر
کر دو...... سچ بتانا۔"

"میں نے ایسا کچھ خیال نہیں کیا۔" میں نے تلخی
سی کہا، "حسین لوگ بھی حسین مناظر کی طرح ہوتے
ہیں۔ ان کی نظارگی اور دید و باز دید کے لیے کس کا
جی نہیں چاہتا...... مگر تم کچھ زیادہ ہی اس سے متاثر
ہو۔"

"وہ ہے ہی ایسی...... اور یہ تم کیسے نوجوان
ہو۔"

"کیوں، مجھے کیسا ہونا چاہیے۔"

"تمہیں تو آہیں بھرتے ہوئی واپس آنا چاہیے
تھا۔" وہ شوخی سے بولی۔

"آدمی کو اپنے آپ کو پہچاننا چاہیے۔"

"تم...... تم کیا کسی سے کم ہو۔ میں تو زندگی بھر
بیٹے کی آرزو کرتی رہی۔ دو بیٹیاں ہوئیں، ایک
زندہ نہ رہ سکی، دوسری اپنے گھر کی ہو گئی اور دور چلی
گئی، لیکن اگر میری کسی بیٹے کی خواہش تھی جو خداوند
نے پوری نہیں کی تو وہ کوئی تمہی جیسا تھا۔" وہ افسردہ
ہو گئی۔

''اوہ۔'' میں نے اپنا بازو اس کے شانوں پر پھیلا دیا۔ ''مجھے بھی تم اپنا بیٹا سمجھ سکتی ہو۔ مجھے بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔'' میں نے وارفتگی سے کہا۔ ''تم جیسی ماں کسی بھی بیٹے کے لیے فخر کا باعث ہونی چاہیے۔''

اس نے میرے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے دوبارہ بینا کا ذکر چھیڑ دیا۔

''تم بینا کی بات کر رہی تھیں۔ وہ واقعی ایک شاہ کار لڑکی ہے۔''

''اور ایک بہت تنہا اور غریب لڑکی بھی۔'' وہ اداسی سے بولی۔

''کیوں، ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟''

''بہت زیادہ حسین اور بہت زیادہ لائق لوگ عموماً تنہا ہو جاتے ہیں، لیکن بینا سے وقت نے مذاق بھی کم نہیں کیا ہے۔''

''ایسی کیا بات ہے؟''

''تمہیں کیا معلوم، اس کی ماں نے اپنی بیٹی کی زندگی کیسی اجیرن کی ہے۔''

''ہاں، وہ کہہ رہی تھی کہ اس کی ماں اب اس دنیا میں موجود نہیں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''موجود نہیں؟ ہاں، اس نے ٹھیک ہی کہا۔'' ایمی تیکھے لہجے میں بولی۔ ''اس کے لیے تو واقعی موجود نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''لمبی کہانی ہے میرے بچے!'' ایمی گرفتہ آواز میں بولی، ''اس کی ماں خوب زندہ ہے اور بہت زندہ ہے لیکن اس نے سب سے رشتہ توڑ لیا ہے۔ وہ ان سب کے لیے مر چکی ہے۔''

ایمی نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر رائے کا ایک دوسرا گھر انگلستان میں بھی ہے، اس زمانے سے، جب ڈاکٹر انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کے دو بڑے بیٹوں نے بھی وہیں تعلیم حاصل کی اور دونوں گوری لڑکیوں سے شادی کر کے وہیں کے ہو رہے بعد کو ایک بیٹا امریکا میں جا بسا۔ ان کی ماں کامنی زیر تعلیم بچوں کی وجہ سے بیشتر انگلستان میں رہنے لگی تھی۔ یوں بھی ایک عرصے سے سارے خاندان کا کثرت سے وہاں جانا ایک معمول تھا۔ بینا سب سے چھوٹی تھی اور ابھی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہی تھی کہ کامنی کی ملاقات کسی لارڈ سے ہوئی۔ بہت بڑی جائیداد تھی۔ دارالامرا کا رکن بھی رہا تھا۔ نوادر کا شوقین، فنون لطیفہ سے گہرے شغف کی وجہ سے انگلستان کے امرا میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔

کامنی بھی مصوری اور موسیقی کی دلدادہ تھی، مشرقی حسن کی مثال، اپنی بیٹی کی طرح بے حد حسین، نازک اندام عمر گزرنے کے بعد لارڈ نے شادی نہیں کی تھی۔ کامنی سے ملا تو اس کا شیدائی ہو گیا۔ کامنی کے حق میں ساری جائیداد سے دست بردار ہو گیا۔ کامنی نے ڈاکٹر کو طلاق نامہ بھجوا دیا اور لارڈ سے شادی کر لی۔ اس نے اپنے بچوں کی بھی پروا نہیں کی۔ بینا، بھائی کے گھر میں رہتی تھی۔ تعلیم کچھ مکمل کر کے کچھ ادھوری چھوڑ کے وہ اپنے نہایت تنہا باپ کے پاس واپس ہندوستان آ گئی وہ اپنے مزاج، طور اطوار میں ایک سر بہ سر ہندوستانی لڑکی ہے، اپنی ماں سے بالکل مختلف۔ اس نے ان سے ملنا ترک کر دیا۔ سنا ہے ماں کبھی کبھار انگلستان میں مقیم بیٹے سے ملنے آتی تھی۔ بینا اس کے سامنے نہیں آتی تھی۔ ہندوستان واپس آتے ہوئے وہ ماں سے مل کے بھی نہیں آئی اور اب انگلستان لوٹ جانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی۔ ظاہر ہے ایک ذمے دار باپ کی حیثیت سے ڈاکٹر رائے کو اس کے لیے کسی بہتر لڑکے کی تلاش ہو گی لیکن بینا نے شادی سے انکار کر دیا ہے اور اسی صورت میں شادی کی ہامی بھری ہے کہ ہونے والا شوہر اسے اس کے باپ سے جدا نہ کرے۔ وہ ایسی دل برداشتہ ہو گئی ہے کہ بہت کم کسی سے ملتی ہے۔ بس گھر میں بند رہتی ہے۔

مجسمے، تصویریں بناتی رہتی ہے یا پھر مطالعہ کرتی رہتی ہے، موسیقی سنتی ہے اور باپ کی خدمت کے موقعے ڈھونڈتی رہتی ہے۔

ایمی ایک مہربان اور شفیق عورت تھی۔ ڈاکٹر رائے کے خانگی حالات بتاتے ہوئے اس کا لہجہ بڑا دل گیر تھا۔ کچھ میں نے بھی دیکھا اور اندازہ کیا تھا، کچھ بینا اور ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا لیکن ایمی کی زبانی یہ سارا ماجرا سن کر میرے سینے میں جلن سی ہونے لگی۔

ایمی کہنے لگی کہ کسی چون و چرا کے بغیر ڈاکٹر نے دست خط کر کے طلاق نامہ کامنی کو واپس کر دیا تھا۔ ایمی کو حیرت تھی کہ کامنی نے ایسا کیوں کیا۔ دونوں میں بڑی یگانگت تھی۔ کامنی اپنی زندگی سے بہت مطمئن اور خوش و خرم نظر آتی تھی۔ ڈاکٹر کا بڑا خیال رکھتی تھی اور ڈاکٹر بھی اس کا دم بھرتے تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی کہ ڈاکٹر کا تعلق جدی پشتی امیر کبیر گھرانے سے ہے۔ وہ شروع ہی سے غیر معمولی ذہین طالب علم تھے۔ مختلف امراض اور دواؤں پر ان کے تحقیقی کام سے گورے بہت متاثر ہوئے تھے اور انگلستان کے کئی علمی اور تحقیقی اداروں نے انہیں اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا تھا۔ گورے انہیں وہیں روکنا چاہتے تھے۔ کہتے ہیں، بڑی بڑی پیش کش کی گئیں، لیکن ڈاکٹر وطن لوٹ آئے۔ پہلے سال دلی میں، چند سال کلکتے میں رہے پھر یہاں پٹنے میں انہیں اسپتال کا نگراں بنا دیا گیا اور اب وہ یہیں کے ہو رہے۔ یہاں انہوں نے بڑی تبدیلیاں کیں، اضافے کیے۔ بہت خاندانی زمینیں اور جاگیریں ہیں ان کے پاس۔ ایک چھوٹا بھائی تھا، سیاحت کا شوقین اور بہت بے قرار، ڈاکٹر سے بالکل مختلف۔ پختہ عمر ہو گئی تھی اور شادی نہیں کی تھی۔ سیام میں شاہی خاندان کی کسی تھائی لڑکی سے گہری دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں شادی پر آمادہ تھے، ایک روز کشتی الٹ جانے سے دریا میں ڈوب گئے۔ ڈاکٹر کو زمینوں، جاگیروں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی..... قریبی رشتے دار اور معتمد کارندے دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تو وہاں جاتے ہی نہیں۔ بہت بلاوے پر کہیں طبی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے سفر کرتے ہیں اور زیر علاج مریضوں کے خیال سے جلد واپس آ جاتے ہیں۔ درپردہ بے شمار غریب مریضوں کی اعانت ان کا معمول ہے۔ بیوی سے علیحدگی کے بعد انگلستان نہیں گئے۔ علاج معالجہ، کالج میں تدریس، گھر میں مطالعہ اور بیٹی کی دیکھ بھال ان کے روز و شب ہیں۔ ڈاکٹری کی اس ملازمت کی تو انہیں ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو ان کا شوق ہے، یہ مشغلہ تو وہ کسی فرض کے طور پر انجام دیتے ہیں۔ دونوں بیٹوں سے انہوں نے کنارہ کر لیا ہے۔ اب ان کے خاندان میں اگر کوئی ہے تو ان کی بیٹی بینا، اور بینا کا اگر کوئی ہے تو اس کا باپ ڈاکٹر رائے۔

ایمی بہت عرصے سے ڈاکٹر سے وابستہ ہے اور خوب ان کی زندگی سے آشنا اور تیور شناس ہے۔ کلکتے کے اسپتال سے وہ ایمی کو پٹنا لے آئے تھے۔ یہاں اسپتال میں پیچیدہ مریضوں کے لیے وہ ایمی کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسپتال میں ایمی ان کی ایک لائق اور فرض شناس نرس ہے۔ جب وہ ان کے گھر جاتی ہے تو کسی معزز رشتے دار اور دوست کی حیثیت کا رتبہ دیا جاتا ہے۔ کبھی دوپہر کبھی رات کے کھانے میں شریک کیے بغیر ڈاکٹر اور اس کی بیٹی بینا، ایمی کو واپس آنے نہیں دیتے۔ چھٹی کے دن ایمی باورچی خانے کا انتظام سنبھال لیتی ہے اور باپ بیٹی کو اپنے ہاتھ کا کھانا کھلاتی ہے۔

وقت کا احساس نہ اسے تھا، نہ مجھے، مگر ہر پہر اپنا سفر مکمل کرتا ہے۔ رات بھی دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہر پہر کا انجام فنا ہے۔ روز رات مرتی ہے، روز دن مر جاتا ہے، روز رات نمودار ہوتی ہے، اور دن طلوع ہو جاتا ہے۔ ہر

رات نئی رات، ہر دن نیا دن ہوتا ہے۔ آدمی وہی پرانا ہوتا ہے۔ ان پہروں اور موسموں کے طلوع وغروب ہی سے وقت کے پیمانے یا گھڑی کی ایجاد ممکن ... ہوئی ہوگی۔ ایک ہی پہر رہتا، یا ایک ہی موسم تو آدمی ماہ وسال کے اعداد وشمار کے فریب سے دوچار نہ رہتا۔ کسی لمحے امی کی نظر گھڑی پر گئی ہوگی کہ وہ چونک پڑی اور اس نے معذرت چاہی کہ اپنی رو میں جانے کیا کیا دکھڑے، داستانیں لے کے بیٹھ گئی، اس کی یاوہ گوئی مجھے ناگوار خاطر ہونی چاہیے۔ میں نے شدت سے تردید کی کہ میں تو کسی رخنہ اندازی کے خیال سے خاموش رہا ہوں، ایک ہمہ صفت شخص کا احوال دروں جاننے کی جستجو میں۔ ڈاکٹر رائے کا ذکر امی کا جتنا پسندیدہ موضوع ہے، میرے لیے بھی سردست اشتیاق واضطراب کا باعث ہے۔ مجھے تو خلش ہے کہ یہ سارا کچھ میں پہلے کیوں نہ جان سکا۔ ڈاکٹر میرے محسن ہیں اور محبوب بھی۔ انہوں نے جس انہماک سے بٹھل کا علاج کیا ہے اور اس شہر میں میرے آنے کے بعد پیش آنے والے پے درپے سنگین واقعات پر، جس میں میرا نام بہرحال ملوث ہے، بل کہ بنائے فساد ہے، ان کا تحمل، ان کی بردباری میرے لیے پہلے ہی ایک ناقابل یقین واقعہ ہے، لیکن جتنا کچھ میں نے یہاں، اسپتال میں اور ان کے گھر جاکے دیکھا اور سمجھا ہے اور اب جتنا کچھ میں نے امی سے سنا اور جانا ہے، مجھے احساس ہورہا ہے، ڈاکٹر کے لیے واجب مرتبت اور منزلت کے اظہار میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے۔

امی چپ ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے بستر پر لیٹ جانے اور آرام کرنے کی ہدایت کی۔ میں اس کے پاس سوفے پر بیٹھا رہا، پھر امی کی وجہ سے کہ اس عمر گزیدہ کو بھی آرام کا کچھ وقت مل جائے، بستر پر آکے دراز ہوگیا۔ ڈاکٹر رائے کا وہ آخری کلمہ میرے کانوں میں پیوست ہوگیا تھا۔ مجھے ہر جانب اسی کی گونج سنائی دیتی تھی اور اپنی سماعت پر بار بار شبہ ہوتا تھا۔ ایک بار اپنے خلط حواس میں مجھے یہ بے جواز بدگمانی بھی ہوئی کہ امی ڈاکٹر رائے کی وکالت تو نہیں کررہی، جیسے وہ مجھے کچھ جتانا چاہتی ہو اور اسے معلوم ہو کہ ڈاکٹر رائے نے اپنے گھر سے وداع کرتے وقت مجھ سے کیا کہا ہے۔ دوسرے لمحے اپنی بے لگامی اور بدحواسی پر مجھے شرم ساری بھی بہت ہوئی۔ امی تو ایک سادہ ومعصوم اور مشفق خاتون ہے۔ ڈاکٹر کی روداد بیان کرتے ہوئے اس کے لہجے میں کرب وسوز شامل تھا، جو کسی شامل شخص ہی میں ہوتا ہے۔ بے شک ڈاکٹر رائے اس کے لیے کسی دیوتا کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ایسے ہی کوئی کسی کا دیوتا نہیں بن جاتا، بہت شہادتوں اور دلیلوں کے بعد پرستش کا یہ مقام آتا ہے۔

بستر پر آکے میرے جسم وجاں میں تلاطم سا برپا ہوگیا۔ بستر آدمی کو آرام پہنچاتا ہے تو ہلکان بھی کم نہیں کرتا کہ پھر تو بہت سے روزن کھل جاتے ہیں اور روزنوں سے طرح طرح کے حشرات امڈ آتے ہیں۔ آنکھیں بند نہیں ہو پاتی تھیں۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے آدمی کو بھی بہت ڈر لگتا ہے۔ کھلی آنکھوں سے نظر آنے والے اشیا وموجودات کوئی رکاوٹ بنے رہتے ہیں۔ بند آنکھوں سے آدمی خود اپنے سامنے آجاتا، اپنے آپ سے نبرد آزما ہوجاتا ہے۔ میں نے اپنی باگیں کھینچے رکھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن چھوٹ چھوٹ جاتی تھیں۔ امی بھی جاگ رہی تھی۔ دیر تک مجھے کروٹیں بدلتے دیکھ کر میرے سرھانے آ گئی۔ ''نیند نہیں آرہی میرے بچے؟'' اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے بے چارگی سے سرہلا دیا۔

''اسی کے متعلق سوچ رہے ہو؟''

''کس کے؟'' میں کھسیا سا گیا۔

''اسی کے۔'' وہ مسکرا کے بولی۔ ''یاد آرہی ہے نا؟''

میرے جی میں آئی، اسے پرے دھکیل دوں۔

''میں جانتی ہوں۔'' وہ آنکھیں میچ کے بولی۔ ''لیکن نہیں......'' یکایک اس کی آواز بھاری ہوگئی۔ ''وہ بہت دور کھڑی ہے۔ نہیں پہنچ سکتے تم اس کے پاس۔ بہت فاصلہ ہے درمیان میں، بے تر ہے، کوئی دیا نہ جلاؤ......اور......'' وہ میرے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ ''بے تر ہے، اچھے بچوں کی طرح سو جاؤ۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم؟'' میں نے ناتوانی سے کہا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ کیا سمجھ رہی ہے۔؟

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں...... میں سمجھتی ہوں۔'' اس نے میرے گال پر ہلکا سا طمانچہ مارا۔ ''مجھ پر بھی تو تمہارے جیسے دن آئے ہوں گے نا کبھی۔''

امی مجھے اور منتشر کر رہی تھی۔ اس کی کسی بات کا جواب دینے اور تکرار کرنے کے بجائے خاموشی ہی مناسب تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ پہلے کی طرح وہ میرے بالوں میں انگلیاں الجھاتی رہی اور میری پیشانی کا بوسہ دے کے چپکے سے اٹھ گئی۔

آدمی کے سرے بکھر جائیں تو بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ ہجوم میں جیسے کوئی بچھڑ جائے، کبھی آدمی اپنے آپ سے بھی بچھڑ جاتا ہے اور خود کو تلاش کرتا رہتا ہے اور ڈھونڈ بھی لیتا ہے تو اپنا سامنا نہیں کرپاتا۔ میری حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ بہت سے سوال و جواب تو مجھے خود سے کرنے اور خود کو دینے تھے۔ میں امی کو کیا مطمئن کرپاتا۔

مجھے دروازے کھلنے اور بند ہوجانے کی آواز آئی۔ میں نے نہیں دیکھا، مگر شاید امی پہلو میں، نرسوں کے لیے مخصوص کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس کی ناموجودی سے جانے کیوں کچھ سکون سا ہوا۔ ہر چند رگوں میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور آنکھوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے جیسے کوئی سرا ہاتھ آجائے، کسی سوال کا جواب مل جائے، رات کے آخری پہر میں کہیں مجھے لگا، میں گم گشتہ خود کو نظر آگیا ہوں۔

یقیناً ڈاکٹر رائے نے وہی کہا تھا جو میں نے سنا تھا۔ ڈاکٹر پوری طرح اپنے حواس میں تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے گھر آنے والے پولیس افسر سے گفت گو کی تھی اور میرے بارے میں کچھ اچھی باتیں نہیں سنی تھیں، پھر اس نے مجھ سے تہدیدی و تنبیہی لب و لہجے میں بحث کی تھی اور میری صراحتیں تحمل سے سنی تھیں، وہ نہایت متوازن باتیں کرتا رہا تھا۔ کوئی ابہام نہیں تھا اس کے کلام میں۔ اپنا مدعا بیان کرنے سے پہلے اس نے تمام تر سیاق و سباق کا خیال رکھا تھا اور اس نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا تھا، محض ایک امکان ظاہر کیا تھا۔ اس نے پوری نازکی برتی تھی۔ یہی ایک تشبیہی، اشارتی سا قرینہ ہوتا ہے ایسے موضوع پر لب کشائی کا۔ ایک دانش مند، ہر اعتبار سے مکمل، ایک جہاں شناس شخص کی جانب سے ایسی کسی خواہش کا اظہار اچھی طرح عواقب و نتائج پر غور کر کے ہی کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس کی عزیز از جاں بیٹی کا معاملہ تھا۔ اس بیٹی کا جو اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ سب کچھ بکھر جانے اور لٹ جانے کے بعد اس کے لیے بچی کچی کائنات کے مانند ہے۔ نہ وہ رندی و سرمستی کی کسی کیفیت سے دوچار تھا، نہ میرے اس کے درمیان بے حجابی و بذلہ سنجی کی کوئی رسم و راہ تھی اور ایسی باتوں کا تعلق تو زندگیوں سے ہے۔ زندگی کے اتنے اہم فیصلوں میں یہ شوخیاں نہیں کی جاتیں۔

میرے اس کے مراسم کو دن ہی کتنے ہوئے تھے، ٹھیک سے ہفتہ بھر بھی نہیں۔ اس مختصر دورانیے میں جس بے سروپائی، بے دردی، بے دادگری میں روز و شب گزرے تھے، بے شک مجھے قریب سے جاننے بوجھنے کا اسے موقع مل گیا تھا۔ ادھر اس کے سامنے اپنے مزاج، اپنی روش کی بیٹی تھی، عام لڑکیوں سے یک سر مختلف، پھر شاید کچھ یوں ہوا کہ

حجت بسیار کے بعد ڈاکٹر کو اپنی بیٹی اور مجھ ایک خاک بسر، آشفتہ سر کے درمیاں کسی تار و پود کی کوئی صورت دکھائی دے گئی۔

وہ ایک سراپا تمکنت، سرتا پا رعنائی، چہرہ ماہ تاب، بدن کندن، نقش و نگار تراشیدہ، کوئی حسین و جمیل لڑکی کچھ ایسی ہی ہوسکتی ہے اور حسن و جمال کی خوبیاں تو خلقی ہیں۔ خیال کی افراط، ذہانت و فطانت کے اوصاف خداوندی عطیہ ہیں، مگر آدمی ان پر کس قدر داد طلب ہو، ناز تو ان اوصاف پر ہونا چاہیے جو اپنی جست جو، مساعی اور ریاضت کا ثمر ہوں۔ ڈاکٹر رائے کی صاحبِ کمال بیٹی بینا کو اپنی بیش از بیش خلقی صفات کا احساس کچھ زیادہ ہی تھا کہ اس نے اس کی بالیدگی اور افزائش کا ہر جتن کیا تھا۔ وہ پری زاد آسمانی حسن سے آراستہ نہ ہوتی تو بھی علم و فکر، ہنر و فن، نفاست و شائستگی کی اکتسابی اور ارادی خوبیوں میں یک تا و یگانہ تھی۔

تو پھر استراداد کا کیا محل، تردید کا کیا جواز ہے۔ سامنے کون ہیں، دانائے دہر، دانش سرشت، فکر پیشہ، مسیحا نفس، عالی مقام ڈاکٹر رائے اور ان کی نادرہ کار، نادر روزگار بیٹی بینا! کس میں استقامت ہے جو ڈاکٹر رائے کی عزت مآب گھرانے سے وابستگی میں سرتابی کا ارتکاب کرے۔ لازم ہے کہ بیٹی کے اشارہ و عندیہ کے بغیر باپ کو اس قلندری کی جراُت نہیں ہونی چاہیے، تو پھر یہ تصور ہی کیسا جاں گداز ہے کہ ایسا کوئی ریشم و شبنم، شیشہ و شعلہ، گل اندام، ایسا کوئی گلستاں مثال، آمادۂ لطف و نشاط ہے۔ ڈاکٹر رائے اور اس کی بیٹی کا کسی ناآشنا، بے نشاں پر یہ خسروانہ التفات ایک عز و شرت ہے۔ پھر وہ خوش کام و خوش انجام کسی اور کوچے کا رخ کیوں کرے، خود کو پھولوں اور رنگوں کی نذر کیوں نہ کردے۔ آدمی وہیں تمام کیوں نہ ہوجائے۔

رات کے آخری پہر کسی لمحے مجھے نیند آگئی۔ سنا ہے، کسی ارادے کی توانائی نصیب ہوجائے تو نیند آجاتی ہے۔ ارادے کی نوعیت چاہے کیسی کیوں نہ ہو، ارادہ بڑی راحت ہے۔ ہیجان و اضطراب کے ایک گرداب کے بعد مجھے جیسے کوئی کنارہ نظر آگیا۔ میرا ارادہ استوار ہوگیا تھا۔ کمرے میں امی کس وقت واپس آئی، مجھے خبر نہ ہوسکی۔

صبح ابھی اندھیرا ٹوٹ رہا تھا کہ راہ داری میں خاک روبوں کی چہل پہل سے آنکھ کھل گئی۔ پہلے میری نگاہ بٹھل کے بستر پر گئی، وہاں خاموشی تھی، پھر دروازے کے قریب آرام کرسی پر نیم دراز بیگانۂ ہوش امی نظر آگئی۔ میں نے بھی پھر آنکھیں موند لیں، لیکن آدھ گھنٹا نہیں گزرا ہوگا کہ کمرے میں در آنے والا اجالا پھیلتا گیا۔ پھر نیند نہیں آئی۔ امی بھی جاگ گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور کھڑکیوں کے پردے ایک طرف سمیٹ دیے۔ ملحق غسل خانے میں منہ ہاتھ دھو کے میں کمرے سے باہر آگیا۔ دن رات کا کوئی پہر صبح سے بہ تر نہیں ہوتا۔ دنیا بدلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تازہ تازہ، جیسے آج ہی وجود میں آئی ہو۔ آدمی کیا، پرندوں کو بھی صبح بہت مرغوب ہے، کیسے ناچنے، گانے، اترانے لگتے ہیں۔ کاش ایک پہر ہی ہوا کرتا، مگر صبح کی لطافت دوسرے پہروں سے ممیز کس طرح ہو پاتی، اندھیرے ہی سے روشنی کا مرتبہ ہے۔

امی نے کسی خدمت گار سے چائے منگوالی تھی۔ راہ داری میں کرسی اور میز ڈلوا کے اس نے اپنے ہاتھ سے میرے لیے چائے بنائی اور خود چند گھونٹ پی کے واپس کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کرلیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ صبح سویرے وہ زیادہ فعال ہوجاتی تھی۔ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے اسے بہت سے کام کرنے ہوتے تھے۔ حرارت، خون کے دباؤ اور نبض کی رفتار کی جانچ پڑتال اور مریض کے کیفیت نامے میں خانہ پری، مریض کے لباس کی تبدیلی، ناشتا کرانا، دواؤں کی خوراک دینا وغیرہ۔

اتنے دنوں میں میں بھی اسپتال ہی کا کوئی آدمی بن گیا تھا۔ اسپتال کے بھی اپنے صبح و شام ہوتے ہیں، باقی دنیا سے الگ تھلگ۔ اسپتال اور قید خانے میں بڑی مماثلت ہے، وہاں جیلر ہوتا ہے، یہاں ڈاکٹر، وہی نظم وضبط، وہی ان کا گشت، وہی پابندیاں۔ یہاں مریض بھی کسی زندانی کی طرح ہوتا ہے۔ میں نے سات سال کاٹے تھے، بٹھل نے بھی جانے کتنی زندگی قید خانوں میں گزار دی تھی۔ اسے اپنی مرضی ومنشا ترک کر دینے کی عادت تھی، حالاں کہ زندانی ہونے کے باوجود جیل میں ایک طرح اس کی عمل داری ہوتی تھی۔ یہاں تو وہ کسی محتاج کے مانند ہو گیا تھا۔ قید خانے سے اسپتال کی سزا زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ آدمی آزاد ہے بھی، نہیں بھی۔

ٹھیک آٹھ بجے سیورین آ گئی۔ اودی رنگت کے کڑھے ہوئے کرتے، تنگ مہری کے سفید پاجامے اور سفید دوپٹے میں ملبوس۔ نوشگفتہ، کھلی کھلی سی، مسکراتی، لہراتی ہوئی اور کسی قدر گھبرائی گھبرائی سی۔ عقب میں اسپتال کا نوعمر ملازم، توشیدان اٹھائے ہوئے تھا۔ آج وہ کچھ پہلے ہی چلے آئی تھی۔ لگتا تھا، بس صبح ہونے کی منتظر تھی۔ اسے دیکھ کے مجھے اپنے ہی گھر کی کسی لڑکی کا گمان ہوا، شاید اس لیے کہ وہ زریں، فرخ، فریال، سلمٰی اور نیسان ایسا لباس پہنے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رائے کسی وقت بھی معمول کی گشت پر آ سکتا تھا۔ ادھر سیورین ناشتا ٹھنڈا ہو جانے کے اندیشے میں ہلکان نظر آتی تھی۔ اس وحشت کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ ہر تخلیق کار کو اپنی تخلیق کی داد طلبی کی بے کلی ہوتی ہے۔ ہنرمند ایمی نے اس کا حل یہ ڈھونڈا کہ وارڈ بوائے کو بھیج کر ڈاکٹر کی نقل وحرکت کا سراغ لگایا، پھر اس اطمینان کے بعد کے ڈاکٹر کے آنے میں کچھ وقت لگنا چاہیے۔ میز پر ناشتا سجا دیا گیا، مجھے اندازہ تھا کہ سیورین نے کیا کیا اہتمام کیا ہوگا۔ رات کو سو بھی سکی، یا نہیں۔ بالشت بھر کی چھوٹی چھوٹی پوریاں، سبھی ایک پیمائش کی، ہلکی ہلکی تلی ہوئی، چنے، آلو، پالک اور پنیر، ترکاریاں، مختلف کچی سبزیوں کی قاشیں، ٹوسٹ، مکھن اور شہد، ولایتی قسم کا سیبوں کا میٹھا اور جانے کیا...... وارڈ بوائے چائے لے آیا۔

میرے انکار کے باوجود سیورین کے اشارے پر ایمی بار بار میری تشتری بھرتی رہی۔ میں نے کچھ شکم سیری کی، کچھ وضع نبھائی۔ کچھ مجھے اس تکلف پر خفت بھی بہت ہو رہی تھی۔ میری پسندیدگی کے اظہار پر سیورین کے رخساروں کی چمک دیدنی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے سے محبت کرنی بھی کم نہیں آتی، اور اس میں عرصہ، وقت اور کسی ایثار و احسان کی بھی شرط نہیں، بس آدمی کو آدمی اچھا لگنا چاہیے، آدمی کو آدمی کی قدر ہونی چاہیے۔ اس کی مجبوری، محرومی اور ضرورت کا احساس، اور آدمی کا دل کشادہ ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں، نفرت بخل ہے، محبت سخاوت اور آدمی کا شرف۔

اچھا ہوا جو وارڈ بوائے نے لپکتے جھپکتے آ کے ڈاکٹر رائے کے آنے کی اطلاع دی اور سیورین اور ایمی کی خاطر داریوں پر بندش لگی۔ میں نے بھی ان کا ہاتھ بٹانا چاہا تھا۔ انہوں نے گوارا نہیں کیا اور خود ہی لمحوں میں میز صاف کر دی اور ناشتے کی کوئی نشانی میز پر باقی نہ رہنے دی۔

روز کی طرح تر و تازہ ڈاکٹر رائے دو ڈاکٹروں اور ایک نرس کے ہم راہ تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ شاید پہلی نظر مجھی پر گئی اور اس کے ہونٹوں پر شائستہ مسکراہٹ کوند گئی۔ اس ایک لمحے میں میرا سارا وجود دھڑک اٹھا۔ دوسرے لمحے وہ قدم بڑھا چکا تھا، لیکن یکا یک درمیان میں ٹھیر گیا اور سر گھماتے ہوئے چونکتی آواز میں بولا۔ ”دیسی قسم کا ناشتا! یہاں اسپتال میں تو نہیں بنتا۔“

سیورین ابھی تک گھر کے لباس میں تھی، وہ تو جھینپ گئی۔ ایمی نے سامنے آ کے جھجکتے ہوئے پردہ پوشی کی کہ سیورین اس کے لیے کچھ گھر سے بنا کے لائی تھی۔

ڈاکٹر نے آنکھیں چڑھا کے سر ہلایا۔ ایک ناگواری چہرے پر ہویدا ہوئی اور وہ آگے چلا گیا۔ بٹھل کے پاس جا کے وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اس کے قریب جانے سے دانستہ گریز کیا۔ اور اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ڈاکٹر نے بٹھل کی کیفیت نامے پر ایک نظر ڈالی اور اپنے ساتھی ڈاکٹروں سے سرگوشیوں میں مشورے کرتا رہا۔ بٹھل جاگ گیا تھا یا پہلے سے جاگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے شانے پر مکا مارتے ہوئے مربیانہ اور مشفقانہ انداز میں حال پوچھا۔ بٹھل نے ہلکی آواز میں کیا جواب دیا تھا کہ بے ساختہ ڈاکٹر کا قہقہہ بلند ہوا۔ دوسرے ڈاکٹر بھی مسکرا اٹھے۔ اس سے پہلے کہ گذشتہ مرتبہ کی طرح ڈاکٹر رائے مجھے کمرے سے نکل جانے کا حکم صادر کرے، میں نے خود ہی کمرے سے نکل جانا مناسب سمجھا۔ باہر آ کے مجھے ندامت و ملامت کے احساس نے آ گھیرا۔ اس طرح میرے چلے آنے کا کیا جواز ہے، صرف اتنا نہیں کہ میں نے خود کو وہاں غیر ضروری جانا، یا جلد، یا بدیر ڈاکٹر کو میری موجودی ناپسند ہوتی، اس کے حکم کے بغیر میرے باہر آ جانے کی یہی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ ڈاکٹر سے نظریں ملانے کی مجھے تاب نہیں ہے، اس کا سامنا کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ ہو رہی ہے مجھے، لیکن یہ گریز و اجتناب تو میرے استوار کیے ہوئے ارادے کے منافی ہے۔ اس اعتراف و تلقین کے باوجود کمرے میں واپس جانے کی ہمت نہ ہو سکی۔ راہ داری میں کمرے کے پہلو میں رکھی ہوئی کرسی پر میں کسی دربان کی مانند بیٹھ گیا اور دیر ہو گئی۔

آج کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ اندر سے آنے والی تیز آوازوں پر یک بارگی مجھے اٹھنا پڑا اور میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ایک طرف نرس ایمی، دوسری طرف ڈاکٹر کے ساتھ آنے والی نرس کا ہاتھ تھامے بٹھل اپنے پیروں سے چلتا ہوا باہر کی جانب آ رہا تھا۔ تینوں ڈاکٹر اس کے پیچھے تھے اور حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ بٹھل نے کمرے کا دروازہ بھی عبور کر لیا اور باہر آ کے اس نے دونوں نرسوں سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور خود اپنے سہارے دائیں طرف بڑھنا شروع کیا۔ ڈاکٹر تالیاں بجانے لگے۔ بٹھل کے پیروں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی اور جسم بھی ڈگمگا گیا تھا، لیکن وہ گرا نہیں۔ دونوں نرسیں اس کے جسم سے تقریباً چپکی ہوئی ساتھ تھیں۔ ڈاکٹروں کی آنکھوں سے خوشی جھلک رہی تھی۔ چند قدموں کا فاصلہ بٹھل نے خود طے کر لیا تھا۔ وہ اور آگے جانا چاہتا تھا کہ ایک ڈاکٹر نے آگے جا کے اسے روک دیا۔ بٹھل واپس بھی اپنے بل پر آیا اور کمرے کے دروازے پر رکھی جس کرسی پر کچھ دیر پہلے میں بیٹھا ہوا تھا، وہیں ٹھیر کے اس نے بیٹھ جانے کی خواہش کی۔ نرس ایمی نے اس کا بازو تھاما، مگر وہ اپنے آپ ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ تھکن کی ایسی بات نہیں ہوگی، اتنے دنوں تک کمرے کے در و دیوار سے دور ہو کے کھلی جگہ اسے اچھی لگ رہی ہوگی۔ راہ داری کے آگے سبزہ زار تھا، کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ سبزہ زار کے اس پار درخت تھے اور پرندے پھدک رہے، چہچہا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر میں بھی وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کے اس نے ایک گہری سانس لی۔ سارے لوگ، ڈاکٹر، نرسیں، سبھی اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کس طرح ڈاکٹر رائے سے احسان مندی کا اظہار کروں، ایمی اور سیورین سے کیا کہوں اور بٹھل کو کیا تسلی دوں۔ میں تو سب کچھ بھول ہی گیا تھا۔ میرا جسم بے وزن ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر رائے، ساتھی ڈاکٹروں کے پاس سے ہٹ کے میرے پاس آ گیا۔ میں سوچتا رہ گیا۔ اس

کے ہاتھ چوموں، سینے سے لگالوں، یا اس کے پیر پکڑ لوں۔ ڈاکٹر نے میری بھری ہوئی آنکھوں میں ضرور کچھ دیکھ لیا تھا کہ میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا اور مضطرب نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ ''ٹھیک ہے استاد؟'' چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے ہندستانی میں کہا۔ اس کی آواز میں رعب، افتخار اور مسرت کا آمیزہ تھا۔

میں نے جھک کے اس کے پیر چھونے چاہے کہ اس نے مستعدی سے میرے شانے پکڑ لیے اور اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو اشارہ کیا۔ میرا خیال تھا، ابھی وہ ٹھیرے گا، مجھ سے کوئی بات کرے گا، لیکن جیسے میں تو بس ایک مریض کا نگہدار تھا، گذشتہ رات میں اس کے گھر گیا ہی نہیں تھا اور اس نے مجھ سے کچھ کہا سنا ہی نہ تھا۔ میرے آگے سے ہٹ کے اس نے ایمی اور سیورین کو کچھ ہدایات دیں اور بٹھل کا بازو تھپ تھپا کے واپس جانے کا ارادہ کیا۔ بٹھل اٹھنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر نے اس کے گھٹنوں پر زور دے کے اسے بیٹھا رہنے دیا اور چل پڑا۔ جاتے جاتے مڑ کے بولا، ''وقت ملے تو ادھر آنا میرے پاس۔'' اس بار اس نے مجھے انگریزی میں مخاطب کیا اور تذبذب سے بولا، ''یا پھر میں خود ہی بلالوں گا، اگر فرصت ملی۔'' پلک جھپکنے کی مہلت میں وہ دور ہو گیا۔

سیورین اور ایمی بٹھل کے پاس کھڑی رہیں۔ انہوں نے اسے کمرے میں واپس لے جانا چاہا، لیکن بٹھل کے منع کرنے پر انہوں نے اصرار بھی نہیں کیا۔ ڈاکٹر نے انہیں ایسی کوئی تاکید نہیں کی ہوگی کہ وہ زیادہ تشویش کرتیں۔ ایمی نے خدمت گار سے کہہ کے وہیں ایک اور کرسی رکھوادی اور کمرے میں جا کے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ سیورین بھی لباس کی تبدیلی کے لیے ملحق کمرے میں چلی گئی۔ بٹھل اور میں وہاں اکیلے رہ گئے اور میں دزدیدہ نظروں سے اس کی صورت دیکھا کیا۔

''کیسا ہے رے؟'' اس نے بدبداتی آواز پوچھا۔

''میں...... میں ٹھیک ہوں بالکل۔'' میرا اکڑ گیا اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ ''تم...... تم بتاؤ ہو اب؟''

اس نے جواب دینے میں تامل کیا، پھر بولا ''کتنے دن ہو گئے؟''

''زیادہ نہیں۔'' میں نے بہ عجلت کہا، ''یہی چار پانچ پل کہ سمجھو، چھ دن۔''

اس کے ہونٹ پھیل گئے اور وہ سر ہلا کے رہ گیا۔

''اب کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہی ہے۔ اچھا ہوا جو ہم یہاں آ گئے۔'' اپنی آواز قابو میں مجھے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا، میں بات کا جواب دے سکتا تھا۔ مجھے تو یقین ہی نہ آ رہا تھا۔

''خط، تار وار تو نہیں دیا کہیں کو؟'' اس نے بوجھل آواز میں پوچھا۔

''نہیں۔'' اس کے استفسار پر پہلا خیال زریں کا آیا تھا، اس لیے میں نے انکار کر دیا تھا، میں نے تردید کی۔ ''کلکتے تار دیا تھا جامو بھائی جمرو کو بلانے کے لیے۔ انہیں آ جانا چاہیے تھا، تک۔''

''کیوں دیا رے۔'' وہ اداسی سے بولا۔

میں اسے کیا بتاتا کہ اس کی بیماری کے ان دنوں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے...... پانچ آدمیوں خون ہو چکا ہے۔ سارا شہر ہی متاثر ہوا ہے، میں بس اتفاق سے اس کے پاس موجود ہوں۔ ڈاکٹر رائے پولیس کے آڑے نہ آ جاتا تو میں پولیس تحویل میں ہوتا، اور جانے پھر کیا ہوتا۔ میں نے کہا، ''اکیلا لگ رہا تھا میں خود کو۔''

اس نے ہنکاری بھری اور کچھ نہیں بولا۔

''معلوم نہیں، کیوں نہیں آ سکے وہ۔ یہ تو ممکن نہیں کہ تار نہ پہنچا ہو۔ جانے کیا بات ہے؟'' میں نے اسے نہیں بتایا کہ ایک کے بجائے دو تار دیے گئے تھے، اور وہ بھی ارجنٹ۔

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور پژمردگی سے بولا، ''ابھی اور کتنے دن کا بولتے ہیں ڈاکٹر لوگ؟''

''کوئی بات نہیں ہوئی ابھی، لیکن یہ اسپتال اچھا ہے، ڈاکٹر، نرسیں، سبھی لوگ بہت ذمے دار ہیں۔ اور کچھ دن لگ جائیں تو کیا فرق پڑے گا۔'' میں نے عمداً سرسری طور پر کہا۔

''جگہ تو بڑی ہریالی ہے۔'' ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے اس نے میری تائید کی۔

''یہ اسپتال کا سب سے خوب صورت حصہ ہے، الگ تھلگ بھی اور اسپتال میں شامل بھی۔ بہت بڑے بڑے لوگوں کو کمرے ملتے ہیں ایسے، گورے، بڑے افسروں اور پیسے والوں کو۔ وہ تو ڈاکٹر نے مہربانی کی۔ کسی جان پہچان، صاحب سلامت کے بغیر ہمیں ادھر جگہ دے دی اور پھر کیسا خیال رکھا، جیسے ہم ان کے کوئی عزیز ہوں۔ کیا کیا بتاؤں تمہیں، اپنے ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر رائے کے بارے میں......''

وہ سر اٹھائے سنتا رہا اور جانے کیا بڑبڑانے لگا۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔

اسی لمحے ایمی آ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں سفید کپڑے سے ڈھکی ایک مختصر ٹرے تھی۔ ٹرے میں فنجان اور گلاس دیکھ کر بٹھل نے منہ پھیر لیا، مگر ایمی کا انداز نہایت معذرت خواہانہ تھا۔ چہرے پر مادرانہ شفقت چھائی ہوئی تھی۔ شفقت بھی کبھی کیسی گراں گزرتی ہے۔ بٹھل نے فنجان جھٹ ٹرے سے اچک کے حلق میں انڈیل لیا۔ ایمی نے پانی بھرا گلاس بڑھایا تو ایک ہی سانس میں اس نے گلاس بھی خالی کر دیا۔ ایمی شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ بٹھل نے منہ بنا کے میرے گھٹنے پر آہستہ سے ٹھوکا دیا۔ ''بیڑی مل جاوے گی ادھری؟''

''بیڑی؟'' میں چونک پڑا۔

''ہاں رے بیڑی، کبھی دیکھی نہیں؟'' وہ تلخی سے بولا۔

''دیکھی ہے، بہت دیکھی ہے۔'' میں نے زچ ہو کے کہا، ''پر نہ پیو تو اچھا ہے۔ مجھے نرس ایمی سے پوچھنا پڑے گا۔'' میں نے کمرے میں موجود ایمی کے پاس جانے کے لیے اٹھنا چاہا۔ میں نے سوچا تھا، ایمی سے کہہ کے منع کرادوں گا۔ بیڑی سے کھانسی ہو سکتی ہے۔

''رہنے دے۔'' اس نے جھڑکتی آواز میں مجھے روک دیا۔

بیڑی کی طلب سے مراد تھی کہ واقعی اس کی طبیعت ٹھیک ہو رہی ہے۔ حالاں کہ وہ بیڑی کشی کا ایسا عادی نہیں تھا۔ دن میں چند بیڑیاں اور حقہ سامنے ہو تو قطعاً نہیں۔ یہاں حقے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس نے پھر چپ سادھ لی تھی۔ سبزہ زار پر اچھلتی، کودتی اور ٹھونگیں مارتی چڑیاں دیکھتا رہا۔ اور دیر بعد تاسف آمیز درشتی سے بولا، ''الٹا ہو گیا رے سارا۔''

''کیا الٹا ہو گیا۔ یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ میرے ساتھ نہیں ہوا تھا؟ آسن سول میں اس بدمعاش سید محمود علی کے گھر کتنے دن ٹھیرنا پڑا تھا۔ مجھے تو بخار تھا...... اور تمہیں......'' مجھے اپنی زبان تھامنی پڑی اور میں نے ملائمت سے کہا، ''تمہارا تو سر کا معاملہ تھا، اور اب، اب تو تم ٹھیک ہو۔''

''ہاں رے، سارا ٹھیک ہی لگتا ہے۔ چل پھر سکتا ہوں اب ایک دم۔''

''چل کے تو تم اپنے پیروں ہی سے یہاں آئے تھے۔ کوئی اٹھا کے نہیں لایا تھا، لیکن ہوا کیا پھر۔'' میرے لہجے میں تیزی آ گئی۔ ''ڈاکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جائیں گے ہم۔''

سیورین نے ڈیوٹی والا لباس پہن لیا تھا اور ایمی اپنے گھریلو لباس میں گھر جانے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ بٹھل کو وہاں بیٹھے قریب آدھ گھنٹا گزرا ہوگا کہ ایمی کسی ناگہانی بلا کی طرح سر پہ آدھمکی۔ اس بار اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس نے بٹھل کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ بیمار آدمی سب سے بڑا محکوم ہوتا ہے اور ایمی اچھی طرح جانتی تھی کہ اپنے محکوموں سے کب اور کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ بٹھل کے پاس خشونت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے اور تعمیل کرنے کے سوا کیا چارہ تھا۔ وہ اٹھ گیا۔ سیورین اور ایمی نے اس کے بازو پکڑ لیے تھے۔ اس نے بازو جھٹک کے دونوں کو ہٹا دیا اور تین قدم کی دوری طے کر کے اپنے کمرے، اپنے زنداں میں داخل ہوگیا۔

ایمی پھر نہیں ٹھیری۔ شام کو جلد ڈیوٹی پر واپس آنے کا کہہ کے اور بٹھل کی صحت یابی کے لیے رسمی دعائیہ کلمات ادا کرتی ہوئی رخصت ہوگئی۔

بٹھل سیدھا بستر پر جا کے دراز ہوگیا تھا۔ سیورین نے وقفے واری معمول کے مختلف معائنوں کے بعد بستر کے نزدیک الماری میں رکھے ہوئے شیشے کے جگ سے کسی پھل کا مشروب گلاس میں بھر کے بٹھل کو پیش کیا۔ اس وقت بٹھل کے نتھنے پھولے ہوئے تھے، پیشانی پر شکنوں کا جال بچھا تھا، سانس بھی مجھے کچھ تیز لگ رہی تھی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ سیورین کی پیشہ ورانہ تن دہی سے چڑ نہ جائے اور کچھ الٹ سلٹ نہ کر دے، اس لیے میں قریب ہی کھڑا رہا۔ اس نے خاموشی سے مشروب پی لیا۔ سیورین نے پھر چند گولیاں اسے کھلائیں اور اس نے بٹھل کے بالوں کی ایک بکھری ہوئی لٹ درست کرنی چاہی کہ بٹھل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ بری طرح گھبرا گئی۔

''بیٹھ جاری ادھری۔'' بٹھل نے ہٹیلی آواز میں فرمائش کی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات
آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں